شہرِ مدفون

خالد فتح محمد

شہر مدفون

خالد فتح محمد

سانجھ

شہر مدفون   ناول   خالد فتح محمد

اشاعتِ اوّل	:	2015ء
سرورق پینٹنگ	:	بنش آہوجا
سرورق ڈیزائن	:	سعید ابراہیم
تعداد	:	500
قیمت	:	700

Sheher-e-Madfoon

(Urdu Novel by Khalid Fateh Muhammad)

Printed by:

Naveed Hafeez Printers, Lahore, Pakistan

Price:

In Pakistan: Rs. 700.00

Published by:

سانجھ

SANJH PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.

Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950

e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com

Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-179-0

سمیع آہوجا کے لیے

''اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا''

سیاہ گھوڑے پر لمبے دھڑ اور چھوٹی ٹانگوں والا آدمی سوار تھا جس کی ایک ٹانگ سلامت تھی تو ایک بازو ندارد، صرف ایک آنکھ اپنے خوانچے میں تھی مگر ایک کان نہیں تھا۔ اُس کی تلوار بائیں پہلو میں لٹک رہی تھی۔ وہ زندگی اور کئی جنگوں کے متعدد گہرے زخموں کا تحفہ اپنے جسم پر سجائے ہوئے تھا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر تھکاوٹ تو تھی مگر آنکھ میں ارادے کی چمک کا لشکارا تھا۔ اُس کی واحد بے چین آنکھ متواتر چاروں طرف، نزدیک اور دور، دیکھے جا رہی تھی۔ سفید گھوڑوں پر سوار چند جان نثار اُس کے گرد منڈلاتے خطرے سے بے نیاز مہارانا کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزرا تھا۔ اُس کے استعمال میں آنے والے گھوڑے چھوٹے قد کے، مضبوط، گھنٹوں سرپٹ بھاگنے کی اہلیت رکھتے تھے اور اُن کی خصوصیت اپنے آپ کو جنگلوں میں چھپا دینا تھا۔

شکست خوردہ دستہ گھنے درختوں کے درمیان میں ایک کُھلی جگہ پر کھڑا تھا۔ وہ وہاں ایک مختصر عرصے کے لیے ہی رُکے تھے۔ جب کبھی ایسا عارضی پڑاؤ کرنا پڑتا، گھوڑے ایسے تربیت یافتہ تھے کہ وہ نہ تو اپنے سُموں پر ہلتے، نہ ہی لید یا پیشاب کرتے تا کہ تعاقب کرنے والے یہ نہ جان پائیں کہ اُن کے وہاں قیام کا مقصد کیا تھا؟ یہ لوگ لائحہ عمل طے کرنے کے فوراً بعد اگلی منزل کو چل نکلتے۔

رانا اب اپنی جان بچانے کے لیے جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ اُسے اپنی زندگی کی تو قطعاً پروا نہیں تھی، اُس کے خاندان کے چند افراد اور کچھ جان نثار اُس کی ذمے داری تھی۔ یہ جان نثار اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ اُس کے ساتھ وفاداری نبھا رہے تھے۔ رانا جانتا تھا کہ چند روز پہلے کی شکستِ فاش نے ہند کی اُلجھی ہوئی تاریخ میں ایک نیا باب کھولنا تھا اور اُس جیسے کئی لوگ جو اِس مُلک پر مقامی راج قائم کرنے کے لیے اپنی جانوں کی بلی چڑھا رہے تھے، ایک بار پھر ناکام ہو گئے ہیں۔ اِس دفعہ کے حملہ آوروں کی بھوک کی شدت کہیں زیادہ تھی اور وہ جان گیا تھا کہ بھوکے کو

تب ہی شکست دی جا سکتی ہے جب وہ اپنی بھوک ختم کر کے تساہل کی زندگی کرنے کا عادی ہو جائے! مہارانا نے افغانستان کے ابراہیم لودھی کو شکستِ فاش دی تھی اور شمالی ہند میں اُس کا ذکر خوف، احترام اور حسد کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ وہ انتظار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ملک پر قبضہ کرنے والوں پر وار کرنے کا موقعہ اِس جنم میں اگر نہیں آتا تو بھلے نہ سہی، کسی اگلے جنم میں سہی۔

رانے کا گھوڑا ایک تناؤ میں کھڑا تھا۔ اُسے لگام کے صرف بے نام سے اشارے اور واحد ران کی ایڑی کے اپنے پیٹ کے ساتھ چھونے کا انتظار تھا، جیسے ہی ایسے ہوتا، گھوڑے نے وہیں سے سرپٹ بھاگنے کے لیے زقند بھر لینا تھی۔ ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہونا تھا۔ اچھے دنوں میں جب رانا ہرن کے شکار پر ہوتا اور تازہ دم ہونے کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوتا تو اچانک اُس کی نظر اپنی طرف دیکھتے ہرن سے ملتی تو وہ اُسی لمحے اپنے گھوڑے کو ہوا پر سوار کرا کے ہرن کے تعاقب میں ڈال دیتا۔

رانے کا گھوڑا پچھلے چند دنوں سے متواتر اِسی کیفیت میں تھا۔ رانا جب اپنے ایک ہاتھ سے دشمنوں کو جان سے مارنے کے عمل میں اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے تھا تو اِس میں گھوڑا بھی برابر کا شریک تھا۔ اُس نے ہمیشہ رانے کو وار کرنے کے لیے وہی زاویہ دیا جہاں سے اُس کا واحد بازو حملہ آور کا سر قلم کر سکے۔ پچھلی دونوں جنگیں گھوڑے کی زندگی میں سر کیے متعدد معرکوں سے مختلف تھیں۔ مغلوں کے گھوڑے بھی اُس کے اپنی طرح شکست ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ گھوڑے چھوٹے قد کے اور بظاہر لاغر لیکن انتہائی طاقت ور تھے۔ جب واضح ہو گیا کہ مغل شکست کھا جانے کے مرحلے سے گزر کر جیتنا شروع ہو گئے تھے اور مہارانا شدید زخمی حالت میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا تو اُسے اِسی گھوڑے پر مارواڑ کا راٹھور دستہ میدان جنگ سے نکالنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اُس وقت گھوڑے کی خواہش تھی کہ مغل گھڑ سوار تعاقب میں آئیں تا کہ کم از کم وہ رانا کی شکست کا بدلہ لے سکے۔ مغلوں کو جب دشمن فوج کے سردار کی غیر حاضری کا پتا چلا تو رانا اور اُن کے درمیان میں کئی کوس کا فاصلہ پڑ چکا تھا۔

رانا اپنی زین میں ہلا تو گھوڑے نے یکدم کنوتیاں کس کر چاروں طرف دیکھا۔ رانا نے اپنے ہاتھ سے گھوڑے کی گردن سہلائی تو اُس نے اپنے کان ڈھیلے چھوڑ دیے۔ رانے نے ایک لمبا سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور اپنے ساتھیوں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ

اطاعت گزاری اور خلوص کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اب یہ کٹھنائیوں بھرا سفر ختم ہوتا ہے۔'' رانا کی آواز بھاری، ٹھہری ہوئی اور باوقار تھی۔ اُس کی طرف دیکھتی ہوئی نظریں اپنے اپنے بھاری پن کے باعث جھک گئیں۔ یہ تعظیماً بھی کیا گیا تھا۔ یہ وقت سوال کرنے یا اُٹھانے کا نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سماں اُن سب کی زندگیوں پر بھاری ہے۔ اُس سے دھرتی اور آکاش ایک نیند میں چلے گئے تھے اور صرف رانا اور وہ زندہ تھے۔

''ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ سب کے لیے کیا بہتر ہے؟ جنگ جاری رکھنا یا انتظار؟ سپاہ اب منظم نہیں رہی اور دوبارہ تیاری کرنے میں ہمیں وقت اور خزانے کی ضرورت ہے۔ وقت ہمارے پاس ہے، خزانہ نہیں اور ہم نے لوٹ مار کر کے، ہم خیال حاکموں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے اکٹھا کرنا ہے۔ میری ریاست مغل تاراج کر چکے ہوں گے۔'' رانا بات کرتے ہوئے رُکا، اُس کی واحد آنکھ سب کے چہروں کو کئی زاویوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ اُسے اپنے ماتحت رفیقوں کے چہرے پڑھنے پڑے ہوں، وہ ایک سرسری سی نظر میں ہی وفا کی گہرائی ماپ لیتا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک مرتبہ اتنا بڑا دھوکہ کھا چکا تھا کہ بابر کو شکست دے کر آج دہلی کے تخت کے بجائے درختوں کے اِس جھنڈ میں ہرنوں کے گلے کی طرح کیڑ ٹلا پر کھڑا تھا۔ سفید گھوڑوں پر سوار سب اُس کے چہرے کے مانوس مگر نامانوس تاثرات دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رانا جب رات کو پناہ گاہ سے اُن کے ہمراہ نکلا تو وہ کوئی فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ تمام رات سفر میں رہے تھے۔ بابر نے مہارانا کو دھوکے سے شکست دینے کے بعد ہندوستان میں قدم جمانا شروع کر دیے تھے۔ جب وہ رات کو اُن کے ساتھ آن کر ملا تھا اُس وقت اُس کا چہرہ پریشان ضرور تھا مگر اُس پر بے چینی نہیں رہی تھی۔ ''ویسے بھی تم لوگ جانتے ہو کہ میں چتوڑ میں نہ جانے کی قسم کھا چکا ہوں، وہاں بابر کو شکست دے کر، اُس کا سر نیزے پر لہراتے ہوئے ہی جانا ہے۔ مجھے رات خبر ملی تھی کہ بابر، میدینی رائے پر حملہ کرنے والا ہے اور مجھے اُس کی مدد کرنی ہے؛ اُس کی فتح کے لیے نہیں، بابر کو شکست دینے کے لیے۔'' مہارانا کی عمر صرف بتالیس برس تھی لیکن دِکھنے میں وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ وہ اپنی واحد آنکھ سے دور کہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اِس مرتبہ اُس کی سوچ کوئی نہیں پڑھ سکا کہ ایسا تاثر انھوں نے مہارانا کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھا تھا؛ اُس کی آنکھ دُھندلائی ہوئی

تھی۔ اُس نے ٹھوڑی کو جھکا کر چھاتی کے ساتھ لگایا، گھوڑے کی گردن پر پیار سے تھپکی دی اور گھوڑے نے تشکر کے اظہار میں اپنے سوار کی ٹانگ کو اپنی ناک سے چھوا۔ رانا ایسے نرم جذبات کے اظہار کو ہمیشہ ایک نسوانی عمل سمجھا کرتا تھا لیکن آج اُسے ایسا کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''رات پناہ گاہ میں ہمارے پاس کھانے کو کچھ خاص نہیں تھا۔ بچی ہوئی روٹی کا ٹکڑا میری بیٹی کے حصے میں آیا۔ وہ روٹی توڑنے ہی والی تھی کہ ایک جنگلی بلی اُس ٹکڑے کو جھپٹ کر لے گئی۔'' مہارانا اُس وقت ایک کمزور آدمی بن گیا تھا، اتنا کمزور کہ اپنی بیٹی کے لیے رو پڑا تھا۔ رانے، مہارانے، راجے، مہاراجے اور مختلف سطحوں کے حاکم بیٹیوں کے ہاتھ دے کر اپنی حکومتوں کو استحکام دیتے تھے اور سانگھا اُسی بیٹی کی بے بسی پر رو دیا تھا۔

''منتشر ہوئے لشکری تو ہاتھ نہیں آسکیں گے لیکن میرا مدینی رائے کی مدد کے لیے جانا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ.....'' مہارانا اپنے کمزور پہلو پر قابو پانے کے بعد شرمندہ سا بھی تھا لیکن اُس کے لہجے میں اُس کی پرانی طاقت تھی، ''میرا پرانا اور وفادار سردار، رائے بوچہ مل یہاں سے میرے ساتھ آگے نہ جائے۔'' اُس نے ہاتھ بلند کر کے متوقع احتجاج کو خاموش کیا۔ ''رائے تم اپنی عورت کو لے کر بیاس کے پار آباد ہو جاؤ۔ تم اپنے کو دُکھی نہ کرو اور وہاں جا کر آباد ہو جاؤ اور دہلی سے ہمارے پیغام آنے کا انتظار کرو۔''

مہارانا نے رائے بوچہ مل کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اُس نے درختوں میں جھانکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر دن کے پہر کا تعین کیا، زین سے لٹکتی چھاگل سے پانی کے دو گھونٹ لیے، چند قطرے اُس کی ڈاڑھی پر گر گئے تھے جو اُس نے ڈاڑھی کو ہلا کر صاف کیے۔ ''رائے! تم اب جوان نہیں رہے اور ہمیں جب تمھاری ضرورت پڑی، تمھیں بلا لیں گے۔ اور ہاں..... ورشا کب تک آئے گی؟''

بوچہ مل نے آسمان کی طرف دیکھا، ایک نظر خشک زمین پر ڈالی اور مہارانا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''نہیں مہارانا سرکار، اگلے چند دن نہیں۔''

رانا نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا پہلی جست میں ہی ہوا کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ باقی گھڑ سوار مہارانا کے گھوڑے کی دھول کے پیچھے بھاگ پڑے!

رائے بوچہ مل اکیلے پن اور رد کیے جانے کے احساس سے پھیل کے دور ہوتی ہوئی گھوڑوں کی گرد کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنے پرانے آقا، دوست اور جوزی وال کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے مہارانا کے لیے دعا کی اور گھوڑے کو واپس موڑ کر جنوب مغرب کی طرف چل پڑا۔ اُس کی بیوی تین راتوں کے فاصلے پر بٹھنڈہ کے مغرب میں واقع کیکروں کے ایک گھنے جنگل میں تھی؛ اتنا گھنا جنگل کہ اُس میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ رائے بوچہ مل کا یہ خصوصی کمال تھا کہ وہ کیکر کے گھنے جنگلوں میں بکریوں کی طرح گھس سکتا تھا۔ وہ جنگل کے کنارے کھڑے ہو کر ایک شدت کے ساتھ درختوں کے تنوں، شاخوں کے پھیلاؤ اور درختوں کے درمیان کے خالی راستوں کو دیکھتا رہتا۔ اسی آسن میں کھڑے ایک طویل وقت تک دیکھتے رہنے کے بعد اُسے جنگل میں کئی راستے نظر آ جاتے اور وہ سب سے موزوں راستہ چُن کر اندر چلا جاتا۔

رائے بوچہ مل ساٹھ کو چھوتے ہوئے، درمیانے قد کا قدرے بھاری آدمی تھا۔ اُس کی ڈاڑھی کے بال مکمل طور پر سفید ہو چکے تھے جب کہ اُس نے مونچھیں سیاہ رنگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک پیشہ ور سپاہی ہونے کی حیثیت سے کہیں کا رہنے والا نہیں تھا، وہ ہر اُس لشکر کا حصہ ہوتا جس نے بغاوت کی ہوتی۔ مہارانا سانگا نے راجھستان پر قبضہ کرنے کے بعد مالوہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ مالوہ پر اُس وقت محمود خلجی کی حکمرانی تھی۔ محمود خلجی ایک کمزور اور نا اہل حاکم تھا اور تمام بیرونی حاکموں کی طرح ہند کا موسم اُسے راس نہیں آیا تھا یا اُسے اتنا راس آیا تھا کہ اُس کے زوال کا سبب بنا۔ اُس کی طبیعت میں بسیار خوری اور آرام پسندی حاوی تھے، اُس کی ریاست تشدد کی طرف لے جانے والے اختلاف اور انتشار کا شکار تھی۔ محمود کا میر وزیر میدینی رائے اپنے اختیارات کے تجاوز میں طاقت حاصل کر چکا تھا اور محمود خلجی اپنے میر وزیر کے سامنے بے بس تھا۔ محمود نے اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے ہند کے حکمران ابراہیم لودھی سے امداد طلب کی اور میدینی رائے نے مہارانا سانگھا کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔

یہ میواڑ کے اتحادیوں اور شمالی ہند کے مسلمان حاکموں کے درمیان میں ایک طویل خونیں جنگ تھی۔ اسی جنگ میں رائے بوچہ مل اور مہارانا کی ملاقات ہوئی۔ مہارانا، بوچہ مل کے تدبر اور جنگی مہارت سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ سانگھا کے چند قابلِ اعتماد سرداروں کا حصہ بن گیا۔ وہ مہارانا کی ذاتی محفلوں میں بھی شریک ہوتا اور رانا کو نشے کی انتہا سے روکنے کی صرف اُسے اجازت تھی۔ بوچہ مل نے مہارانا کی طرف سے دیے انعامات اور جائیداد لینے یا قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ وہ یہی کہتا: مہارانا سرکار! میں تو بُڑھا ہوں۔ میں یہ سب لے کے کیا کروں گا۔ اب تو عورت بھی میری طرح کی ہی ہوگئی ہے۔ آپ دیالو ہیں، دہلی فتح ہونے پر آپ سے ایک ریاست لوں گا۔ مہارانا قہقہہ لگاتے ہوئے بوچہ مل کو دیکھتا جاتا۔

''تم کہیں کے بھی باسی نہیں ہو اِس لیے مجھے تم پر سب سے زیادہ اعتماد ہے۔'' ایک رات مہارانا نے شراب کے نشے میں اُسے بتایا۔ ''بوچہ مل! میں نے تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے، لیکن تمھیں سمجھ نہیں پایا ہوں۔ تم اپنی کوئی ایسی خصوصیت بتاؤ جو ہند کے کسی سردار کے پاس نہ ہو۔ تم جنگل میں راستہ بنانے کا تو بتا چکے ہو۔ میرا اپشو پال سرداروں سے زیادہ پالا پڑتا ہے۔ وہ تو بس سامنے آئے دشمن کو ہی مارنے کا سوچتے ہیں، وہ دشمن کہاں سے آتا ہے اُنھیں نہیں پتا ہوتا؛ یہ صرف تم اندازہ لگا سکتے ہو۔''

بوچہ مل نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اُسے متعدد اُلجھنیں درپیش تھیں۔ مہارانا کا اُسے اپنے اتنا قریب کرنا ایک خطرے کا پیش خیمہ لگتا، وہ جتنا مہارانا کے قریب ہوگا اُتنے ہی اُس کے دشمن ہوں گے۔ وہ دشمنوں کے بجائے اپنے خیر خواہ رانا سے خائف تھا۔ تمام بڑے لوگوں کی طرح رانا کانوں کا کچا تھا اور اُسے کسی بھی وقت نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ اُسے مہارانا کے ساتھ ایسی نجی قسم کی نشستوں سے خوف آتا۔

''مہارانا سرکار! میں آپ کا خادم، آپ کے حکم پر اپنی جان قربان کر دینے والا ہوں۔ میرے اندر کہاں کی خصوصیات! اگر ہیں تو آپ نے ہی اُنھیں شناخت کیا ہے۔'' وہ راجوں، مہاراجوں اور مہارانوں کو خوش کرنے کے طریقے جانتا تھا؛ اِدھر ایک وقار کے ساتھ اُن کی تعریف کرو اور اُدھر وہ قصیدہ گو کو اپنا مخلص تصور کر کے اُس کے کہنے پر کسی کا سر قلم کر دیں گے۔
مہارانا نے فخر میں ڈوبی ہوئی مسرت کے ساتھ بوچہ مل کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتا تھا

کہ بوچہ مل اپنی بات جاری رکھے۔ بوچہ مل بھی یہ جانتا تھا۔ مہارانا نے بوچہ مل کو اشارہ کر کے اُسے چاندی کا جام دکھایا جسے اُس نے دیر سے نہیں چھوا تھا۔

وہ دونوں مہارانا کے محل میں اُس کی خواب گاہ کے سامنے والے کمرے میں، جہاں صرف نجی قسم کی محفل جمتی تھی، بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ محفلیں ہر قسم کے شور شرابے سے خالی ہوتی تھیں، رانا یہاں صرف اُن لوگوں کو مدعو کرتا جن کے متعلق اُسے یقین تھا کہ وہ سازش نہیں کریں گے۔

''بوچہ مل! اگر دشمن کو اچانک پن سے مفلوج کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟'' انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے وہ ٹکٹکی سے بوچہ مل کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ بوچہ مل کا تجربہ تو گھڑ سواروں کے دستے کی کمان اور اُن کی جنگی تدبیروں تک محدود تھا لیکن اُس کے پاس ایسی کتابیں تھیں جن میں یہ سب درج تھا۔ کیا مہارانا کے کسی جاسوس کو اُن کتابوں کے بارے میں علم ہو گیا ہے؟ وہ ہمیشہ کی طرح مہارانا کی دوستی سے خائف ہو گیا، ساتھ ہی وہ اِس کوشش میں تھا کہ مہارانا اُس کے خیالات نہ پڑھ سکے۔ اُس نے کچھ دیر پہلے کے اشارے کی تعمیل میں اپنا جام ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ اُسی وقت ساقی کہیں سے نمودار ہوئی اور اُسے نیا جام تھما گئی۔ بوچہ مل نے بھرے ہوئے جام میں ہلکے سنہری سیال کو اپنے نجات دہندہ کے طور پر دیکھا، ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر قالین پر رکھ دیا۔ مہارانا تکیے سے ٹیک لگائے لگا تار دیکھے جا رہا تھا۔

''مہارانا سرکار! جو سوال آپ نے پوچھا ہے اُس کا جواب اِتنا آسان نہیں۔ ہماری جنگوں میں ابھی تک یہ نہیں ہو سکا ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکا ہے؟'' مہارانا کی آواز میں تجسس تھا۔

''ہم نے گھوڑے کا صحیح استعمال نہیں سیکھا۔ ہاتھی اور پیادہ ہی ہمارے ہتھیار رہے ہیں، گھوڑا تو صرف بغلی حفاظت کے لیے ہے۔''

''بولے جاؤ!''

بوچہ مل نشے میں اپنی آواز سے خود متاثر ہونے لگا تھا۔ ''ہاتھی سے ہم روندنے کا کام لیتے ہیں۔ چالاک دشمن ہاتھی کو کسی طرح خوف زدہ کر کے اُس کا رُخ واپس موڑنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ پیادہ اتنی سست رفتاری سے حرکت کرتے ہیں کہ وہ جنگ پر اپنا اثر ڈالنے کے لیے لمبا وقت لیتے ہیں۔ جب پیادے اپنا اثر دکھانا شروع کریں تو اُس وقت کہیں سے ہزاروں گھڑ سوار نکل

آئیں اور اپنے نیزوں اور تلواروں سے دشمن کو پرونا اور کاٹنا شروع کر دیں۔ یہ حملہ دہرا نتیجہ دے گا۔ ایک تو اچانک پن اور دوسرا طاقت کے ترازو کو اپنے حق میں لے آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ اِتنے گھوڑے آئیں گے کہاں سے؟''

بوچہ مل جانتا تھا کہ مہارانا ہاتھیوں اور پیادوں کی بھاری تعداد سے جنگ میں اُترنے میں یقین رکھتا ہے۔ وہ ایک سست اور طویل جنگ ہوتی ہے جو عموماً فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ گھڑ سوار اور گھوڑوں پر متحرک تیر انداز جنگ کے جلد اختتام کا سبب بنتے ہیں۔

مہارانا ڈاڑھی کو سہلائے جا رہا تھا، ''اِتنے گھوڑے آئیں گے کہاں سے؟''

''مہارانا سرکار! ہمارا دیش گھوڑوں کے لیے جانا جاتا ہے۔ آپ دہلی فتح کر کے یہاں کے گھوڑوں کی نسل کو عربستانی نسل کے گھوڑوں سے ملا کر اور بھی بہتر کریں۔ ہمارے ملک پر قبضہ کرنے والوں نے ہمیشہ اپنے گھوڑوں کی وجہ سے ہی ہمیں شکست دی ہے، اُن کے گھوڑے زیادہ مضبوط اور چست ہوتے ہیں۔''

''باقی لوگ ایسا کیوں نہیں سوچتے؟'' مہارانا نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

بوچہ مل نے ایک گھونٹ لیا اور جام نیچے رکھتے ہوئے مہارانا کے چہرے کو بھی دیکھا۔ مہارانا کے چہرے پر سلوٹیں اُبھری ہوئی تھیں۔ وہ اُسے عمر میں اپنے سے بھی بڑا لگا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جیسے حاکم ایسی باتیں سوچنا شروع کریں۔''

مہارانا نے جواب نہیں دیا۔ وہ شاید بات کو آگے نہیں چلانا چاہتا تھا۔

''تم نے اپنی خصوصیات نہیں بتائیں؟'' مہارانا نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں موسم کی پیش گوئی کر سکتا ہوں۔'' بوچہ مل نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

مہارانا کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ اُس نے گاؤ تکیے پر پہلو بدلا،

''بارش کروا سکتے ہو؟''

''نہیں مہارانا سرکار! میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ بارش کب ہو گی؟'' بوچہ مل کو مہارانا کے اگلے سوال کا پتا تھا۔ اُس نے ہوا کی رفتار، ہوا میں نمی، پرندوں کے مٹی میں نہانے، کرلوں کے دھوپ میں بیٹھنے اور چیونٹیوں کو اپنی خوراک بلوں میں لے کر جانے کے بارے میں سوچا اور اپنا اندازہ لگایا۔

''اگلی بارش کب ہونی ہے؟''

''تین سے پانچ دنوں کے درمیان۔'' بوچہل نے کچھ جھجکتے ہوئے مگر اعتماد کے ساتھ کہا۔ مہارانا نے استفہامیہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ بوچہل نے نظر نیچی رکھی۔

تیسری شام تک دھوئیں کی پتلی سی لکیروں کی طرح، بادلوں کی لٹیں آسمان پر ادھر اُدھر پھیل گئیں۔ بوچہل نے یہ تبدیلی محسوس کی لیکن پھر بھی وہ کچھ اُلجھا سا تھا۔ اُسے پریشانی تھی کہ اگر بارش نہ ہوئی تو رانا شاید اُسے تضحیک کا نشانہ بنائے اور اُس کے لیے یہاں مزید رہنا مشکل ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو اُسے رات کی تاریکی میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ وہ جہاں بھی گیا، اُسے کھوج لیا جائے گا۔ اگر کہیں جانا پڑا تو وہ دِن کے اُجالے میں ہی جائے گا۔ یہی باتیں سوچتے وہ ساری رات جاگتا رہا اور کوچی کتوں کا جوڑا تنبو کے باہر اُس کی رکھوالی میں چوکس رہا۔ یہ کتے اُسے ایک بلوچ جنگجو نے جب تحفے میں دیے تو اُس وقت اُن کی آنکھیں ابھی بند تھیں۔ کتوں کی دبی دبی غراہٹ میں دبی درخواست نے اُسے ہلایا۔ وہ نیزہ ہاتھ میں لیے باہر نکلا تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے کتوں کو اندر آنے دیا اور مطمئن اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے مہارانا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اُن دنوں میں بارش رات کے آخری پہر میں ہی ہوتی ہے۔

رائے بوچاٹل نے سوچا کہ وہ پندرہ سال کی عمر میں قسمت آزمائی پر نکلا تھا۔ آج تقریباً چار دہائیوں سے زیادہ کی قسمت آزمائی اور دشت نوردی کے بعد بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ تو ساری زندگی ہی اکیلا رہا ہے۔ اُس کی کہیں بھی وفاداری نہیں تھی لیکن اُس نے کسی کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ وہ کسی سردار، جاگیردار، راجہ، مہاراجہ، رانا اور مہارانا کے ساتھ اُس وقت تک رہتا جب تک محسوس کرتا کہ وہ اُس کی ضرورت تھا۔ وہ حملہ آور دستوں، دفاع کرنے والی ٹکڑیوں، گھات لگانے کی مہارت رکھنے والوں، کمندیں لگا کر محلوں میں داخل ہونے اور رہزنی کرنے والوں کا ایک اہم حصہ رہا تھا۔ اُس نے دولت کمائی تھی، علم حاصل کیا تھا، زبانیں سیکھی تھیں اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو زندگی کے تجربے کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ ایک دولت مند جاگیردار کی عورتیں اپنی جاگیر سے شہر کو جا رہی ہیں۔ اُن دنوں وہ ایک ایسے طالع آزما گروہ کا حصہ تھا جس نے بھوپال کے قرب وجوار میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ منصوبہ بنایا گیا کہ اُن عورتوں کو لوٹنے کی کارروائی ایسے کی جائے کہ اُس پر کسی اور کی چھاپ نظر آئے۔ وہاں کئی گروہ ایسی کارروائیوں میں مصروفِ عمل تھے اور ہر کسی کا طریقہء واردات اپنا اور دوسرے سے الگ تھا۔ بوچہ مل کے گروہ کا خاصا تشدد تھا؛ اُن کی ہر کارروائی خون پر اختتام پذیر ہوتی۔ یہ ایک خطرناک مہم ہونا تھی اور بعد کے نتائج کا بھی اُنھیں اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بھوپال کے نواب کے دستوں نے کتوں کی طرح اُن کے تعاقب میں لگ جانا ہے۔ بوچہ مل کا گروہ گھات لگانے میں ماہر تھا، انھوں نے گھات نہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے بھیس بدلے اور بدھ بھکشوؤں کا روپ دھار کر عورتوں کو لوٹا۔ اُن مسلمان عورتوں میں ایک ہندو عورت ایسی بھی تھی جو بوچہ مل کو پسند آ گئی۔ یہ انتہا کی شدت لیے ایک بہت مختصر پسندیدگی اور قبولیت کی واردات تھی۔ دیوی جوانی کی حدود میں داخل ہوتی ایک خوب صورت جوان عورت تھی جب کہ بوچہ مل اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں قدم رکھ چکا تھا۔ بوچاٹل دیوی کے گہنے اُتارنے لگا تو رات کی گہری تاریکی ایک دم روشن ہو اُٹھی اور دونوں

کی آنکھوں میں صدیوں کی شناخت زندہ ہوگئی۔ بوچہل نے دیوی کا آخری گہنا تک اُتار دیا اور ایسا کرنے میں دیوی نے بھی اُس کی مدد کی، جیسے دونوں جلدی میں ہوں۔ نہ سوئمبر نہ سوم رس کے چھلکتے پیالے، نہ گجرے اور نہ وداع کے گیت..... بوچاِل نے گہنے سردار کے سپرد کیے اور دیوی کو اپنے پیچھے سوار کرا کے گروہ سے الگ ہو گیا۔ وہ بھکشو کا روپ دھارے ایک سندری کے ساتھ دن کو بسرام اور راتوں کو سفر کرتا۔ اُس کا یہ سفر راجستھان کی طرف تھا۔ اُس نے اپنے اِس بہروپ سے بھی جان چھڑائی تھی۔ ایک دوپہر دیوی جب سفر کی تھکاوٹ سے گھوک سو رہی تھی، وہ بغیر آ۔ کے اُٹھا، پہر بھر کا سفر کر کے ایک بستی میں گیا اور اپنے لیے بیوپاریوں کے پہننے والا لبادہ حاصل کیا۔ دیوی ابھی نیند میں سے جاگنے کے عمل میں تھی کہ بوچہل بیوپاری کو دیکھ کر خوف زدہ ہوئی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''راء جی! تم مجھے ایسے ہی حیران کرتے رہو گے؟'' بوچہل نے اُسے غور سے دیکھا لیکن جواب نہیں دیا۔ اُسے دیوی کے اس طرح کے سُریلے سے ردِّعمل بہت پسند تھے۔ ''مجھے بھکشو رائین بنا دیتے!'' وہ پھر ہنسی تھی۔

آج وہ ایک سپاہی تھا اور بھکشو کے ساتھ ایک سندری جس طرح لوگوں کے شک بیدار کر سکتی تھی اسی طرح اکیلا سپاہی، بے امنی کے اُس دور میں شکوک جگا سکتا تھا۔ اُسے بھگوڑا، بہروپیا یا جاسوس سمجھ لیا جاتا تھا، اپنی عمر کی وجہ سے اُسے وِدیارتھی کبھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اُس کا کوئی دیس یا وطن نہیں تھا، بس دیوی بھٹنڈہ کے باہر کیکروں کے ایک جنگل میں اکیلی بیٹھی اُس کی منتظر تھی۔ اُس نے اب اُسے اکیلے نہیں چھوڑنا تھا اور اُسے اُس کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ بوچہل نے مہارانا سے الگ ہونے کے بعد پہلے کوئی روپ دھارنے کا فیصلہ کیا۔ بھوپال کی عورتوں کو جب لوٹا گیا تھا تو بھکشو بننے کا بھی اُس نے ہی مشورہ دیا تھا۔ اُس نے کھیتی کرنے والے کا روپ دھارا اور اپنی تلوار، کھود، تنگ موری والا موٹے کپڑے کا پاجامہ، موٹے چمڑے کے بھاری جوتے، زخم پر لگانے والی مرہمیں، پٹیاں اور چمڑے کے دستانوں کی گٹھڑی بنا کر زین کے ساتھ لٹکائی اور بیجوں کی چند پوٹلیاں گھوڑے کی گردن کے ساتھ لٹکا کر چلتا رہا۔ گھوڑا صرف زین اور سوار کا عادی تھا اور اُسے گردن کے ساتھ جھولتا یہ بوجھ کچھ عرصہ تو ناگوار گزرا مگر پھر وہ اِس لٹکتے ہوئے وزن سے مانوس ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تین راتوں کا سفر دو دن اور ایک رات متواتر چلنے سے طے کر لے

گا۔ وہ چھ پہر سفر کرتا اور گھوڑے کے لیے دو پہر کا آرام کرتا۔ اُس نے توجہ سے بچنے کے لیے گھوڑے کو گام تو چلائے رکھا لیکن اُس کے اندر ایک آگ جل رہی تھی کہ سرپٹ بھگا کر جتنا جلدی ہو سکے دیوی کے پاس پہنچے۔ اِتنے سالوں سے دیوی اُس کے ساتھ مستقل نقل مکانی میں رہی لیکن وہ اُسے کبھی غیر محفوظ نہیں لگی تھی۔ وہ جب اپنی مہموں پر جاتا تو اُسے کس کے سپرد کر کے جاتا تھا؟ وہ کسی گھنے جنگل میں اُس کے انتظار کی طاقت سے اپنے خوف کو دور رکھے سہمے کے کوڑے سہتے رہتی۔ آج وہ غیر محفوظ تھی اور اُسے بٹھنڈہ پہنچنے میں دیر نہیں کرنی تھی۔

رائے بوچہ مل یہ طویل سفر ایک ہی رفتار سے طے کرتا رہا۔ اُسے پُر خطر راستے اپنے ہاتھ کی لکیروں کے خموں اور قوسوں کی طرح زبانی یاد تھے۔ وہ اِن راستوں پر کبھی تعاقب میں آنے والوں سے بچنے کے لیے اور کبھی تعاقب کرنے والوں سے بچنے والوں کے تعاقب میں کئی بار گھوڑے دوڑا چکا تھا۔ آج وہ اپنے ہی تعاقب میں تھا اور اُسے اپنے آپ تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ اپنے سفر میں آبادیوں، بستیوں اور شہروں کے بیچ میں سے گزرنے کے بجائے اُن کے گرد چکر کاٹ کر گزرا۔ وہ کسی قسم کی اُلجھن یا مشکل میں گھرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے سپاہ گری اُسی وقت چھوڑ دی تھی جب مہارانا نے اُسے پیشہ تبدیل کرنے کا کہا تھا۔ وہ تو سوائے سپاہ گری کے کسی پیشے سے واقف ہی نہیں تھا۔ وہ دیوی اور اپنے زندہ رہنے کے لیے کیا کرے گا؟ کیا سپاہ گری چھوڑ کر وہ گھاتیں لگانا شروع کر دے؟ وہ کیوں نہ تلوار کو خیر آباد کہہ دے؟ وہ پچھلی چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ تلوار کو ہی اپنی زبان بنائے ہوئے تھا۔ اُسے تلوار کو خیر آباد کہنا اِتنا آسان نہیں لگا لیکن اُس نے سوچا کہ یہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اُس نے گھوڑے کو روکا؛ تب تک وہ آدھا راستہ طے کر چکا تھا۔ وہ رکاب پر وزن ڈالے بغیر گھوڑے سے نیچے کودا اور زین کے ساتھ لٹکتی ہوئی گٹھڑی کو کھول کر تلوار نکالی۔ تلوار اپنے میان کے اندر کسی معصوم بچے کی طرح گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ یہ تلوار پچھلی دو دہائیوں سے اُس کی شریکِ زندگی رہی تھی۔ یہ راج پوت کی تلوار تھی اور راج پوتوں کی تلواریں دو دھاری ہوتی ہیں۔ یہ تلوار اُس کی غم خوار ہونے کے ساتھ اُس کی نجات دہندہ اور محافظ بھی رہی تھی اور آج اُس نے وہ زندگی کہیں ماضی میں دفن کر دینا تھی جس کے ساتھ تلوار وابستہ تھی۔ اگر باز کی چونچ سیدھی کر دی جائے اور پنجوں کے ناخن کاٹ دیے جائیں تو کیا وہ شکار کر سکتا ہے؟ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی چونچ سیدھی کر لے گا اور پنجوں کے ناخن بھی کاٹ لے گا: وہ شکاری کے

بجائے شکار بن کر زندہ رہے گا، اپنے لیے نہیں؛ دیوی کے لیے..... تلوار کو غصے یا نفرت یا اُکتاہٹ سے پھینکنا تلوار کی بے عزتی کرنا تھی۔ وہ تلوار کو ایک عزت اور احترام کے ساتھ اپنے سے جُدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تلوار جُدا ہونے کے بعد بھی اُس کے لیے اچھا شگون رہے۔ اُس نے آہستہ، ایک احترام کے ساتھ تلوار کو میان میں سے نکالا۔ وہ اب ایک معصوم بچہ نہیں تھی۔ اُس کی تیز دھار ایک ہی وار میں مخالف یا دوست کے دو ٹکڑے کر سکتی تھی۔ وہ تلوار کے اندر کی اِسی بربریت سے خائف تھا جو کسی اور کی تلوار میں بھی تھی۔ وہ خطروں سے کھیل چکا تھا اور اب جب مہارانا کا دلی آنے کا پیغام آیا تو وہ نہیں جائے گا، بلکہ کسی کو اُس کا پتا ہی نہیں ہوگا..... ایک گمنام بوڑھا اور ایک خوب صورت، درمیانی عمر کو چھوتی عورت!

اُس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے چمک رہے تھے اور اُس کی وہی حالت تھی جو دشمن سے پہلا سامنا ہونے پر ہوتی ہے؛ دونوں ایک دوسرے کی اہلیت سے بے خبر! اُس نے تلوار کو آخری بار دیکھا، اُسے محبت کے ساتھ چوما اور ایک درخت کے دو ساکھے میں اِس طرح بٹھا دیا جیسے وہاں اپنے بچے کو بٹھایا ہو۔ پھر وہ اُلٹے قدم گھوڑے کے پاس آیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مہارانا بلی کے بیٹی کے ہاتھ میں سے روٹی جھپٹ لینے پر رویا تھا اور وہ تلوار کو بیٹی بنا کر اُس سے جدا ہوتے ہوئے۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور چلنے سے پہلے تلوار کو آخری پرنام کیا!

وہ جلدی میں تو تھا لیکن جلدی میں نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ تلوار نہ ہونے سے وہ غیر محفوظ ہوگیا تھا، اتنا غیر محفوظ کہ اُسے خوف آنے لگا۔ وہ تو کبھی ڈرا ہی نہیں تھا، اُس کی خوف کے ساتھ شناسائی ہی نہیں تھی۔ ساری زندگی وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرا تھا اور آج اُسی جان کی سلامتی چاہتا تھا۔ کیا وہ بزدل ہوگیا تھا؟ وہ جس کی تدبیراتی حاضر دماغی سے دوست بھی کانپتے تھے، اب اپنی جان کے گرد بے اطمینانی اور کم اعتمادی کا جالا بُنے ہوئے دلیر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھٹنڈہ ایک غیر محفوظ جگہ ہونے کے باوجود اُسے پسند تھا؛ بھٹنڈہ اُسے اِس لیے ناپسند تھا کہ ہر بیرونی حملہ آور ملتان سے سیدھا پہلے بھٹنڈہ آ کر دلی جاتا اور اِسی وجہ سے شہر جاسوسوں اور مخبروں کا گھر تھا۔ پسند اِس لیے کہ بوچہ مل بھٹی راجپوت تھا اور بھٹنڈہ کو بھٹی راجپوت بادشاہوں نے آباد کیا تھا۔ اِس مناسبت سے وہ اِسے اپنا ہی شہر سمجھتا۔ وہ اِس شہر کو وٹنڈہ اور کبھی بھٹنڈہ بھی کہتا۔ اُس نے ایک طویل عرصہ اِس شہر کے گردونواح میں، مہارانا کے ساتھ گزارا تھا اور آج اُسے اپنی بے سروسامانی پر فخر بھی تھا۔ وہ اُس شان کا حصہ رہا تھا جو اِس راستے نے دیکھی تھی۔ کبھی رتھ اور کبھی ہاتھی اور کبھی سرپٹ دوڑتے گھوڑے یہاں سے گزرے تھے اور وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہمیشہ کبھی اُن کے ساتھ ہوتا اور کبھی ایک طرف کھڑے یہ سب دیکھا کرتا، اُسے لگتا تھا کہ یہ وہ زندگی تھی جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اُس کی زندگی تو ایک فقرے نے ہی ختم کر دی تھی، وہ جو بہادری کی ایک مثال تھا اور جس کی بات کی دلیل کا وزن اگلے کو ہمیشہ لاجواب کر دیتا تھا، بول ہی نہ پایا، اپنی کوئی دلیل ہی پیش نہ کر سکا۔ سپہ گری نے شاید یہی سکھایا تھا کہ اپنے سردار کا حکم ماننا ہی پیشہ وری ہے۔ وہ ایک پیشہ ور سپاہی تھا اور اُس نے اپنی ساری عمر گھوڑے کی پیٹھ پر ہی گزار دی تھی۔ وہ چلتے ہوئے گھوڑے پر بھی سو جاتا رہا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو مکمل پیشہ ور رکھنے کے لیے نیند کو اپنی زندگی کا غیر اہم ترین حصہ بنا لیا تھا۔ اُس نے اپنے سونے کے کوئی اوقات مقرر نہیں کیے تھے، جب اور جہاں جتنا وقت ملا، سو لیا، خواہ وہ گھوڑے کی پیٹھ ہی کیوں نہ ہو!

وہ ایسے ہی خیالوں میں گم چلتا رہا۔ وہ مختصر سے عرصوں کے لیے سو کر جاگ جاتا اور

جب سفر کی تھکاوٹ بھاری ہو کے چھانے لگتی تو پھر مختصر عرصے کے لیے سو جاتا۔ اُس نے گانے کبھی نہیں گائے تھے گو اُسے گانا سننے کا شوق تھا۔ وہ اکثر پکے راگ سنتا اور ذہن میں گانے والیوں کے ساتھ ایسے گاتا کہ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اُن سے بہتر گا رہا ہے۔ اُس نے اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے گنگنانا شروع کیا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی آواز بلند کرنے لگا۔ اُس کے کانوں کو اپنی آواز غیر مانوس سی لگ رہی تھی اور اُسے محسوس ہوا کہ گھوڑا بھی قدرے اُکتاہٹ کا شکار ہو رہا ہے، اُسے کچھ شرمندگی بھی ہوئی لیکن ایک ہی رفتار سے چلتے یہ طویل سفر اعصاب پر بوجھ بن جاتا تھا اس لیے بوچہ مل نے گاتے چلے جانے کا ہی فیصلہ کیا۔ اُس کا گلا خشک ہونے لگا، وہ تھوک نگل کر خشک گلے کو تر کرتا جاتا اور بتدریج اُسے اپنی آواز کے ساتھ ایک طرح کی مانوسیت کا احساس ہونے لگا۔ گانے والوں کے برعکس اُس کی آواز بھاری نہیں تھی، اُس نے آواز نچلے سروں میں رکھ کے، بھاری بنا کر گانا شروع کیا۔ اُس کے گلے پر خاصا دباؤ پڑ رہا تھا لیکن وہ گاتا رہا۔ اُسے اپنی آواز سُر میں لگی؛ وہ خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا اور اسی سرمستی میں اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی جو سوار اور سواری دونوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ گھوڑا آگے کی طرف لپکا اور بوچہ مل جسے گھوڑے کے اِس ردِعمل کی اُمید نہیں تھی، پیچھے کی طرف لڑھک کر نیچے گرنے کو ہی تھا کہ گھوڑا رک گیا۔ بوچہ مل نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیچے اُتر کر گھوڑے کی گردن تھپتھپائی، تھوڑی دور تک باگ ہاتھ میں لے کر چلا، پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

وہ ایسے ہی چلتا رہا!

دیوی اُن مسلمان بھوپالی عورتوں میں واحد ہندو تھی۔ وہ اُس کے ساتھ سات سالوں سے رہ رہی تھی لیکن اُس نے دیوی سے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ اُن عورتوں کے ساتھ کہاں جا رہی تھی؟ اُس کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں تھا لیکن ایک طرح سے ضروری بھی تھا؛ ضروری اس لیے نہیں تھا کہ وہ دونوں اکٹھے رہ رہے تھے، ضروری اِس لیے تھا کہ دیوی نے اُسے بتایا ہی نہیں تھا۔ کیا وہ دیوی کو چھوڑ سکتا ہے؟ نہیں، اِس لیے کہ اب اُس کا اِس ملک میں کوئی نہیں رہا تھا۔ اُسے ایک سہارے کی ضرورت تھی اور دیوی ہی اُس کا واحد سہارا تھا۔

وہ دیوی کے متعلق سوچتے ہوئے چلتا رہا۔ گھوڑا بھی اب اپنی منزل سمجھ گیا تھا اور بوچہ مل گھوڑے کو صحیح راستے پر رکھنے کی پریشانی سے آزاد سا، زین پر اپنے خیالات میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بیاس کے کنارے جا کر آباد ہونا تھا۔ وہ کسی بستی میں نہیں جائے گا، اُس کے لیے لوگوں کے رویوں کو برداشت کرنا مشکل ہوگا۔ بیاس کے گرد، بٹالہ کے آس پاس بھٹی راجپوتوں کی کئی آبادیاں تھیں، وہ

اُنھیں کے گرد و نواح میں آباد ہوگا۔ اُس نے سوچا کہ وہ نہ سمجھتے ہوئے اپنے لیے نیا پیشہ چن چکا ہے! بیجوں سے بھری پوٹلیاں تو اُس نے اپنے بہروپ کو تکمیل دینے کے لیے لٹکائی تھیں لیکن اب یہی بیج اُس کا پیشہ ہوں گے۔ بوچہل نے کبھی کاشت کاری نہیں کی تھی، وہ کاشت کاری کرنے والے اوزار کے نام بھی بھول چکا تھا لیکن اُس نے زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا، بھیک مانگ کر باقی کے دن گزارنے سے تو رہا! بھٹنڈہ سے بیاس تک کا فاصلہ ایک رات میں طے نہیں ہو سکتا تھا اور دیوی کو گھوڑے کے پیچھے بٹھا کر لے جانا کوئی باوقار طریقہ نہیں تھا، اُسے سواری کا بندوبست کرنا ہوگا۔ سب سے مناسب سواری کیا ہوگی؟ اُس کے خیال میں سب سے مناسب سواری تو بیل گاڑی تھی۔ بیل گاڑی آئے گی کہاں سے؟ بیلوں کی جوڑی، ایک گاڑی، جو اتنی چوڑی ہو کہ بوقتِ ضرورت اُس میں دیوی سو سکے! بیلوں کی مناسب قسم کی جوڑی اور گاڑی کو خریدنے کے لیے پیسوں کی فوری ضرورت ہوگی۔ اُسے خیال آیا کہ کچھ پیسے دیوی کے پاس تھے اور کچھ اُس کی اپنی کمر کے ساتھ بندھے ہوئے۔ جب وہ بیل گاڑی میں سفر کر رہے ہوں گے تو گھوڑے کا کیا کرے گا؟ کیا دیوی سے مشورہ کرے؟ وہ تمام زندگی اپنے فیصلے خود ہی کرتا آیا تھا، کیا اچانک وہ اِتنا کمزور ہو گیا ہے کہ اُسے دیوی سے مشورے کی ضرورت پڑ گئی؟ اُسے تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا؛ وہ تو کبھی تھکا ہی نہیں تھا۔ کیا وہ اپنے مستقبل سے خائف ہو گیا تھا؟ سپہ گری کے بعد کیا اُس کا کوئی مستقبل ہے؟ اُسے لگا کہ یہ ایسے ہی ہے کہ کسی کا جوان بیٹا فوت ہو جائے! اُس کے ہونٹوں پر مایوسی سے بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسے اِن رشتوں کے بارے میں کیا جانکاری ہو سکتی ہے؟ شاید وہ کسی کا بیٹا رہا ہو، اُس کا تو کوئی بیٹا نہیں۔ اُس کا جی پلٹ کے اُس دو سانگھے سے تلوار اُٹھا کے کسی فوج میں شامل ہونے کو کر آیا، چاہے وہ مغل فوج ہی کیوں نہ ہو! اُس نے آنکھیں بند کر کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈاڑھی میں انگلیاں پھیریں۔ اُسے یاد آیا کہ مہارانا سوچتے ہوئے ایسے کیا کرتا تھا! مہارانا کس حال میں ہوگا؟ کیا وہ میدینی راؤ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا یا مغل اُس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے؟ کیا مہارانا سانگھا نے اُسے اِس لیے تو کسی اور طرف جانے کو نہیں کہا تھا کہ وہ اُس کی جدوجہد کو جاری رکھے؟ مہارانا سانگھا سوریہ ونشی راجپوت تھا اور وہ خود چندر ونشی! چندر ونشی زیادہ مدلل، ٹھنڈے مزاج کے اور باحکمت ہوتے ہیں جب کہ سوریہ ونشی چوں کہ سورج سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اِس لیے اُن میں جوش اور غصے کی کثرت بعض اوقات غلط فیصلوں کا سبب بنتی ہے۔ مہارانا بھی بعض اوقات ضد پر آ کر اپنا فائدہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ وہ مہارانا کی جدوجہد کو کیسے جاری رکھ سکتا ہے؟ اُس نے تو اپنی

راجپوتی کھڈ تلوار ہی ترک کر دی ہے۔ کیا وہ واپس مڑے اور اپنی تلوار اُٹھا لائے؟ نہیں! اُس نے تو ابھی اپنا نام آگے چلایا ہی نہیں جب کہ مہارانا ہر جنم میں زندہ رہے گا۔ اُسے بھی جنموں میں زندہ رہنا ہے جس کے لیے اُس کا دیوی کے پاس جانا ضروری ہے۔

بوچا مل کو پتا ہی نہ چلا اور وہ لکھی جنگل میں پہنچ گیا۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا جس کے دو حصے مشہور تھے۔ ایک حصے میں دیا لو لنگر تقسیم کرتے اور وہاں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا اور دوسرا کیکروں کا وہ نا قابلِ گزر حصہ تھا جس میں دیوی اُس کی منتظر تھی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو شام ہونے کو تھی اور دور دور تک کوئی جان دار نظر نہیں آرہا تھا۔ بوچہ مل نے گھوڑے پر سے زین اُتاری، گھوڑے کی کمر پسینے سے بھیگی ہوئی تھی، اُس نے کمر پر ہاتھ پھیر کر گردن پر تھپکی دی تو گھوڑے نے ایک جھرجھری لے کر اُس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظر ملی تو بوچہ مل نے اُس کی پیٹھ پر ہلکی سی چپت لگائی تو گھوڑے نے آزادی کی ایک جست بھر کر اُس کی طرف دیکھا اور زمین پر لیٹ کر ایک لوٹنی لگائی۔ بوچہ مل اُسے دیکھتا رہا۔ کہا جاتا تھا کہ جب گھوڑا لیٹتے ہوئے کمر کے بل دوسری طرف پلٹا لگا لے تو اُس کی تمام تھکاوٹ اُتر جاتی ہے۔ گھوڑا دو بار کوشش کرنے کے بعد تیسری مرتبہ کامیاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بدن کو جھاڑ کر بوچہ مل کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ لیٹتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف پلٹا لگا جانا آسان نہیں سمجھا جاتا اور یہ گھوڑے کے طاقت ور ہونے کی نشانی ہے۔ بوچہ مل مطمئن ہو گیا کہ طویل سفر گھوڑے کو کمزور نہیں کر سکا تھا۔ اُسے جہاں بھی پانی نظر آیا اُس نے گھوڑے کو پلایا اور رات وہاں پڑاؤ کیا جہاں گھوڑا پیٹ بھر کے چر سکے۔

بوچا مل نے زین کاندھے پر رکھی اور انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے سیٹی بجائی۔ گھوڑے نے کنوتیاں کسیں، دم اُٹھائی اور شان سے دلکی چلتے ہوئے اگلی لمبی سیٹی بجنے تک آزاد ہو گیا۔ گھوڑے کو آزاد کرتے ہوئے بوچہ مل اگلے سفر یا مہم کی وجہ سے ہمیشہ ایک کھچاؤ کا شکار ہوتا تھا۔ آج اُسے لگا کہ وہ گھوڑے کی عارضی خوشی کی وجہ جان گیا ہے۔ اُسے کوئی کھچاؤ نہیں تھا، اُس کی پرانی وابستگیاں ختم ہو گئی تھیں اور اُس نے ایک نئے سفر پر چلنا تھا جو ہر سفر کی طرح مشکل ضرور تھا، خار دار نہیں۔ بوچہ مل نے لمبی سانس لی اور نا قابل گزر جنگل میں اُس گہرے اور میٹھے پانی کے کنویں کی طرف چل پڑا جہاں دیوی ڈیرا جمائے، اُس کی منتظر تھی!

دیوی کیکر کے پھولوں کے گجرے بنائے چٹائی پر بیٹھے، ایک مسکراہٹ کے ساتھ، اُسے آتے ہوئے دیکھتی رہی، وہ اُٹھی نہیں۔ بوچا ل کو اُس کا رنگ روپ نکھرا نکھرا سا لگا، شاید وہ ہر مرتبہ ایسے لگتی ہو اور اُس نے کبھی غور ہی نہ کیا ہو۔ بوچا ل کو دیوی سے آنکھ ملاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوئی: کیا وہ اُس سے خائف تھا؟ یا محض ایک بے یقینی تھی؟ بوچا ل اُس کے پاس آ کر رکا اور اُسے اپنا رنگ سُرخ ہوتے محسوس ہوا۔ پھر وہ تنبو کے اندر ایک کونے میں گھوڑے کا ساز رکھنے لگا۔ ساز رکھتے ہوئے اُسے یاد آیا کہ اُس نے کتے نہیں دیکھے۔

''دیوی!'' اُس کی آواز میں پریشانی اور خوف تھا۔

دیوی تنبو کے باہر کھڑی تھی۔ تنبو کے اندر آنے والی روشنی میں ایک سایہ سا لہرایا تو بوچا ل سمجھ گیا کہ دیوی اُس کے پیچھے چلی آئی ہے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا؛ دیوی مسکرائی۔ بوچا ل نے پہلی مرتبہ غور کیا کہ دیوی نہ صرف شکل کی اچھی تھی، اُس کا قد بھی دراز تھا۔ اُس نے تنبو کے اندر نظر دوڑائی، ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔

''دیوی! کتے کہاں ہیں؟''

''شام کے وقت وہ کہیں چلے جاتے ہیں۔'' بوچا ل کی پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوچی کتے ہر رات اپنی طے شدہ جگہوں پر پہرہ دینے بیٹھ کر صبح تک چوکس رہتے ہیں اور صبح ہوتے ہی سو جاتے ہیں اور پھر ہر شام تھوڑی دیر کے لیے تازہ دم ہونا اُن کے معمول کا حصہ ہے۔

دیوی نے چولھے میں آگ جلائی۔ بوچا ل نے کنوئیں میں ڈول ڈال کے پانی نکال کر پیا اور منہ دھویا۔ دیوی، بوچا ل کو چلتے پھرتے دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے بوچا ل کی چال میں ایک تبدیلی لگی۔ بوچا ل نے تنبو کے گرد ایک چکر لگایا۔ پہلے کبھی ایسے نہیں ہوا تھا۔ بوچا ل آتے ہی سو جایا کرتا تھا، اُسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تنبو کے اندر گیا اور اُس نے جو، گندم اور آٹے کی بوریوں کو اُٹھا کر اُن کا وزن محسوس کیا اور تمام چیزوں کی ذہنی فہرست بنائی۔ اب: دیوی

کا تجسس قابو میں نہیں رہا تھا۔

''راء جی؟'' اُس کی آواز میں مٹھاس تھی۔ بوچال اپنا جائزہ ترک کر کے چولھے کے پاس آیا تو کتوں کے بھاگنے کی آواز نے اُسے بیٹھنے سے روک دیا۔ کتے کچھ دیر ایک کچھاؤ کی کیفیت میں اُسے دیکھتے رہے اور پھر مطمئن سے بیٹھ گئے۔ ابھی اُن کا اپنا اپنا مورچہ سنبھالنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ بوچال چولھے کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بتاؤ؟'' دیوی نے بغیر تمہید کے سوال کیا۔

''میں اب سپاہی نہیں رہا۔'' بوچال اپنی آواز کے اندر چھپے دکھ سے خود ہی خوف زدہ ہو گیا۔ دیوی کو ایک دم خیال آیا کہ بوچہل کے پاس تلوار نہیں۔ اب اُس نے تبدیلی کو جان لیا، وہ خاموش رہی۔

''رانا سانگھا نے حکم دیا ہے کہ میں عمر میں ڈھل گیا ہوں اِس لیے بیاس کے کنارے آباد ہو کر اُس کے پیغام کا انتظار کروں۔'' دیوی خاموش رہی۔ اُس سے کبھی رائے نہیں لی جاتی تھی۔ اُسے خاموشی سے بوچہل کو سنتے جانا تھا۔ بوچال چپ چاپ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے دیوی کی رائے کا انتظار تھا۔

''تمھیں کیسا لگا؟'' اُس نے خاموشی کو توڑا۔ دیوی نے کٹورے میں پانی ڈالا، تھالی بوچہل کی طرف سرکائی اور گلا صاف کر کے خاموش بیٹھی رہی۔

''بتاؤ؟''

''میری بات کی اہمیت ہوگی؟''

''ہاں!'' بوچہل نے لقمہ منہ میں ڈالا۔ وہ دو دن کا بھوکا تھا۔

''جو ہوا..... '' وہ تھوڑا سا رُکی، ''بہتر ہوا!''

''کیوں؟'' بوچال نے پانی کے گھونٹ سے لقمہ حلق سے نیچے کیا۔

''انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب اُسے اپنے متعلق بھی سوچنا ہوتا ہے۔''

بوچال اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی وہ بے یقینی اور عدم اعتمادی کا شکار تھا۔ اُسے پچھلے دو دنوں میں ایک بار پھر سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی، شاید وہ اِس جنگ کے اصولوں سے واقف نہیں تھا۔ اُسے دشمن کی تعداد اور نہ ہی اُس کی عمومی تدبیروں کے بارے میں

کچھ علم تھا، ایسے تھا جیسے رتھوں کی ان گنت تعداد کے ساتھ اکیلا ہی تکرار رہا ہو! دیوی کے جواب نے اُسے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ وہ نظر جھکائے، کچھ دیر، کھانے میں مصروف رہا۔

''مجھے نئی زندگی شروع کرنی چاہیے؟'' بوچامل کی آواز میں ایک کھچاؤ تھا۔ اُس کا حلق خشک ہو گیا اور اُس نے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔

''ہاں!'' دیوی ایک دم وسطِ ہند کی عورت میں تبدیل ہو گئی جسے مرد کو رجھانے کے تمام اصول آتے ہیں۔ اُس نے اپنے آنچل کو ایسے درست کیا کہ وہ بہت واضح ہو گئی، اپنے نچلے ہونٹ کو ہلکی سی جنبش دے کر تر کیا اور اوپر والے ہونٹ سے تھوڑا آگے کر کے مستی بھری آنکھوں سے بوچامل کی طرف دیکھا۔ بوچامل نے یہ چلتر گانے والیوں میں ہی دیکھے تھے، وہ قدرے چکرا گیا اور قدرے بے یقینی اور گھبراہٹ سے تصدیق کے لیے دیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ میں سراپا دعوت تھی۔ بوچامل نے سہارے کے لیے کتوں کی طرف دیکھا، وہ اپنی تھوتھنیاں اگلے پنجوں پر رکھے سو رہے تھے؛ صرف سنسناتی ہوئی رات سے اُس کی نظر ملی۔ ایسی راتیں اُس کی ہمدم ہوا کرتی تھیں، آج وہ گھپ اندھیرے سے خوف زدہ تھا۔ اُس نے مزید سہارے کے لیے دیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اپسرا بنی بیٹھی تھی۔ بوچامل کو اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپی محسوس ہوئی۔ وہ ایک لمحے میں خوف کی کئی منزلیں طے کر گیا۔ اُسے دیوی ہی واحد سہارا لگی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دیوی نے چولھے کو ایک نظر دیکھا۔ وہاں آگ سلگ رہی تھی۔ اُس نے بار بار پانی کی چلیاں پھینک کر آگ بجھائی، دیر تک دھواں اُٹھتا رہا!

''راء جی! اپنی مشکل بتاؤ؟'' دیوی کی سرگوشی نے نیند کی گہری کھائی میں سے ایک دھکے کے ساتھ اُسے نکال باہر پھینکا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آیا، وہ تو باہر مورچے سنبھالے کوچیوں کی طرح ہر آہٹ پر حملہ کرنے کے لیے تیار سویا کرتا تھا۔ اُس نے شکست تسلیم کر لی۔ اُسے سکون محسوس ہوا اور اپنے آپ سے شرمساری بھی۔

''ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔ تم نے اگر مجھے دخل دینے کی اجازت دی ہے تو پھر میری مانو بھی۔'' سہارے کے لیے بوچامل، دیوی کے ساتھ لگ گیا، ''اب وقت ہے کہ اپنا خاندان بنانے کا بھی سوچو۔'' بوچامل کو یاد آیا کہ وہ راستے میں یہ بھی سوچتا رہا تھا۔ دیوی نے اُس کی سوچ کی تائید کر دی ہے۔ اُس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ہونی چاہیے؛ بیٹا ہو جائے تو پھر پوتا یا پوتی بھی ہوں گے۔ اُسے اپنے

اندر ایک دریا بہتے ہوئے محسوس ہوا۔

''میں وٹالہ جانا چاہتا ہوں۔'' بوچا‌ل نے اعلان کیا۔ اُسے لگا کہ وہ پھر سے ہلکا ہو گیا ہے۔ وہ آہستہ سے دیوی کے پہلو سے اُٹھا اور چادر لپیٹ کر تنبو میں ٹہلنے لگا۔ ''وہاں جائیں گے کیسے؟'' اُس نے اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تم سامان کا وزن اِسی لیے کر رہے تھے؟''

''ہاں۔ سفر لمبا ہے۔''

''تم نے کچھ سوچا ہے؟''

''ہاں۔ سارا راستہ یہی سوچتا رہا ہوں۔ وٹالہ سے آگے دریائے بیاس ہے۔ وہ پار کر کے کہیں آباد ہو جائیں گے۔''

''میں تمھارے ساتھ ہوں۔'' دیوی لیٹی ہوئی تھی اور اُس کا جسم چاندنی میں چمک رہا تھا۔ بوچا‌ل سامنے رُک کر اُسے دیکھنے لگا، دیوی نے نظر جھکا لی۔

''ہم نے بیل گاڑی خریدنی ہے۔'' بوچا‌ل نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ دیوی اُس کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گئی۔

''اور بیل بھی!'' دیوی نے لقمہ دیا۔

''ہاں بیل بھی.....'' پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ اُس کے ذہن میں سفر والی باتیں سائے کی طرح لہرانے لگیں۔

''گھوڑے کا کیا کریں؟'' بوچا‌ل نے پوچھا۔

''ہاں! گھوڑے کا کیا کریں؟'' دیوی نے اُسی لہجے میں دہرایا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے بوچا‌ل کی چادر کے اندر گھس کر اطمینان بھری ایک کپکپی لی۔ بوچا‌ل نے اُسے تھام لیا۔

''اِسے بیچنا پڑے گا۔'' بوچا‌ل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں! تم خود ہی کہا کرتے ہو کہ گھوڑوں کو ضائع نہیں کرتے۔ بیچنا! اِسے ضائع کرنا ہوگا۔'' بوچا‌ل گھوڑے کو بیچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس کے پاس رکھنے کا جواز بھی نہیں تھا۔

''نہیں بیچیں گے۔'' بوچا‌ل نے فیصلہ کر لیا۔ اظہارِ تشکر کے طور پر دیوی نے اپنا سر بوچا‌ل کے کاندھے پر رکھ دیا۔

''جوڑی بیل اور ایک کھلی گاڑی جس میں تم لیٹ سکو۔'' بوچاملؔ نے بات جاری رکھی۔ وہ یہاں آتے ہوئے سوچی جانے والی باتیں دہرانے لگا۔ ''وتالہ پہنچ کر بھٹیوں کے کسی گاؤں کے قریب آباد ہونا ہے، کسی گاؤں میں نہیں۔ میں لوگوں کے ساتھ مل کے نہیں رہ سکوں گا۔ زمین کاشت کریں گے اور اگر مہارانا نے دلی فتح کر لی تو اُس کے ساتھ جا ملیں گے۔ دلی فتح ہو جائے گی؟''

دیوی، وسطِ ہند کی عورت کی طرح اپنے آدمی کے ہر معاملے سے باخبر تھی۔ اُن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر روپ دھار سکتی تھیں۔ بوچہ مل، دیوی کو اپنے معاملات سے الگ رکھے ہوئے تھا تو اُس نے نہ کبھی سوالات کیے تھے اور نہ ہی کوئی مشورہ دیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اُتنا ہی کھولا جتنا بوچہ مل چاہتا تھا۔ اب بوچہ مل اُس سے سوال کیے جا رہا تھا اور اُس کے پاس تمام جواب تھے۔ شام سے بوچہ مل کی باتیں سن کر اور اُس کی بے یقینی کو محسوس کر کے وہ کچھ فیصلے کر چکی تھی۔ بوچہ مل ابھی تک مضبوط تھا اور اُس کا جسم اُسے طاقت بھی دے رہا تھا۔

''دلی فتح بھی ہو جائے تو وہاں نہیں جانا۔'' دیوی نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

بوچامل نے کچھ دیر جواب نہیں دیا۔ وہ بے خیالی میں دیوی کی چھاتیاں سہلانے لگا۔ دیوی نے ہنستے ہوئے بوچہ مل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے خاموش دیکھ کر بات جاری رکھی۔ ''دلی جا کر پھر وہی زندگی ہو گی، کئی کئی دن ملاقات نہیں اور ہر وقت جان کا خطرہ۔''

''میں پچھلے دو دنوں سے یہ ہی سوچ رہا ہوں۔ میں کھیتی باڑی کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے اپنی دوستی بھی نبھانی ہے۔ میں نے مہارانا کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے۔ اُس کا پیغام اگر آیا تو میں کیسے نہ جاؤں!''

دیوی نے بظاہر بے خیالی میں بوچہ مل کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ اُس کی چھاتی سہلانے لگا۔ اُس نے لمبا سانس لیا اور بوچہ مل کی بانہوں میں کسمسائی۔ بوچہ مل نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

''اب تم نے میرے ساتھ رہنا ہے۔'' دیوی نے اپنا جسم دور کرنا چاہا تو بوچہ مل نے اپنی گرفت مضبوط ہی رکھی۔

''نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں!'' بوچامل اُس لمحے کی طاقت کا متحمل نہ ہو سکا اور اُس نے دیوی کی شکتی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

کتوں کی آواز نے دیوی کو نیند سے باہر نکالا۔ وہ آہستہ سے اُٹھی تو بوچامل نے دوسری

طرف کروٹ لے لی۔ دیوی نے اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا کر اپنا لباس اُٹھا لیا۔

بوچال جب جاگا تو دن دو، پہر گزر چکا تھا۔ اُس نے تھکی تھکی، نیند سے بھری ایک نظر دیوی پر ڈالی۔ دیوی نے بوچہ ل کو کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی، اُس نے چند گٹھڑیاں بنا کر ایک کونے میں رکھی ہوئی تھیں۔ بوچال نے اردگرد دیکھا تو اُسے تنبو میں ہر طرف بے ترتیبی لگی۔

''ہم جانے کے لیے تیار ہیں۔''

وہ چھوٹا سا قافلہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اپنے سفر پر چل پڑا۔ راجستھانی بیلوں کی جوڑی ایک پرانی گاڑی کو کھینچ رہی تھی، دیوی اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے گاڑی بان کے بیٹھنے کی جگہ سے جڑ کر ایسے بیٹھے ہوئے تھی کہ سامنے سے آنے والا اُسے تب ہی دیکھ سکتا تھا جب وہ بالکل قریب آجائے۔ گاڑی کے پیچھے چادر ڈال کر ایک طرح سے پردہ کر دیا گیا تھا۔ بوچامل کو اپنی تلوار نہ ہونے کا قلق تھا اور اسی لیے وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ چند دن کا یہ سفر خطرے سے خالی نہیں تھا اور اُنھیں سخت احتیاط کرنا ہوگی۔ حفاظت کے لیے بوچہ مل کا انحصار بیلوں کی رفتار اور کتوں پر تھا۔

جب یہ قافلہ چلا تو کتے عجیب قسم کے جوش میں تھے۔ وہ متواتر بیل گاڑی کے گرد چکر کاٹے جا رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی دمیں اور کان اُٹھا کر ہوا کو سونگھتے اور مطمئن ہو کر بیل گاڑی کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیتے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اُن کے جوش میں کمی آ گئی اور اُنھوں نے باہمی تعاون سے بیل گاڑی کی نگہبانی شروع کر دی۔ ایک بیل گاڑی کے آگے چل رہا ہوتا تو دوسرا کچھ فاصلے پر پیچھے۔

بیلوں کی جوڑی بوچہ مل نے بٹھنڈہ سے ملحق ایک آبادی سے خریدی تھی۔ جوڑی مالک نے سودا کرتے وقت شروع میں تکرار کی لیکن پھر بوچہ مل کے مقامی علاقے اور قائدوں کے علم کو دیکھتے ہوئے تکرار چھوڑ کر مناسب قیمت وصول کر لی۔ وہیں بوچہ مل نے گھوڑے کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا اور اُس آدمی نے سودا کروانے میں بھی مدد کی۔ سودا طے پا جانے کے بعد بوچہ مل نے جب اُس آدمی کو دلالی دینا چاہی تو اُس نے انکار کر دیا۔

"سرکار! آپ مجھے عام آدمی نہیں لگے۔ جب آپ جیسا کوئی بڑا آدمی اپنا قیمتی سامان بیچے تو اُس کی مدد کرنی چاہیے۔"

اُس آدمی کے اِس جواب سے بوچہ مل ایک دم چوکنا ہو گیا اور کسی قسم کی گفتگو میں مزید

اُلجھے بغیر بیل گاڑی لے کر واپس چل پڑا۔ دیوی نے گھوڑا بیچے جانے پر کوئی بات نہیں کی، وہ اپنے خیالوں میں گم وہیں بیٹھی ہوئی تھی جہاں وہ اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ بوچاِل کو اپنی زندگی کے بغیر کسی مقصد کے اِس طرح گزر جانے کا دُکھ ہوا؛ اُسے لگا کہ ایک خنجر اُس کے آر پار ہو گیا ہے۔

''صبح منہ اندھیرے چل پڑنا ہے۔'' بوچاِل نے اپنی آواز متوازن رکھی۔

''میں تیار ہوں۔'' دیوی نے اُسی بجھے ہوئے لہجے میں کہا جس طرح وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ میں ماں باپ کے گھر سے جُدا ہو رہی ہوں۔ یہ سال جو ہم نے دور رہ کر قریب ہونے کی خواہش میں گزارے دراصل میری زندگی کا حصہ نہیں ہیں، میں اب اُن کی قید سے آزاد ہو گئی ہوں۔'' دیوی نے ایک لمبی سانس کھینچ کر تھکی ہوئی سی مسکراہٹ سے بوچاِل کی طرف دیکھا۔ بوچاِل کو ایک دم لگا کہ وہ دشمنوں کے نرغے میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

''راستے کا پتا ہے؟''

''دیکھا تو نہیں لیکن پتا ہے۔ سیدھا راستہ جاتا ہے، راستے میں دو بڑی آبادیاں آتی ہیں اور کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں۔ راستے میں مغل دستے بھی شاید نظر آئیں۔ پہلے میرا ارادہ رات کو سفر کرنے کا تھا لیکن پھر سوچا کہ تمھاری وجہ سے رات کا سفر محفوظ نہیں ہوگا۔'' بوچاِل ایک غیر دلچسپ سی ہنسی ہنسا، ''اور تم میری طاقت بھی ہو۔''

''دِن ہی بہتر رہیں گے۔ بیلوں کے لیے چارے کا کیا کریں گے؟''

اس دفعہ بوچہ‌ل کی ہنسی میں دل چسپی تھی۔ ''میں نے چنے خرید لیے ہوئے ہیں۔ راستے میں سبز چارہ لے لیا کریں گے اور کسی آبادی کے پاس رات گزاریں گے تاکہ ہمیں کھانا اور بیلوں کو پانی مل جائے۔''

''میرا تو خیال تھا کہ رات سرائے میں گزارا کریں گے۔''

''نہیں! سرایوں میں بھگوڑے، ڈاکو، شرابی اور جواری قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں۔ وہاں رات گزارنا مناسب نہیں۔''

اور یہ چھوٹا سا قافلہ پانچ دن اور پانچ راتیں چلتا رہا۔ کتے اپنی جگہ پر چلتے رہتے اور راتوں کو ایک جاگتا جب کہ دوسرا سوتا اور پھر وہ باری بدل لیتے۔

جب قافلہ بیاس پر پہنچا تو رات ہو چلی تھی؛ اُس وقت بوچہ‌ل نے دریا پار کرنے کا

سوچا تو ایک پریشانی میں گھر گیا۔ اُس نے بیل گاڑی پار کروانا تھی اور دیوی بھی۔ اُسی وقت اُس نے بیل گاڑی کو بیچنے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس نے سوچا کہ بیل گاڑی بیچنے کے بعد اُس کے پاس کہیں اور جانے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ وہ صرف محنت کرے گا اور محنت کے بل بوتے پر ہی کامیاب ہوگا۔

اُسی وقت اُسے رات کے جوان اندھیرے میں چھوٹا سا گھاٹ اور دریا میں ہلکورے لیتے ہوئے، کِلے کے ساتھ بندھی ایک کشتی نظر آئی!

مجاہد معمول کے مطابق اپنے دفتر گیا۔ اُس کا چپراسی اُسے آتے دیکھ کر پہلے حیران ہوا اور پھر متذبذب سا، ایک سکتے کی حالت میں بریف کیس لینے کے لیے بڑھا۔ مجاہد نے اُسے آتے ہوئے دیکھ کر، ہمیشہ کی طرح، مشفقانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ، بریف کیس اُس کو تھما دیا:

''شکریہ دوست!'' اُس نے تین سالوں سے دہرایا جانے والا فقرہ دہرایا۔ چپراسی نے کس مپرسی کی حالت میں ارد گرد دیکھا کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اِتنی دیر میں مجاہد دفتر میں داخل ہو چکا تھا۔ مجاہد نے ایک لمبی سانس کھینچ کر جو آہ بھی ہو سکتی تھی، ایک لمحے کے لیے رُک کر کمرے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چپراسی بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے بریف کیس مجاہد کی کرسی کے ساتھ پڑی میز پر رکھ کر کھولا اور مجاہد کی طرف دیکھا۔

''بھٹی کو بھیجو!'' چپراسی ابھی تک سکتے میں تھا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے مجاہد کی آنکھوں کی گہرائی میں پاگل پن کا عکس دیکھنے کے لیے جھانکا تو اُسے روز والا افسر ہی نظر آیا، وہ تیزی کے ساتھ بھٹی کو بلانے چلا گیا۔ وہ مجاہد کی زبان کی کاٹ سے اچھی طرح واقف تھا۔

بھٹی گلا صاف کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ دفتر میں داخل ہونے کی اُس کی یہ اجازت طلبی تھی۔ بھٹی کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح ایک پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ دفتر میں وہ بھٹی مکھن جانا جاتا تھا کیوں کہ وہ مکھن کی طرح نرم اور چکنا تھا اور ہمیشہ انگلیوں میں سے پھسل کر نکل جاتا تھا۔

''سر! آپ نے آج زحمت کیوں کی؟ گھر پر ہی آرام کرتے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ٹیلی فون پر حکم کافی تھا۔''

مجاہد نے فوری جواب نہیں دیا۔ اُس نے چپراسی کی طرح بھٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔ چپراسی جہاں مجاہد کی آنکھوں میں پاگل پن کا عکس دیکھنا چاہتا تھا، مجاہد کو بھٹی کی آنکھوں میں تمسخر نظر

مجاہد معمول کے مطابق اپنے دفتر گیا۔ اُس کا چپراسی اُسے آتے دیکھ کر پہلے حیران ہوا اور پھر متذبذب سا، ایک سکتے کی حالت میں بریف کیس لینے کے لیے بڑھا۔ مجاہد نے اُسے آتے ہوئے دیکھ کر، ہمیشہ کی طرح، مشفقانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ، بریف کیس اُس کو تھما دیا:

''شکریہ دوست!'' اُس نے تین سالوں سے دہرایا جانے والا فقرہ دہرایا۔ چپراسی نے کس مپرسی کی حالت میں اردگرد دیکھا کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اِتنی دیر میں مجاہد دفتر میں داخل ہو چکا تھا۔ مجاہد نے ایک لمبی سانس کھینچ کر جو آہ بھی ہو سکتی تھی، ایک لمحے کے لیے رُک کر کمرے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چپراسی بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے بریف کیس مجاہد کی کرسی کے ساتھ پڑی میز پر رکھ کر کھولا اور مجاہد کی طرف دیکھا۔

''بھٹی کو بھیجو!'' چپراسی ابھی تک سکتے میں تھا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے مجاہد کی آنکھوں کی گہرائی میں پاگل پن کا عکس دیکھنے کے لیے جھانکا تو اُسے روز والا افسر ہی نظر آیا، وہ تیزی کے ساتھ بھٹی کو بلانے چلا گیا۔ وہ مجاہد کی زبان کی کاٹ سے اچھی طرح واقف تھا۔

بھٹی گلا صاف کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ دفتر میں داخل ہونے کی اُس کی یہ اجازت طلبی تھی۔ بھٹی کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح ایک پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ دفتر میں وہ بھٹی مکھن جانا جاتا تھا کیوں کہ وہ مکھن کی طرح نرم اور چکنا تھا اور ہمیشہ انگلیوں میں سے پھسل کر نکل جاتا تھا۔

''سر! آپ نے آج زحمت کیوں کی؟ گھر پر ہی آرام کرتے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ٹیلی فون پر حکم کافی تھا۔''

مجاہد نے فوری جواب نہیں دیا۔ اُس نے چپراسی کی طرح بھٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔ چپراسی جہاں مجاہد کی آنکھوں میں پاگل پن کا عکس دیکھنا چاہتا تھا، مجاہد کو بھٹی کی آنکھوں میں تمسخر نظر

آیا۔ بھٹی نے نظر نیچے رکھی۔
''فائلیں ڈپٹی صاحب کو پہنچا دی گئی ہیں۔'' بھٹی اب سنجیدہ تھا۔ ''آج تک ہوا نہیں ہے کہ کوئی اپنے آخری دن بھی دفتر آیا ہو۔''
''ہر نئے کام کا آغاز ہونا ہوتا ہے، سمجھو کہ وہ مجھ سے ہوا۔ مجھے آج کی تنخواہ تو ملنی ہے، اِس لیے کام کیوں نہ کروں۔''

بھٹی شکست خوردہ سا کمرے سے نکل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد فائلیں میز کے مخصوص کونے میں رکھ کر چلا گیا۔ مجاہد نے پڑھنے والا چشمہ اپنی ناک پر ٹکایا اور فائلوں کے انبار پر ایسے ٹوٹ پڑا جیسے رات کا بھوکا صبح ناشتے پر۔ اُسے ہمیشہ کی طرح وقت کا احساس ہی نہ رہا؛ اُس کی آنکھیں، انگلیاں اور قلم تیزی کے ساتھ کاغذوں کی سطح پر کبھی چلتے اور کبھی عارضی سے قیام کے بعد پھر چل پڑتے۔ پچھلے پینتیس برسوں سے مجاہد یہ سب مستعدی سے کرتا آیا تھا اور آج بھی وہ اُتنا ہی سرگرم تھا جتنا کہ پہلے دن۔ وہ ہمیشہ یہی سوچا کرتا تھا کہ زندگی بے مقصد گزار دینا جینا نہیں ہے، ایسی زندگی تو خچر کی زندگی کی طرح ہے جو جوان ہونے سے اپنی آخری سانس تک بار برداری کیے جاتا ہے اور اُسے وجود دینے والے اُس کے اپنے نہیں اور نہ ہی وہ خود کسی کو وجود دے سکتا ہے۔ اُس کی بیوی شروع کے سالوں میں پوچھا کرتی تھی: ''مجاہد! یہ بھی کوئی زندگی ہے؟'' یہ سوال تیر کی طرح اُس کے جسم کو چیر جاتا، وہ کوشش کرتا کہ بدن کو چیرے جانے کا درد اُس کے چہرے پر نہ آئے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اُس کی بیوی ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ کیا وہ خچر کے المیے سے واقف تھی؟ وہ تو شہر کی رہنے والی تھی اور اُس نے خچر ریڑھوں میں جُتے دیکھے ضرور تھے اور بس! وہ تو اتنا ہی جانتی تھی کہ خچر ریڑھے کھینچتے ہیں اور وہ پیدا کیسے ہوتے ہیں اُس کی دل چسپی کے دائرہء کار میں نہیں تھا۔ یہ تو وہ ہی تھا جو ہر بارش کے بعد اپنے مشرق والے چوبارے پر جا کر مدن چک والی چھمب کو دیکھا کرتا۔ بارش کے بعد فضا دھلی ہوتی اور مدن چک اتنا قریب لگتا کہ ایک سراب محسوس ہوتا۔ پُر اچل رہا ہوتا اور چھمب میں کھڑے پانی کی چھوٹی چھوٹی لہریں بن اور ٹوٹ رہی ہوتیں۔ اُس وقت مدن چک کے بھڑو بھی اتنے نزدیک نظر آ رہے ہوتے جتنا مدن چک۔ وہ ہمیشہ سوچتا کہ کسی دن مدن چک جا کر چھمب کو دیکھے گا اور بھڑو پر کھڑے ہو کر اپنے گاؤں کا نظارہ کرے گا۔ چھمب اُس کے لیے ایک خواب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اجازت لے کر جانا چاہے تو اُسے جانے نہیں دیا جائے

گا چناں چہ وہ یہی فیصلہ کرتا کہ اگلی بارش کے بعد جنوب مشرق کی طرف چلتا ہوا وہاں پہنچ جائے گا۔ یہ ہر سال ہوتا۔ پھر جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ مدن چک کے چھمب تک اکیلا جا سکے تو وہاں جا کر ایک گہرے صدمے سے دو چار ہوا۔ چھمب کسی کو الاٹ ہو چکا تھا اور زمین کے مالک نے مشینوں کے ذریعے زمین کو ہموار کر کے وہاں فصل کاشت کی ہوئی تھی۔ وہ دل شکستہ سا بیری پر چڑھا تو اُسے نہ اپنا گاؤں نظر آیا اور نہ ہی مشرق کی سمت والا چوبارہ۔ اُس نے سوچا کہ کیا چھمب کا کبھی وجود تھا یا یہ ایک اتنا ٹھوس وہم تھا کہ اُسے یقین لگا کرتا تھا۔ اُسے موجودہ چھمب ایک خچر لگا جسے مشینوں نے زرعی رقبے کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

اُس نے وقت دیکھا تو بارہ بج چکے تھے اور معمول کے مطابق بھٹی کے فائلیں اُٹھانے کا وقت تھا۔ ہمیشہ کی طرح بھٹی کے ساتھ سٹینو گرافر آیا جسے مجاہد نے چند خطوط لکھائے اور بھٹی کو زبانی ہدایات دیں۔ اُسی وقت مجاہد کا اسسٹنٹ بھی وہاں پہنچ گیا۔

''حسیب صاحب! میں نے آج کا کام ختم کر دیا ہے۔ بھٹی صاحب آپ کو ڈرافٹ دکھا دے گا۔ آپ اگر اتفاق کریں تو دستخط کر دیں ورنہ اپنا جواب خود بنا لیں۔''

حسیب بھی چپراسی اور بھٹی کی طرح بے یقینی سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے چہرے پر احترام کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خاموشی کے ساتھ کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔

''میں آپ کے جوابوں سے اتفاق کیوں نہیں کروں گا؟ اگر آپ کچھ دیر ٹھہر سکیں تو خود ہی دستخط کرتے جائیں۔'' حسیب نے ٹھہر ٹھہر کر بات کی۔ مجاہد نے خاموش رہتے ہوئے اُس کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ حسیب نے کبھی مجاہد کی رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کیا تھا؛ وہ تو مجاہد کو ایک معمول پرست سمجھتا تھا اور اُسے معمولات پسند نہیں تھے۔ حسیب کہا کرتا تھا کہ اگر اُس کا بس چلے تو وہ دفتر میں کام کرنے والوں کو شب خوابی کے لباس میں آنے کا کہا کرے؛ اُسے نتائج سے غرض تھی نہ کہ بغیر شکن کے لباس سے۔

''میں ٹھہروں گا نہیں۔ دو بجے تک گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔''

مجاہد نے بریف کیس میں چیزیں واپس رکھیں اور اُٹھ کھڑا ہو۔ حسیب نے بھی اُس کی تقلید کی۔

''سر! آپ نے آج روز کی طرح کام کر کے میرے کئی سوالوں کے جواب دے دیے ہیں۔''

مجاہد نے ایک لمحے کے لیے اُسے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ مجاہد ہاتھ ملانے کو روایت کا ایک اہم حصہ سمجھنے لگا تھا۔ وہ ابھی لڑکپن کی منزل میں تھا کہ اُس کے باپ کا ایک دوست کسی دوسرے شہر سے اُن کے گھر آیا۔ مجاہد کے باپ نے تھوڑی تاخیر کے بعد گھر آنا تھا اور اُس کی ہدایات تھیں کہ مجاہد مہمان کو خوش آمدید کہے گا۔ مجاہد ایک شرمیلا سا لڑکا تھا اور وہ مہمان کے ساتھ ملاقات سے گریزاں تھا لیکن اُس کے پاس بچ نکلنے کی کوئی راہ بھی نہیں تھی۔ مہمان جب گھر میں آیا تو باپ کی ہدایت کے مطابق مجاہد تھڑے پر اُس کی پذیرائی کے لیے گیا اور جھجکتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ مہمان نے اُس کے ہاتھ کی ڈھیلی گرفت کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ کر پوچھا:

''تمہارے ہاتھ کو کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' مجاہد بات کو نہ سمجھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش میں آنکھیں جھپکتے ہوئے کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

''مصافحہ آدمی کی شخصیت کی طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمیشہ گرم جوشی سے ہاتھ ملاؤ۔ اور ڈھیلے ہاتھ مصافحہ کرنے والا آدمی کم زور، مکار اور بزدل ہوتا ہے۔''

مجاہد یہ بات سُن کر کانپ سا گیا۔ اُس نے نظر جھکا کر اثبات میں سر ہلایا، اُس کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ آیا ہوا تھا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے ساتھ عہد کیا کہ ہمیشہ گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرے گا۔

وہ دفتر سے باہر نکلا تو حسیب اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں برآمدے میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے، دونوں تھوڑا سا جھجکے کیوں کہ جانتے تھے کہ وہ اُن کی آخری ملاقات تھی۔ مجاہد نے ڈھیلا سا ہاتھ آگے بڑھایا اور کم زور سا مصافحہ کر کے کار پارک کی طرف چل پڑا۔

اُس نے رُک کر پیچھے مُڑ کر دیکھا، حسیب اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ حسیب کے چہرے پر اُسے پریشانی نظر آئی۔ وہ کیوں پریشان تھا؟ کیا اُسے مجاہد کے چلے جانے کی پریشانی تھی؟ یا کیا وہ مجاہد کو اتنے سال غلط سمجھتا رہا جب کہ وہ تو ایک اچھا آدمی تھا اور یا پھر وہ آج اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا؟

''مجھے آج ڈرائیور کی ضرورت ہوگی۔ وہ کار میرے گھر پہنچا دے، میں نے کہیں کام جانا ہے۔'' حسیب کے چہرے پر حیرت پڑھی جا سکتی تھی، مجاہد نے کبھی ذاتی کام نہیں کہے تھے۔

''کیوں نہیں!''

مجاہد جواب کا انتظار کیے بغیر کار پارک کی طرف چل پڑا اور کار کے پاس پہنچ کر اُس نے اپنے ڈرائیور کو سر کے اشارے سے بلایا۔

''تم کار گھر لے جاؤ، میں خود ہی آ جاؤں گا۔''

بوڑھے ڈرائیور نے مجاہد کو غور سے دیکھا۔ اُس کے ہونٹ کسی سوچ کی وجہ سے بھینچے ہوئے تھے۔

''صاحب جی!''

مجاہد نے اُس کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور نے تھوک نگلا اور پھر اپنے آپ کو مجتمع کر کے مجاہد کو اپنی نظر کی جکڑ میں لیا۔

''میں جلد ہی ریٹائر ہونے والا ہوں،'' مجاہد ایک دم بیزار سا ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ ڈرائیور اُسے اپنے ریٹائر ہونے کے بعد ملازمت کے لیے کہے گا۔ ''مجھے تیس سال ہو گئے ہیں افسروں کی خدمت کرتے ہوئے لیکن پہلی مرتبہ ہے کہ کسی کو آخری دن بھی ایسے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' مجاہد نے تشکر آمیز نظر سے ڈرائیور کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ وہ ایک سنجیدہ آدمی ہے۔ مجاہد مزید تعریف سننا نہیں چاہتا تھا، اُس نے سر کے اشارے سے ڈرائیور کی بات کو تسلیم کیا اور دفتر کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اُس کا گھر سات کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور اُس نے پیدل جانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ وہ کئی سالوں سے دفتر پہنچنے کی جلدی میں ہوتا تھا اور اِسی طرح واپسی پر گھر پہنچنے کی۔ آج وہ اپنے وقت کا خود مالک تھا۔ سردیوں کی سہ پہر خوش گواری خنکی میں لپٹی ہوئی تھی اور مجاہد نے پرانے ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے ہیروؤں کی طرح ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے کوٹ کو کندھے پر لٹکا لیا۔ وہ اُس راستے پر ہو لیا جہاں سے روز گزرا کرتا تھا۔ یہ راستہ اُس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن بالکل نیا لگ رہا تھا۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا عمارتوں کو دیکھا کرتا تھا، اُسے سڑک پر رینگتے ہوئے ٹریفک سے کبھی دل چسپی نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ تو ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے نفرت بھری دلچسپی کے ساتھ اپنے اردگرد دیکھا کرتا تھا۔ اُسے راستہ کاٹتے ہوئے موٹر سائیکل، ہارن بجاتی ہوئی کاریں اور دھواں چھوڑتی ہوئی بسیں ایک عذاب لگا کرتی تھیں، وہ ہر روز اُس نظام کو کوستا جس نے اِن

سواریوں کو سڑکوں پر پھینک دیا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ خود بھی اُسی نظام کا حصہ بھی ہے۔ آج وہ سرکس میں کرتب دکھاتے ہوئے موٹر سائیکلوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُسے موٹر سائیکل سوار کوئی اجنبی مخلوق لگی..... اتنی دلیر اور اتنی ماہر..... اُس کا اپنا جی بھی موٹر سائیکل چلانے کو کرنے لگا۔ اُسے موٹر سائیکل چلانا آتا تھا۔ اُس کے لیے یہ اقرار کرنا کہ وہ ایک ماہر سوار ہوا کرتا تھا کسی بھی طرح مبالغہ نہیں تھا۔ موٹر سائیکل سردیوں کے پرندوں کی ڈاروں کی طرح ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے اور ہر چوک پر کھڑے ہو کر وہ اُنھیں دیکھتا۔ کاروں کے ہارن چڑھے ہوئے شیشوں کے باوجود کار کے اندر سمع خراشی کا سبب ہوا کرتے تھے، آج اُسے ایک بے ترتیب سی ترتیب میں بکھرے ہوئے دل چسپ لگ رہے تھے۔ دھواں چھوڑتی بسوں میں وہ اپنے کالج اور یونیورسٹی جایا کرتا تھا۔ تب دو منزلہ بسیں بھی چلا کرتی تھیں اور وہ کبھی کبھار ایک ٹرمینس سے دوسرے تک دومنزلہ بس کی اوپر والی منزل کی سب سے پہلی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرتے وقت محسوس کرتا کہ وہ ہی بس کو چلا رہا ہے اور یا اگر ڈرائیور نے بریک لگائی تو نیچے گر جائے گا۔ پھر اُس نے کار میں سفر کرنا شروع کر دیا اور دھواں چھوڑتی بسیں اُسے ایک آفت سے کم نہیں لگا کرتی تھیں۔ آج انہیں بسوں کو دیکھ کر وہ ایک طرح ناسٹیلجیا میں گم ہو گیا اور اُس کا دل بس کی سواری کرنے کو کر آیا لیکن اُسے اب بسوں کے روٹس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اُسے بہت عرصہ پہلے، شاید کسی اور جنم میں پڑھا ہوا، بلونت سنگھ کا ایک افسانہ یاد آ گیا جس کا عنوان بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اُس افسانے میں ایک طالبِ علم سکول جانے کے بجائے نہر کے کنارے چلتے چلتے، کئی مناظر دیکھتے اتنا دور نکل جاتا کہ شام گئے لوٹتا۔ آج مجاہد اپنے آپ کو اُس لڑکے کی طرح محسوس کر رہا تھا جہاں اُس کے لیے ہر چیز نئی تھی۔

وہ جب گھر پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ سات کلومیٹر پیدل چلنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کار پورچ میں کھڑی تھی اور اُس کی بیوی پورچ کی آخری سیڑھی پر انتظار میں بیٹھی تھی۔ مجاہد نے دیکھا کہ وہ نیا لباس پہنے ہوئے تھی اور ہلکا سا میک اَپ اُس کی خوب صورتی کو ایک وقار دے رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ خوشی اور اپنایت کے ساتھ مسکرائی۔ اُن کی شادی کو تیس برس ہو گئے تھے اور مجاہد کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اُس نے کبھی اتنی محبت، اپنایت اور وابستگی کے ساتھ اُسے خوش آمدید کہا ہو۔ وہ اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجاہد نے دیکھا کہ مسکراتی ہوئی بیوی کی آنکھوں میں نمی سی بھی تھی جو اُس خوشی کو ایک اُداسی دے رہی تھی۔

"خوش آمدید....." اُس نے مجاہد کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔
مجاہد اُس کے ہاتھ تھامے اُسے دیکھتا رہا، وہ مسکرائے جا رہی تھی۔
"آج ایک اہم دن ہے۔" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بات جاری رکھی، "ہماری زندگی کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔" مجاہد نے بھی جواب میں اثباتی قہقہہ لگایا۔
"ہاں!" مجاہد نے جواب دیا، "پہلے ہم بغیر مقصد کے زندہ تھے اور آج کے بعد ہم....."
"آج کے بعد ہم....." اُس کی بیوی نے بات کاٹ کر دہرایا۔ اُس کی آواز میں اُداسی کا بھاری پن تھا۔
"آج کے بعد ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔" مجاہد نے شوخی کے ساتھ کہا۔ اُسے اپنی آواز میں ایک مصنوعی پن لگا اور اُس نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ نظر جھکا لی۔ "اور وہی کریں گے جو ہمیں کرنا ہوگا۔" اُس نے نظر اُٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا، وہ ایک سیڑھی کی بلندی سے کہیں دور دیکھ رہی تھی۔ "اور نزہت....." اپنا نام سن کر نزہت نے قدرے چونک کر مجاہد کی طرف دیکھا، "ہم نے ایک دوسرے کا سہارا بننا ہے۔" مجاہد کی آواز میں ایک طرح سے شکست، درخواست اور مصالحتی رنگ تھا۔ اُسے اپنی بغلوں میں ندامت سے پسینہ محسوس ہونے لگا۔ کیا اِس پسینے کی وجہ اُس کا پیدل چلنا تو نہیں تھا؟ اگر پسینہ پیدل چلنے کی وجہ سے تھا تو اُسے کافی پہلے محسوس ہو جانا چاہیے تھا۔
"ہمیں اِس طرح کے کمزور لمحوں میں ایک دوسرے کی طاقت بننا چاہیے۔" نزہت نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ مجاہد کو محسوس ہوا کہ نزہت کے لہجے میں انگریزی کی کمی تھی۔ مجاہد نے جواب دینے سے پہلے اپنے آپ کو مجتمع کیا، وہ اپنی آواز اور لہجے کو اپنی سوچ اور کم اعتمادی سے الگ رکھنا چاہتا تھا:
"اِس کے علاوہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا چاہیے۔"
نزہت نے ایک لمبی سانس لے کر مجاہد کی طرف ایسے دیکھا کہ اُسے دیکھتے ہوئے دیکھ نہیں رہی تھی۔
"یہ کیا معاملات لے بیٹھے ہیں۔ میں نے آج چائے کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ ریٹائرمنٹ پارٹی!" مجاہد نے نزہت کی آواز میں خالی پن ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ

ہوا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے نزہت کی طرف دیکھا تو اُس نے مجاہد کے آگے بڑھنے کے لیے راستہ چھوڑا۔

مجاہد سیٹی پر دھن بجاتے ہوئے غسل خانے کی طرف چلا گیا اور نزہت باورچی خانہ میں۔ مجاہد کے لیے بغیر میٹھے کے کوفی، نزہت کے لیے چائے، چکن سینڈوچ اور چوکلیٹ کیک ٹرولی پر رکھے ہوئے تھے۔ نزہت نے مجاہد کو چھری تھمائی:

''ایک دور کی تکمیل کی خوشی میں.....'' نزہت نے کہا۔

''اگلے دور کے آغاز کے لیے نیک تمنائیں.....!'' مجاہد نے کیک کاٹ کر ٹکڑا نزہت کے ہونٹوں کے ساتھ لگایا:

''ہونٹوں سے نہیں دو گے؟'' نزہت کی آواز میں شوخی کی کپکپی تھی۔ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''اُسے بھولا نہیں جا سکتا!'' نزہت نے شرماتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو پان شیئر کرنے کو کہا تھا اور تم نے میرا ہونٹ کاٹ کے رکھ دیا!''

مجاہد پیار سے دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا، ''میں حیران ہو رہا تھا کہ پان اتنا نرم ہو سکتا ہے؟ میں نے جلدی سے پان کے دو حصے کرنے کی کوشش کی کہ تم ارادہ نہ بدل ڈالو اور تم چیخ پڑیں۔''

مجاہد نے ایک ٹکڑا اپنے ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے کہا:

''تم میرے ہونٹ زخمی کر دو!''

نزہت نے تیزی کے ساتھ مجاہد کے ہونٹوں میں سے آدھا ٹکڑا اپنے ہونٹوں سے اُچک لیا اور تھوڑا پرے ہٹ کر کھاتے ہوئے ہنسنے لگی۔ مجاہد نے پرچ میں ایک سینڈوچ رکھا اور صوفے پر بیٹھ کر کھانے لگا۔

''دن کیسا گزرا؟''

''شروع میں لوگوں کو میرا آنا اور کام کرنا پسند نہیں آیا۔ وہ تو مجھے فارغ کر چکے تھے اور اُن کی حیرانی دیکھنے والی تھی۔ لیکن پھر ملازمت کا آخری دن بھی معمول کا دن بن گیا۔''

نزہت بھی سینڈوچ لے کر سامنے بیٹھ گئی۔

پہلا حصہ

مجاہد کو اپنی زندگی کے ادھورے پن سے خوف آتا تھا۔ وہ ابھی پرائمری سکول میں تھا کہ اُس کی ماں فوت ہوگئی۔ ماں کا فوت ہونا شروع میں عجیب سا لگا تھا لیکن پھر اُسے اپنے اکیلے کا احساس ہونے لگا۔ وہ نہ صرف اپنے گھر بلکہ پورے گاؤں میں اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ ہم جماعت اور دوست جن کے ساتھ مل کر بوڑھے درختوں کی کھوڑوں میں توتوں کے انڈے ڈھونڈا کرتا تھا ایک دم اُسے اجنبی اور غیر اہم لگنے لگے۔ اُس نے اُن تمام سے ملنا چھوڑ دیا۔ وہ اب اکیلا ہی گھومتا، اُسے کسی کھیل میں کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔

''مجاہد بیٹا!'' ایک دن اُس کے باپ نے اُسے بلا کر اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کا حقہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کے نے کو پکڑ کر سرے کو انگلیوں سے سہلانا شروع کر دیا۔ مجاہد لاتعلق سا بیٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہیں جانا تو نہیں تھا پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ باپ اپنی بات جلد ختم کر دے۔

''تم اپنے دوستوں سے کیوں دور ہو گئے ہو؟'' اُس کے باپ کو مجاہد کی دل چسپیوں سے کبھی کوئی غرض نہیں رہی تھی اِسی لیے اُسے یہ سوال عجیب سا لگا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا باپ کو دیکھتا رہا۔ اُسے اب کچھ دیر پہلے والی بے چینی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

''بیٹا! اکیلا انسان تو ناکامی کی نشانی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم ناکام زندگی گزارو۔'' مجاہد کو اپنے باپ کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔ تھوڑا عرصہ پہلے تک تو اُس کا باپ اُسے دوستوں کے ساتھ مل کر کھیلنے سے منع کیا کرتا تھا اور آج وہ دوستوں سے دور ہو جانے کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ کیا اُسے نہیں پتا کہ وہ اکیلا کیوں ہو گیا تھا؟

''بیٹا!'' اُس کے باپ نے گلا صاف کیا تھا اور گلا صاف کرنے میں ایک ہچکچاہٹ سی بھی تھی، ''دیکھو تمھاری ماں جاتے ہوئے مجھے بھی تو اکیلا کر گئی تھی۔'' مجاہد کو حیرت ہوئی تھی۔ وہ

زندگی کے ادھورے پن سے خوف آتا تھا۔ وہ ابھی پرائمری سکول میں تھا کہ
ں۔ ماں کا فوت ہونا شروع میں عجیب سا لگا تھا لیکن پھر اُسے اپنے اکیلے کا
نہ صرف اپنے گھر بلکہ پورے گاؤں میں اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ ہم جماعت اور
ں کر بوڑھے درختوں کی کھوؤں میں توتوں کے انڈے ڈھونڈا کرتا تھا ایک دم
لگنے لگے۔ اُس نے اُن تمام سے ملنا چھوڑ دیا۔ وہ اب اکیلا ہی گھومتا، اُسے
چسپی نہیں رہی تھی۔

!'' ایک دن اُس کے باپ نے اُسے بلا کر اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
ا ہوا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کے نے کو پکڑ کر سرے کو انگلیوں سے سہلاتا
ق سا بیٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہیں جانا تو نہیں تھا پھر
ے اپنی بات جلد ختم کر دے۔

دوستوں سے کیوں دور ہو گئے ہو؟'' اُس کے باپ کو مجاہد کی دل چسپیوں
رہی تھی اِسی لیے اُسے یہ سوال عجیب سا لگا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا باپ کو دیکھتا
پہلے والی بے چینی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کی بات کے ختم ہونے کا انتظار

کیسے اکیلا رہ گیا تھا؟ اُس کے دن پہلے کی طرح گزر رہے تھے؛ وہ اُسی طرح رات کو اپنے کام سے واپس گھر آتا، دوستوں کے ساتھ مل کر باتیں کرتا، پہلے کی طرح قہقہے بھی سنائی دیتے۔ نہیں، وہ ہرگز اکیلا نہیں رہ گیا تھا۔ صرف ماں اُس کی زندگی میں نہیں تھی، باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

''تمھاری ماں اور میں نے ایک لمبا سفر اکٹھے طے کرنا تھا لیکن وہ مجھے راستے میں ہی چھوڑ گئی۔ اِس میں اُس کا بھی قصور نہیں، بس لکھا ہی ایسے تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کسی کو ایسے لکھنے دیتا؟ کبھی نہیں!'' اُس نے ایک لمبی سانس لے کر مجاہد کی طرف دیکھا تھا۔ مجاہد اب اُس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش میں اُس کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ دونوں کی نظر ملی۔ مجاہد کے باپ کو اپنے بیٹے کے دیکھنے میں ایک پراسراری طاقت نظر آئی تھی۔ اُسے لگا کہ مجاہد اُس کی سوچ پڑھ رہا ہے، اُس نے گھبرا کر نظر نیچے کر لی تھی۔

''تم ابھی بچے ہو۔ جلد زندگی کے معاملات کو بڑوں کی طرح سمجھنے لگو گے۔ اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم سے دوست چھٹ گئے کیوں کہ تم اکیلے رہ گئے ہو۔ میں تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں اور اپنے اکیلے رہ جانے کو اور نظر سے دیکھتا ہوں۔ تم نے اپنے اکیلے رہ جانے کو اور اکیلے ہونے میں چھپایا اور میں نے پہلے کی طرح زندگی گزارنے میں۔ اب ہمیں اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اِس دفعہ مجاہد نے باپ کی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ نظر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھتے ہوئے باپ کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا: اُنھیں اپنے آپ کو کیسے تبدیل کرنا ہے؟ کیا وہ ماں کو بھول جائیں؟ کیا یہ ممکن ہوگا؟ ماں تو نہ ہونے کے باوجود گھر کے ہر کونے میں موجود ہے۔ وہ تو اُس تصویر کی طرح تھی جس کی ہر تفصیل ہمیشہ ویسے ہی رہتی ہے!

''ہمیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔'' اُس کے باپ نے دہرایا تھا۔ مجاہد کو اِس بیان نما سوال سے ایک طرح ترغیب ملی تھی، اُس نے تجسس بھرے حوصلے کے ساتھ باپ سے پوچھا تھا:

''کیسی تبدیلی؟''

باپ نے غور سے مجاہد کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اُسے مجاہد کے چہرے پر معصوم سے تجسس نے مہمیز دی تھی۔

''دیکھو بچہ!'' اُس نے مٹھاس بھرے پیار سے کہا تھا: ''گھر میں ایک عورت کا ہونا

ضروری ہے جو ہم دونوں کی ایسے ذمے دار ہو جیسے تمھاری ماں ہوا کرتی تھی۔" مجاہد کو یہ بات کسی حد تک درست لگی تھی۔ گھر میں مستقل کام کرنے والی کوئی عورت نہیں تھی اور اُسے سکول کے لیے تیار ہوتے ہوئے اپنا سامان ڈھونڈنے میں ہمیشہ دقت ہوتی، اُس کا باپ بھی گھر سے نکلتے وقت جھنجلایا ہوا سا پھرا کرتا تھا۔ اُسے حیرانی بھی ہوئی تھی کہ کوئی عورت اُس کی ماں کی جگہ کیسے لے سکتی تھی؟ وہ یہ پوچھنا بھی چاہتا تھا لیکن اپنی ہی سوچ کے وزن نے اُسے بولنے نہ دیا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تمھارے لیے نئی ماں اور اپنے لیے نئی بیوی لے آؤں۔" باپ تیزی کے ساتھ یہ کہہ کر مجاہد کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ مجاہد کو باپ کے اِس فیصلے کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اُسے کچھ عجیب سا لگا کہ نئی ماں بھی ہو سکتی ہے؟ اُس نے سُن رکھا تھا کہ نئی ماں آ کر گھر پر قبضہ کر کے باقی لوگوں کو نکال باہر کرتی ہے۔ کیا اُس کی نئی ماں بھی ایسے ہی کرے گی؟

"تو پھر میں کہاں رہوں گا؟" مجاہد نے معصومیت بھری بے ساختگی سے پوچھا تھا۔ مجاہد کے اِس سوال سے باپ کے اندر ایک آری چل گئی تھی، وہ اس مخفی درد سے تلملا اُٹھا تھا۔

"تم اِس گھر کے مالک ہو۔ یہاں کے علاوہ اور کہاں رہو گے! بیٹا! تم تسلی رکھو، میں تمھارا باپ ہوں۔ تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔" باپ کی آواز میں پیار میں ڈوبی ہوئی تکلیف تھی۔ مجاہد بھی اِس آواز کی لہر میں ڈوب گیا تھا۔ اُسے لگا کہ اُس کے لیے یہ گھر ہی دنیا کا آخری ٹکڑا تھا۔ اُس نے نظر بھر کر اپنے باپ کی طرف دیکھا تھا اور باپ کی نظر میں اُمید بھری توقع تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو باپ نے نظر جھکا لی۔

"کب تک آئے گی نئی..... نئی ماں؟" مجاہد نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔ اب اُس کی جھجک میں ایک تجسس بھی تھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اُسے نئی ماں کی باپ سے زیادہ ضرورت تھی۔ اُسے اچانک اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا تھا اور وہ یک دم رونے لگا تھا۔ باپ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے ساتھ لگا لیا تھا، اُس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"جلدی آ جائے گی۔ وہ تمھارے لیے ایک تحفہ بھی لائے گی۔" باپ نے اُس کے کان میں کہا تھا۔ مجاہد فوری طور پر باپ سے الگ ہو گیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ تحفہ کیا ہو گا؟" مجاہد نے شوق سے پوچھا تھا۔

"ہاں!" باپ نے دبی دبی ہنسی میں جواب دیا تھا۔

''کیا؟'' مجاہد کی آواز میں بے چینی تھی۔

''تم سے دو سال چھوٹی بہن۔''

مجاہد نے خوشی کے ساتھ ایک کپکپی لی۔ اُسے اچانک اپنی تنہائی ختم ہوتے محسوس ہوئی۔ وہ ماں سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اُسے چھوٹی بہن یا بھائی چاہیے اور وہ ہر دفعہ ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی۔ اب نئی ماں اُس کے لیے چھوٹی بہن لا رہی تھی۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر باہر جانے کے لیے اُٹھا تو اُس کے باپ نے اُسے روک دیا تھا:

''نئی ماں کی بات ابھی کسی سے نہ کرنا۔''

مجاہد نے حیرت اور کسی حد تک ناگواری کے ساتھ باپ کی طرف دیکھا تھا۔ باپ اُس کے تاثر سے تھوڑا سا خائف اور قدرے خوش بھی ہوا، اُسے لگا کہ مجاہد اِس مختصر سی ملاقات میں بچے سے آدمی بن گیا تھا اور اُس کی یہ خواہش بھی تھی!

فاطمہ نے گھر میں آتے ہی سب کے دل موہ لیے۔ وہ ایک ہنس مکھ اور پیار کرنے والی عورت تھی۔ مجاہد نے محسوس کیا کہ وہ گھر میں ہر اُس جگہ موجود ہوتی تھی جہاں اُس کی ضرورت ہو۔ وہ صبح غسل کے لیے اُسے غسل خانے میں بھیج کر اُس کا ناشتہ تیار کرنے لگتی اور جب وہ نہا کر نکلتا تو اُسے آواز دیتی:

''کام چور! ادھر آؤ!'' مجاہد ہنستا ہوا اُس کے پاس چلا جاتا۔ مجاہد کی کوشش ہوتی تھی کہ کنگھا کیے بغیر سکول چلا جائے۔ جب وہ نئی نئی آئی تھی تو مجاہد بغیر کنگھا کیے سکول چلا جاتا تھا۔ ایک دن جب وہ سکول سے آیا تو فاطمہ نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا تھا: اِس طرح سکول جانا اچھی بات نہیں۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ مجاہد کی ماں کیسی عورت ہے کہ اپنے بیٹے کو بال بنائے بنا ہی سکول بھیج دیتی ہے۔

''اپنا سر آگے کرو۔'' وہ ہنستے ہوئے حکم دیتی تھی۔ مجاہد کو اپنے بالوں میں کنگھا ایسے محسوس ہوتا کہ آری چل رہی ہے۔

''آہستہ!'' وہ کسمساتے ہوئے التجا کرتا تھا۔

''اگر تم سر پیچھے نہ کھینچو تو تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ سب لڑکے بال بنائے بنا ہی آتے ہیں اور ایک میں ہوں کہ تم مجھے باؤ بنا کے بھیجتی ہو۔''

''تم چودھری عبدالرشید کے بیٹے ہو۔ تم اور دوسرے لوگوں میں یہی فرق ہے۔ اُنھوں نے اتنا ہی پڑھنا ہے اور تم نے تو ابھی اپنی پڑھائی شروع بھی نہیں کی۔ صاف لباس، بنے ہوئے بال اور پیٹ میں ناشتہ بھر کر سکول جایا کرو۔''

وہ جب سکول سے آتا تو فاطمہ اُس کے انتظار میں بیٹھی ہوتی۔ مجاہد سیدھا دالان میں جاتا اور بستہ رکھ کر کھانے کے لیے ہاتھ ملتا ہوا فاطمہ کی طرف بڑھتا تو وہ ہنستے ہوئے اُسے روک دیتی:

''پہلے ہاتھ دھو کر آؤ ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔'' یہ روزانہ کا معمول تھا اور مجاہد کو اس معمول کو جاری رکھنے میں ایک عجیب سا لطف آتا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر اُس کے پاس بیٹھ کر کھانے لگتا:

''آج دھوبیوں کے بیٹے کی کل کی طرح پٹائی ہوئی تھی؟'' وہ بات شروع کرتی تھی۔

''نہیں!'' وہ ہنس کر جواب دیتا'' وہ آج سبق یاد کر کے آیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا بھولا تھا۔ بچوں کا خیال تھا کہ میرے کان مروڑے جائیں گے۔ ماسٹر نے شاید ابا کے ڈر سے نہیں کھینچے۔''

اور اِسی طرح وہ سکول کی باتیں پوچھتے ہوئے اُسے کھانا کھاتے دیکھتی رہتی۔ مجاہد ایک نئی زندگی سے متعارف ہو رہا تھا، ایسی زندگی سے جس میں محبت کے ساتھ ساتھ کبھی ایک کھچاؤ بھی رہتا۔ فاطمہ، چودھری عبدالرشید کا بھی اُسی طرح خیال رکھتی۔ چودھری کبھی فاطمہ کی کسی کوتاہی پر سخت لہجے میں کہتا،''مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر میں نے غلطی کی ہے تو.....'' فاطمہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیتی:

''میں اپنی لیریں سنبھال کر چلی جاتی ہوں لیکن یاد رکھنا مجاہد بھی میرے ساتھ جائے گا۔'' فاطمہ کے لہجے میں اعتماد ہوتا جو چودھری کو پسپائی پر مجبور کر دیتا۔ ایسے موقعوں پر فاطمہ کو مجاہد کی خاموش تائید حاصل ہوتی۔ ایسا واقعہ تو چند منٹوں میں گزر جاتا لیکن مجاہد کئی دن اِس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اُسے پریشانی رہتی کہ اُس کا باپ ایسی بات کیوں کہتا ہے جو فاطمہ کی تضحیک کا سبب بنتی ہے؟ فاطمہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کیسے ہے؟ وہ یہ جاننا چاہتا تھا لیکن کس سے پوچھے؟ فاطمہ کے بارے میں فاطمہ سے پوچھنا مناسب نہیں تھا اور گھر میں کوئی ایسا تھا نہیں جس سے پوچھا جا سکے۔ فاطمہ کے آنے سے پہلے کئی عورتیں گھر میں آکر مختلف کام کر جاتیں تھیں لیکن فاطمہ نے آنے کے دو دن کے اندر گھر کا سارا انظام سنبھال لیا۔ ابا کے کپڑے دو حصوں میں رکھے۔ ایک جگہ تہہ بند اور کرتے جو وہ گاؤں میں پہنتا اور دوسری جگہ ہینگروں کی قطار میں لٹکتے ہوئے شلوار کرتے یا قمیصیں اور تین ویسٹ کوٹ جو بیاہ شادیوں، ملاقاتوں یا شہر جاتے ہوئے زیب تن کرتا۔ اُس نے جب بھی کوئی لباس پہننا ہوتا اُسے تیار ملتا اور اِسی طرح کھُسے، مکیسن، کھیڑیاں اور سینڈل بھی تیار ہوتے۔

گھر میں دو غسل خانے تھے۔ ایک جسے صرف اُس کا باپ استعمال کرتا اور دوسرا وہ جسے فاطمہ، مجاہد اور فاطمہ کی بیٹی گڈو استعمال کرتے۔ ایک شام مجاہد دوستوں کے ساتھ کھیل کر آیا تو اُس نے فاطمہ کے سامنے جانے سے پہلے سوچا کہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لے ورنہ فاطمہ نے سامنے

کھڑے ہو کر دھلوانا تھا۔ وہ جب غسل خانے کے پاس گیا تو اُسے اندر سے سرگوشیاں سی سنائی دیں۔ وہ وہیں رُک گیا۔ فاطمہ کہہ رہی تھی:

''گڈو! ایسی بات نہیں پوچھتے۔ اور اگر مجاہد کو پتا چل گیا تو اُس کا دل خراب ہوگا۔''

''دل کیوں خراب ہوگا؟'' گڈو عمر میں اُس سے چار سال چھوٹی تھی لیکن اُس کی باتوں میں بڑوں کا رنگ تھا۔ ''جیسے تم کہتی ہو کہ کل اُس نے ہمیں سنبھالنا ہے تو اُسے پتا ہونا چاہیے۔''

''تمھاری زبان بہت لمبی ہے۔'' فاطمہ نے غصے سے کہا اور ساتھ ہی تھپڑ کی آواز آئی۔ مجاہد کو آج تک کسی نے مارا نہیں تھا، اُسے اُس تھپڑ کا درد اپنے گال پر محسوس ہوا۔ وہ گال سہلاتے ہوئے، کچھ سوچے بغیر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ گڈو اُسے دیکھتے ہی اپنی ماں سے دور ہو کے مجاہد کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''گڈو! بتاؤ کیا بات ہے؟'' مجاہد کو اپنی آواز میں ایک حکم لگا۔ فاطمہ نے ایک خوف کے ساتھ پہلے مجاہد اور پھر گڈو کی طرف دیکھا۔ گڈو اعتماد کے ساتھ مجاہد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجاہد نے سر کے اشارے سے گڈو کو بات کرنے کے لیے کہا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' فاطمہ نے غسل خانے سے باہر نکلتے ہوئے مجاہد کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں دالان میں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''مجھے چودھری نے خریدا ہے۔'' فاطمہ تیزی سے بات کہہ کر تھکی ہوئی سی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مجاہد پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اب آدمی اور عورت کے رشتوں کو جاننے اور سمجھنے لگا تھا، وہ راتوں کو کئی دفعہ اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں کو خواب میں دیکھ کر ہانپتا ہوا جاگ جاتا۔

''کہاں سے؟'' مجاہد کے ذہن میں فوری طور پر کوئی سوال نہ آیا۔

''تم میرے بیٹے ہو لیکن میں تمھیں یہ نہیں بتا سکتی۔'' فاطمہ نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''کیا تم ابو کی بیوی نہیں ہو؟'' مجاہد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارا نکاح تو ہوا ہے لیکن میری حیثیت غلام والی ہی رہے گی اِس لیے کہ میں ٹاٹ کا پیوند ہوں۔''

مجاہد کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اُسے اپنے چاروں طرف خاموشی کا بلند پہاڑ محسوس ہوا۔ وہ وہاں ایک پتھر کی طرح کھڑا رہا اور پھر اُس کی آنکھ سے پہلا آنسو گرا۔ اُس نے اپنے آنسو فاطمہ یا گڈو سے چھپائے نہیں، وہ روتا رہا اور فاطمہ اِس اشک باری میں اُس کا ساتھ دیتی

رہی۔ اُسے کبھی اپنے پر ترس آتا اور کبھی فاطمہ پر، کبھی فاطمہ اُسے مظلوم لگتی اور کبھی وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا۔ وہ سوچے جارہا تھا: ابا نے فاطمہ کی قیمت ادا کر کے میرے ساتھ ظلم کر دیا ہے۔

فاطمہ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا، ''جاؤ اور باہر کا چکر لگا آؤ۔ پھر تمھارے پڑھنے کا وقت ہو جاتا ہے۔'' مجاہد جواب دیے بغیر، سر جھکائے باہر نکل کر دیوان خانے گیا۔ اُس کا باپ کچھ لوگوں کے ساتھ کسی مسئلے پر گفتگو میں مشغول تھا۔ اُسے مجاہد کا آنا کچھ عجیب سا لگا کیوں کہ وہ دیوان خانے میں کبھی گیا نہیں تھا۔ اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجاہد کے ساتھ بات کیے بغیر سوال کیا کہ وہ کیوں آیا تھا؟

''آپ سے ایک بات پوچھنی ہے!''

چودھری کو خوشی ہوئی کہ مجاہد اپنے کسی مسئلے میں اُس کی ساجھے داری چاہتا ہے۔ اُس نے وہاں بیٹھے آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''تم لوگ اب جا سکتے ہو۔ میرے لیے حکم ہی بہت بھاری آیا ہے۔'' وہ سب خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

''آپ نے فاطمہ کو خریدا کیوں ہے؟'' مجاہد کے سوال سے اُس کے باپ کو ایک جھٹکا لگا۔ اُسے اپنی سانس چھاتی میں اٹکتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُس نے لمبی لمبی سانس لے کر اپنی چھاتی میں اٹکی ہوئی سانس کو رواں کیا۔ تب تک مجاہد بھی اپنے سوال پوچھنے کے بعد کی شرمندگی پر قابو پا چکا تھا۔

''کچھ باتیں صرف بڑوں کے طے کرنے والی ہوتی ہیں۔'' اُس کے باپ کے لہجے میں سختی تھی۔

''میں اب بچہ نہیں رہا۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم نہ جانو تو اچھا ہوگا۔'' اِس مرتبہ اُس کے باپ کا لہجہ مصالحتی تھا۔ اُس نے کچھ دیر سوچا، ''دیکھو بیٹا! میں ایک جوان آدمی نہیں ہوں۔ میں ایسی عورت گھر میں لانا چاہتا تھا جو گھر چلانے کے ساتھ ساتھ گھر کی مالکن نہ ہو۔ وہ نوکرانی ہی رہے۔ فاطمہ مجھے اتنی مہنگی نہیں ملی۔''

چودھری کو ایسے محسوس ہوا کہ پرندہ پنجرے کے کھلے دروازے میں سے نکل کر فضا میں اُڑتے ہوئے کرتب کر رہا ہے۔

''آپ اُسے نوکرانی کے بجائے گھر کی مالکن سمجھا کریں۔'' مجاہد نے شام کے تھوڑے سے عرصے میں دوسرا حکم دیا اور گھر چلا گیا!

گڈو کے ساتھ مجاہد کا رشتہ خود دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے قریبی دوست تھے اور گھر کے معاملات میں سخت مخالف بھی۔ گڈو کو گھر میں فاطمہ کی کم حیثیتی پر اعتراض تھا۔ اُس کے خیال میں مجاہد، فاطمہ کو ایک طرح کی گہری عزت دینے کے باوجود ایسا کچھ نہیں کررہا تھا جس سے اُس کا باپ مجبور ہو کر اُسے ٹاٹ کا پیوند نہ سمجھے۔ مجاہد نے فاطمہ یا گڈو کو دیوان خانے میں باپ کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اُس شام کے بعد فاطمہ کو کبھی ٹاٹ کا پیوند تو نہیں کہا گیا لیکن باپ اکثر ایسا رویہ رکھتا جس سے یہی ظاہر ہوتا۔ جب فاطمہ سر پر ڈوپٹے کی پٹی باندھے بغیر گھر کے کاموں میں لگی ہوتی تو یہ سب اچھا ہونے کا اشارہ ہوتا اور گڈو بھی خوش ہوتی اور اُس کی کوشش ہوتی کہ مجاہد کے ساتھ وقت گزارے۔ ایک سہ پہر خوب بارش ہوئی اور مجاہد مشرق والے چوبارے کی مشرقی کھڑکی میں بیٹھ کر مدن چک میں پانی کی جھیل بنتے دیکھنے لگا۔ اُسے پتا ہی نہ چلا کہ گڈو کب سے اُس کے پیچھے کھڑی کھمب میں پھیلتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی ہے۔ مجاہد نے جب اُسے دیکھا تو اُس پر سے نظر ہٹا نہ سکا۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا شلوار کرتہ پہنے ہوئے تھی اور مجاہد کو بارش کے بعد کا نکھرا ہوا آسمان لگی۔ وہ دیر تک اُسے دیکھتا رہا اور گڈو نظر جھکائے متواتر شرمیلی سی ہنسی ہنستی رہی۔ مجاہد کو اپنی چھاتی اور پیٹ میں عجیب سا کھچاؤ محسوس ہوا جو راتوں کو نظر آنے والے خوابوں سے بالکل مختلف تھا۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں جو ابھی مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوئی تھیں، اُسے اُن میں پھڑ پھڑاہٹ سی محسوس ہوئی، اُس کا جی چاہا کہ گڈو کو بانہوں میں لے کر چھاتی کے ساتھ لگا کے بھینچ ڈالے۔ مجاہد اُٹھا اور گڈو کے سامنے جا کھڑا ہوا، وہ دبی دبی سی ہنسی ہنسے جا رہی تھی۔ مجاہد نے اُس کی چوٹی کو مضبوطی سے پکڑ کر اُس کا سر اوپر کیا۔ گڈو کو اُس درد میں ایک لذت کا احساس ہوا اور اُس نے ہنسنا ختم کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ گڈو کی گردن قسائی کی چھری کے آگے لیٹے بکرے کی گردن کی طرح کسی ہوئی تھی۔ مجاہد کسی ہوئی گردن کو ایسے دیکھ رہا تھا کہ کسی بھی وقت وہاں سے خون کی دھار بہہ نکلے گی۔ اُس نے بہتی دھار کو دیکھنے کا فیصلہ کیا اور دانتوں سے شاہ رگ

کاٹنے کے لیے نیچے جھکا۔ اُسی وقت چوبارے میں فاطمہ داخل ہوئی۔ اُس نے شکنجے میں پھنسی ہوئی گڈو اور اوپر جھکے ہوئے مجاہد کو دیکھا تو فوراً بولی:

''بچو! ایسی کھیلیں نہیں کھیلتے..... '' اُس نے اپنی آواز کے کھچاؤ کو مذاق میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، ''میں کافی دیر نیچے انتظار کرتی رہی اور پھر سوچا کہ اوپر آکر تم لوگوں کے ساتھ دو چار باتیں ہی کرلوں۔'' مجاہد ہاتھ لٹکائے ساکن کھڑا فاطمہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا قد اتنا اونچا ہے کہ ماں بیٹی بونیاں لگ رہی ہیں۔ اُسے ایک دم عجیب سا احساس ہونے لگا، وہ اُس آدمی کی طرح تھا جو سب کچھ دیکھ تو رہا ہے لیکن محسوس کچھ نہیں کر رہا۔ اُسے اپنے کیے پر شرمندگی ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ شرمندہ نہیں تھا۔

''بارش کے بعد موسم ایسے کھل جاتا ہے کہ ہر چیز ڈھلی ڈھلی نظر آتی ہے۔ مجھے اِس گاؤں میں آنے کے بعد بارش کا نیا ہی مزہ آتا ہے، شاید میں پہلے پکے فرش والے گھر میں رہی ہی نہیں تھی۔ جہاں سے میں آئی ہوں وہاں صحن کچا ہوتا تھا اور بارش کے بعد پھسلن کمرے کے اندر ہی بند رکھتی تھی؛ یہی خوف رہتا تھا کہ پھسل کر کوئی ہڈی نہ ٹوٹ جائے۔'' فاطمہ پر جیسے کوئی جن سوار ہو، وہ الم غلم بولے جا رہی تھی، اُسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ خاموش ہوگئی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر آجائے گا جو اُس نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا۔ ''اور یہاں تو بارش میں بھی صحن میں گھوم سکتے ہیں، نہ پھسلنے کا ڈر اور نہ لباس کے گیلے ہونے کا خوف۔ بارش برستی رہے اور لباس بھیگتا رہے۔ ہاں! تم بارش میں اِس چوبارے میں کیوں آکر بیٹھ جاتے ہو؟'' فاطمہ خاموش ہوگئی۔ وہ اپنی اِس بے معنی قسم کی گفتگو میں مجاہد کو بھی شامل کرنا چاہتی تھی۔ گڈو خاموش سی ناگواری کے ساتھ اپنی ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اگر کچھ کہتی تو اُس کی ماں نے پھٹ پڑنا تھا اِس لیے وہ جرم کے احساس تلے دبی اُسے دیکھتی رہی۔

فاطمہ کے سوال نے مجاہد کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ وہ کیا جواب دیتا؟ اُسے لگا کہ اُس نے کبھی بات ہی نہیں کی اور اگر کوشش کی تو گلے سے آواز نہیں نکلے گی۔ وہ خاموشی سے فاطمہ کو دیکھتا رہا۔ اب تینوں ایک دوسرے سے اپنے محسوسات چھپائے ہوئے ایک غیر متوازی سی تکون بنائے کھڑے تھے۔ فاطمہ اپنے غصے اور مایوسی کو لایعنی سی باتوں میں چھپا کر اپنا غبار نکال چکی تھی۔ مجاہد کو فاطمہ کا وہاں آجانا پسند بھی آیا اور نہیں بھی۔ وہ شاید ایسا کچھ نہ کر پاتا جو وہ کرنے جا رہا تھا اور گڈو جو

اُس سے زیادہ سمجھ دار ہے اُسے بے وقوف بنا دیتی۔ گڈو کو مجاہد پر غصہ آ رہا تھا کہ اُس نے بال تو کھینچے لیکن وہیں رکا رہا تاوقتیکہ ماں آ گئی؛ وہ قصور کے بغیر ہی قصوروار بن گئی۔

فاطمہ غور سے مجاہد کو دیکھے جا رہی تھی۔ فاطمہ کی نظر میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور کچھ دیر پہلے والے مصالحتی تاثر کے بجائے وہاں اب ناپسندیدگی اور غصے کا عکس نظر آنے لگا۔ مجاہد اِس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے دل میں خوف اور ندامت کے ہلکے سے احساس نے سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا لیکن فاطمہ کے تبدیل شدہ رویے نے اُس کے اندر بھی ایک تبدیلی پیدا کر دی؛ اُس نے فاطمہ کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مجھے بارش میں وہ جھیل بنتی اچھی لگتی ہے۔'' مجاہد نے مدن چک کی چھمب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا، اُس کے لہجے میں اعتماد اور غرور تھا۔ فاطمہ نے پہلے مجاہد اور پھر گڈو کی طرف دیکھا: ایسا نہ ہو کہ دونوں بغاوت پر آمادہ ہوں! گڈو، اُسے کسی حد تک تذبذب کا شکار لگی تو وہ مطمئن ہو گئی۔

''میں کسی کو الزام نہیں دوں گی، ناسمجھی میں انسان کئی غلطیاں یا غلط فیصلے کر جاتا ہے۔ اگر ہم عقل سے سوچیں تو تم دونوں بہن بھائی ہو اور کوئی اور تعلق قائم کرنا بُرائی ہے۔'' اُس نے ہر لفظ آہستہ آہستہ بولتے ہوئے ادا کیا، اُس کے لہجے میں ایک وقار اور ٹھہراؤ تھا۔ مجاہد مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اُس نے احترام اور ایک طرح اعتراف کے ساتھ فاطمہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے سامنے فاطمہ کا یہ دوسرا رُخ تھا، وہ اُسے صرف ایک اچھی منتظم ہی سمجھا کرتا تھا۔

مجاہد سر جھکا کر چوبارے سے باہر نکل گیا!

اُس شام مجاہد دیر سے گھر آیا۔ وہ نہر کی پٹری پر چلتے ہوئے دور تک نکل گیا۔ اُسے بارش کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی چھپڑیوں کی کوئی پروانہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو پھسلنے سے بچاتے ہوئے چلتا رہا۔ اُسے وقت اور فاصلے کا احساس نہ رہا۔ فاطمہ کے الفاظ اُسے حرکت میں رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے جو بھی کہا تھا، اُسے مکمل طور پر منطقی لگا۔ گڈو اُس کی چھوٹی بہن ہی تو تھی! وہ، فاطمہ کو اپنی ماں قبول کر چکا تھا اور گڈو اُس کے باپ کو ویسے ہی ابا کہتی تھی جیسے کہ وہ کہتا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ سگے تو نہیں تھے لیکن اُن کے ماں اور باپ میاں بیوی بن چکے تھے، اُس حوالے سے وہ بہن بھائی تھے۔ مجاہد چلتے چلتے ایک دم رُک گیا۔ گڈو اُس کی بہن تھی۔ اُس نے فاطمہ سے کبھی اُس کی ذات کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، کل گڈو کی شادی بھی کرنی ہے۔ وہ پانچویں جماعت پاس کر کے مڈل سکول میں جانے والا ہے اور گڈو ابھی تک کسی سکول میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ وہ باپ سے بات کر کے کل ہی اُسے سکول بھجوائے گا۔ اُسے گڈو میں اچانک ایک بھائی بھی نظر آنے لگا۔ وہ اُسے سکول کی باتیں سنایا کرے گا اور دوستوں کے ساتھ اپنی کھیلوں کی تفصیل بتایا کرے گا۔ اُسے گڈو میں ایک بھول پن نظر آیا، وہ کسی ہوئی گردن کے ساتھ آنکھیں بند کیے کیسے معصومیت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے اپنی چھاتی میں ایک بھنور سا بنتے ہوئے محسوس ہوا، ایسے لگا کہ وہ بھاگنا شروع کر دے گا۔ وہ تیز قدم اُٹھاتے ہوئے واپس چل پڑا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی وقت تھا اور اگر باپ دیوان خانے میں ہوا تو گڈو کی تعلیم کے بارے میں بات کرے گا۔ اُس کے اُستاد روز بتاتے تھے کہ آنے والے وقت میں عورتوں اور مردوں کو جتنی ممکن ہو تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اگر گڈو ان پڑھ رہ گئی تو خاندان کا نام خاک میں مل جائے گا۔ اگر گڈو تعلیم نہ حاصل کر سکی تو وہ بہت ساری اَن پڑھ عورتوں کے ریوڑ میں شامل ہو جائے گی۔

واپسی پر مجاہد کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن اِس کے باجود وہ چھپڑیوں کو پھلانگتا رہا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی اور کا خواب دیکھ رہا ہے، وہ اُسی اجنبی خواب میں گم آگے چلتا رہا۔ اُسے جلدی

تھی کہ وہ باپ کے دیوان خانے میں بیٹھے ہونے تک وہاں پہنچ جائے۔ وہ باپ کے ساتھ کیا بات کرے گا؟ باپ نے اگر پوچھا کہ اُسے گڈو میں کیا دل چسپی ہے تو وہ اُسے کیا جواب دے گا؟ گڈو اُس کی بہن تھی اور اخلاقی طور پر اُسے اپنی بہن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونا چاہیے۔ اُسے اچانک اپنا آپ مختلف لگنے لگا اور اِس طرح اوروں سے جدا لگنا پسند بھی آیا۔ کیا وہ کسی خواب میں تھا؟ ابھی تو اُسے لگا تھا کہ وہ کسی کا خواب دیکھ رہا تھا اور کیا اب اپنے ہی کسی خواب میں گم ہو گیا تھا؟ فاطمہ اُسے پسند تھی، وہ اُس کی ماں تو نہیں تھی لیکن اُس کی محبت میں کہیں ایسی گہرائی تھی جہاں اُس کا ہر عمل ممتا میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی ماں بعض اوقات ایسی بات کر جایا کرتی تھی جو دل آزاری کا باعث بنتی۔ دونوں ہی اُس کی مائیں تھیں، ایک گھر میں اور دوسری قبرستان میں! آج فاطمہ نے جس فراخ دلی کا مظاہرہ کیا وہ ایک نا قابلِ یقین عمل تھا۔ اُس کے ردِ عمل میں قابلِ تعریف فراست تھی جس نے اُسے ایک راہ دکھائی۔ اُس نے گڈو کو اپنا دوست ہی سمجھا تھا اور اِسی مفروضے کے تحت آج اُسے گلے لگانے سے پہلے اُس کا بوسہ لینا چاہا تھا۔ اچانک مجاہد کی آنکھوں کے سامنے مشرقی چوبارے کا نظارہ گھوم گیا۔ وہ شرمندگی کے احساس گہرائی میں ڈوب گیا۔ اُس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگنے سے وہ اپنی سوچ کے جالوں میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی اور وہ کوٹھی میں دل دھڑکنے کی آواز سن سکتا تھا۔ اُس کے قدم لمبے اور جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، اُسے اپنے آپ میں ایک نئی طاقت کا احساس ہوا، جیسے ایک بچھیرا لادو نکالے جانے کے بعد سوار کو اُٹھائے اپنے آپ کو یک دم مضبوط اور طاقتور سمجھنے لگ جائے!

مجاہد جب دیوان خانے میں پہنچا تو اُس کا باپ کسی مسئلے کی سماعت کر رہا تھا اور فریق باری باری اپنا نقطۂ نظر سنا رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر ایک ایک لفظ غور سے سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے یہ عمل خاصا مضحکہ خیز لگا کیوں کہ اُس کے علم میں تھا کہ باپ سماعت سے پہلے ہی فیصلے کا طے کر چکا تھا۔ رات ایک فریق اُن کے گھر آ کے دیر تک اُس کے باپ کے ساتھ بات چیت کرتا رہا تھا۔ یہ فیصلہ حقائق کے بجائے فریق کے خاندان کے افراد کی تعداد کی وجہ سے اُن کے حق میں جانا تھا۔

جس فریق نے جیتنا تھا اُس نے اپنی جیت کو ڈرامائی بنانے کے لیے اگلے دن کی

مہلت مانگی جس کے لیے دوسرا فریق بادلِ نخواستہ راضی ہوا۔ اُس کے بعد سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ چودھری نے پھیکی سی مسکراہٹ اور متجسس آنکھوں سے مجاہد کی طرف دیکھا۔ مجاہد نے اپنا گلا صاف کیا:

''ابو جی! آپ نے کبھی گڈو کے متعلق سوچا ہے؟''

چودھری نے حیرانی کے ساتھ مجاہد کی طرف دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں تھیں۔

''اُس کے متعلق کیا سوچنا ہے؟'' چودھری نے اپنی آواز کو سیدھی رکھا۔

''وہ اب ہمارے خاندان کا حصہ ہے۔''

''تو پھر؟'' اب اُس کی آواز میں درشتگی تھی۔

''آپ کو اُس کے متعلق سوچنا چاہیے!''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اُس نے برہمی اور اُکتاہٹ سے پوچھا۔

''یہی کہ ہمیں اُس کی تعلیم کے متعلق سوچنا چاہیے۔''

چودھری نے فوری کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نیم اندھیرے کمرے میں مجاہد کو دیکھے جا رہا تھا، اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہ ہمارے گھر میں رہ ضرور رہی ہے لیکن ہمارے خاندان کا حصہ نہیں۔'' چودھری نے سرد لہجے میں کہا۔ اب اُس کی آواز میں اُکتاہٹ نہیں تھی۔

''وہ جب تک ہمارے گھر میں نہیں آئی تھی ہمارے لیے کچھ بھی نہیں تھی اور اب جب آپ اُسے لے آئے ہیں تو خاندان کا حصہ بن گئی ہے۔''

چودھری کچھ دیر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا، اُس کی آنکھوں میں اُلجھن تھی۔

''اب وہ ہمارے خاندان کا حصہ بن گئی ہے؟'' اُس نے طنزیہ سی جارحیت سے پوچھا۔

''جی ہاں!''

''اور اُسے تعلیم بھی دلائی جائے؟'' اُس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ مجاہد نے تیزی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا، اندھیرے کی وجہ سے اُسے کوئی تاثر نظر نہ آیا۔

''ابا جی! اُسے آپ ہی گھر لائے تھے اور لانے سے پہلے مجھے کہا تھا کہ تم اُس کے ساتھ کھیلا کرنا۔'' چودھری سوچ میں گم ہو گیا۔

''چودھری جی! اندھیرا ہو رہا ہے، لالٹین جلاؤں؟''

''رہنے دو اور تم جاؤ۔'' ملازم سر کھجاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''مجاہد! وہ ایک کم حیثیت باپ کی بیٹی ہے، اُسے وہی مقام ملے گا جو اُس کا ہے۔'' سنتیں

چودھری کی آواز کسی حد تک سُتی ہوئی تھی۔ وہ چارپائی پر ایسے ہلا جیسے اُٹھنے والا ہو۔

''اُس کی ماں بھی ایک کم حیثیت خاوند کی بیوی تھی مگر اب ایک باحیثیت آدمی کے گھر میں ہے۔'' چودھری کو لگا کہ اُس کے منہ پر کسی نے زور کا تھپڑ مار دیا ہے۔ وہ اپنا گال سہلانا چاہتا تھا لیکن جھجک کی وجہ سے ایسے نہ کر سکا۔ وہ لاجواب ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' چودھری نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

فاطمہ نے اب گاؤں کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ پہلے وہ گاؤں کے ہر معاملے سے لاتعلق رہتی تھی لیکن اب چودھری کو مشورے دینے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ چودھری کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی، وہ ہر فیصلہ فاطمہ کی اجازت سے کرتا۔ گاؤں کی عورتیں فاطمہ کو اہمیت دینے لگیں۔ پہلے وہ اُن کے لیے ایک دل چسپی کا باعث ہوا کرتی تھی اور وہ دیکھنے آتی تھیں کہ خریدی ہوئی عورت کے اطوار کیسے ہوتے ہیں؟ وہ اُنھیں سہمی سہمی اور کسی حد تک احمق لگا کرتی تھی۔ اُنھیں اُس چودھری کی عقل پر حیرت ہوتی جو اُن کا سربراہ تھا اور اُس پر ترس بھی آتا کہ وہ اپنی باقی زندگی ایسی عورت کے ساتھ گزارے گا جو کم عقل ہے اور معاملہ فہم نہیں اور اب وہ اُسی فاطمہ کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے آتیں۔ فاطمہ نے گاؤں کے سربراہ کی بیوی کے فرائض سمجھ لیے تھے۔ وہ اُنھیں چارپائی پر عزت کے ساتھ بٹھاتی اور ایک مصنوعی سی توجہ سے اُن کی مشکل سنتی۔ وہ اُن جھگڑوں یا مسئلوں کی وجہ کو جان گئی تھی، اُنھیں ہر حال میں اپنا ناک اونچا رکھنا تھا جس کے لیے وہ اپنے خاوندوں کو بھی اندھیرے میں رکھتیں۔ فاطمہ اُنھیں پیار اور اپنایت سے سمجھاتی :''ہمیشہ اپنی بات پر اڑے رہنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ میں بھی تم لوگوں کی طرح ضدی اور......'' وہ کچھ دیر خاموش ہو جاتی؛ ''.....میری بات کا بُرا نہ ماننا،'' وہ سب کی شکلوں کو غور سے دیکھتی؛ ''کسی حد تک جاہل تھی اور پہلے خاوند سے ہر بات چھپاتی۔ میرا کوئی ایسا ویسا ارادہ نہیں تھا، بس یہی کہ اُسے کیوں بتاؤں؟ نتیجے میں ہر وقت کسی نہ کسی اُلجھن میں گھری رہتی۔ یقین جانو کہ خاوند کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ وہ ایک محنت کرنے والا آدمی تھا اور میرا بہت خیال رکھتا۔ میرا ایک عورت کے ساتھ لینے دینے پر جھگڑا ہو گیا جو میرے خاوند کے علم میں تھا۔'' فاطمہ اُن دنوں کو یاد کر کے ایک لمبی آہ بھرتی، اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ ڈوپٹے کے کونے سے اپنی آنکھیں خشک کرتی، وہاں موجود عورتوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا جاتیں۔ وہ پھر ایک لمبی آہ بھر کر اپنی بات جاری رکھتی؛ ''اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کتنے پیسے دینے ہیں تو میں صاف مکر گئی۔ وہ ایک سیدھا آدمی

تھا، اُس نے مجھے..... مجھے فارغ کر دیا۔"

بار بار سنائے جانے والا یہ قصہ ہر بار نیا ہوتا اور وہ اِسے اتنی دل چسپی اور توجہ سے سنتیں کہ جیسے پہلی بار سُن رہی ہوں۔ وہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے تیزی سے اقرار میں سر ہلاتیں۔ فاطمہ نے گاؤں کی عورتوں کو زندگی کی ایک نئی شکل سے متعارف کروایا، وہ اپنی بے مقصد ضد کے کھوکھلے پن کو سمجھنے لگیں۔

فاطمہ کے آنے کے بعد چودھری کے گھر میں ایک کھچاؤ، بے چینی اور ناآسودگی در آئی تھی۔ چودھری کو کبھی کبھی اُسے گھر میں لانے کا پچھتاوا ہوتا، وہ گھر میں آنے سے کترانے لگا۔ وہ اپنے آپ سے خوف زدہ رہتا۔ وہ فاطمہ کو چلتی کرنے کا بھی سوچتا لیکن دیکھتا کہ مجاہد اُس کے ساتھ بہت ہل گیا ہے۔ وہ اتنا خوش، مطمئن اور آرام سے تھا جتنا اپنی ماں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی ماں مجاہد کی بہت ساری ضرورتوں کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دیتی تھی جب کہ فاطمہ اُس کی ہر ضرورت کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ یہ اُسے متاثر کرنے کا ایک چلتر ہے لیکن آہستہ آہستہ فاطمہ کے رویے میں اُسے خلوص اور ممتا نظر آتی۔

اُس شام دیوان خانے میں مجاہد کی باتوں میں چودھری کو وزن محسوس ہوا۔ مجاہد کبھی اِتنا پُر اعتماد نہیں رہا تھا اور چودھری نے محسوس کیا کہ اِس کی وجہ فاطمہ تھی۔ فاطمہ، مجاہد کے پاس بیٹھ کر اُس کی باتیں سنتی اور جب وہ بول رہا ہوتا تو آنکھوں اور سر کے اشارے سے اُس کا حوصلہ بڑھاتی جاتی۔ مجاہد سکول جانے کے لیے جب گھر سے نکلتا تو وہ واقعی چودھری کا بیٹا لگتا: صاف ستھری وردی، بال بنے ہوئے اور بے داغ بستہ۔ مجاہد پہلے ہمیشہ سلوٹوں والی وردی پہنے، الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ سکول جایا کرتا تھا، دوسرے لوگوں کے بچے بھی اِسی حالت میں گھروں سے نکلا کرتے تھے۔

اُس شام چودھری کو محسوس ہوا کہ مجاہد اُس کے اور فاطمہ کے درمیان میں پُل بننا چاہتا تھا اور اُس نے اُسے پُل بننے دیا۔ گڈو سکول جانے لگی۔ فاطمہ کے اندر ہمیشہ ایک کھچاؤ اور خوف رہتا تھا، گڈو کے سکول جانے کے بعد اُسے گھر میں اپنے پاؤں جمتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُس وقت تک اُسے چودھری اور مجاہد کے درمیان میں دیوان خانے میں ہونے والی بات چیت کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اُس نے بھی چودھری کے قریب آنا شروع کر دیا۔ وہ جب رات کھانے

کے لیے آتا تو فاطمہ پانی کا جگ لے کر اُس کا گلاس بھرنے کے بہانے پاس بیٹھ جاتی۔

''دن کیسا گزرا؟'' وہ معصومیت سے پوچھتی۔

چودھری ایسے سوالوں کا عادی نہیں تھا، اُسے یہ سوال غیر ضروری لگتا۔ وہ لقمہ منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے یوں جواب دیتا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ فاطمہ مایوس نہ ہوتی:

''آج غفور کی بیوی میرے پاس آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں اُن کے مسئلے میں اُن کی سفارشی بنوں۔'' وہ چودھری کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پڑھ سکتی تھی، وہ فوراً پینترہ بدلتی: ''پر میں نے اُسے کہہ دیا کہ صغریٰ یہ تو مردوں کی باتیں ہیں، میں سفارش کرنے والی کون ہوتی ہوں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' چودھری پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیتا۔

''لیکن چودھری صاحب! اُن کے ساتھ ہے یہ زیادتی۔ اُن کی زمین کھال کے آخیر میں ہے اور نکال پر اُن کا حق بنتا ہے۔''

''کیسے بنتا ہے؟'' چودھری برہمی سے پوچھتا۔

''کیوں کہ وہاں تک پانی پہنچنے میں جتنا وقت لگتا ہے پانی بند کرنے کے بعد اُتنا پانی اُن تک جانا چاہیے۔''

''لیکن اگر اُن کے بعد کی واری کھال کے درمیان میں ہو تو؟''

''اوپر والا پانی تو نہیں جا سکتا لیکن بعد والا پانی تو جانا چاہیے۔''

چودھری کوئی جواب نہ دیتا، وہ سر جھکائے اپنا لقمہ چبانے میں مصروف رہتا۔ وہ فاطمہ کی منطق سے اتفاق تو کرتا تھا لیکن اعتراف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''مجاہد!'' اُسی وقت فاطمہ مجاہد کو کڑک دار آواز دیتی۔ مجاہد تیزی سے چلتے ہوئے وہاں پہنچتا تو فاطمہ اُسے باپ کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتی۔

''کھانا کھا لیا؟'' چودھری بات بدلنے کے لیے پوچھتا۔

''جی ابا! کھا لیا۔ میں آپ کے آنے سے پہلے کھانا کھا لیتا ہوں۔''

''چودھری جی! میں مجاہد کو آپ کے آنے سے پہلے ہی کھلا دیتی ہوں تا کہ آپ تسلی کے ساتھ کھا سکیں۔''

چودھری پھر جواب نہ دیتا۔ وہ کھانا ختم کر چکا ہوتا لیکن چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا رہتا
تا کہ کوئی اور گفتگو نہ شروع ہو جائے۔

''میں ابھی آئی۔''

فاطمہ چولھے کی طرف جاتی اور دھیمی آنچ پر رکھے دودھ کے دو گلاس بھر کر باپ اور بیٹے
کو دیتی۔ چودھری کو کھانے کے فوراً بعد میٹھا دودھ پینے کا مزہ آتا تھا۔ مجاہد کی ماں اِس طرح گرم
دودھ کبھی نہیں دے سکی تھی۔ باپ بیٹا جب دودھ کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے ہوتے تو
فاطمہ تیزی سے جا کر چلم میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈال کر لے آتی اور چودھری جیسے ہی آخری
گھونٹ لیتا فاطمہ حقہ اُس کے سامنے رکھ دیتی۔

''فاطمہ!'' مجاہد نے ایک دن اُسے مخاطب کیا۔

''گڈو کو بھی ہمارے ساتھ دودھ دیا کرو!''

چودھری نے کوئی رائے نہیں دی۔

''لڑکیاں دودھ نہیں پیتیں۔'' فاطمہ نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا تھا۔

''یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ اَن پڑھ رہتی تھیں۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ آج
کے دور میں لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔''

''اُسے دودھ پلایا کرو۔'' اُس شام چودھری نے پہلی مکمل بات کی تھی۔

پھر چوہدری، فاطمہ کی باتوں کا جواب دینے لگا۔

''آج چائے اور کھانے کی چیزیں آپ نے منگوائی تھیں۔''

''ہاں۔ ساتھ والے گاؤں سے دلدار آیا تھا۔ وہ ایک سیاسی سمجھوتہ کرنے آیا تھا۔
ضروری تھا کہ اُس کی خاطر مدارت کی جاتی۔''

''کچھ طے ہوا؟'' فاطمہ تجسس سے پوچھتی۔

''وہ ہمیشہ میرا مخالف رہا ہے۔ اب اُسے احساس ہوا ہے کہ اُس کو میرے ساتھ مل کر
چلنا چاہیے۔''

''وہ آپ سے کبھی جیتا ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھی بات ہے لیکن آپ کو اُس کی نیت پر شک رکھنا چاہیے۔''

''اگر وہ پکا وعدہ کرے تو اُس کا یقین کرنا پڑے گا۔''

''آپ کو کیسے پتا ہو گا کہ وہ وعدہ پکا ہے؟''

''انسان کی زبان ہی اُس کا اعتبار ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہر زبان آپ کی طرح کی نہیں ہوتی۔'' فاطمہ نے چودھری کے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

یہ سوال چودھری کا فاطمہ کے ساتھ رفاقت کا آغاز تھا۔ اب وہ رات کے کھانے پر دیر تک تبادلۂ خیال کرتے۔ مجاہد اور گڈو بھی اُن کے پاس بیٹھے ہوتے۔

''چودھری جی! ایک مشورہ ہے یا سوال سمجھو!'' ایک رات فاطمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ مجاہد اور گڈو بھی چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ چودھری نے فوری طور پر جواب نہ دیا۔ اُسے فاطمہ کی جھجک میں ایک دلیری نظر آئی۔

''کہو!'' چودھری کی آواز میں یقین تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ چھوٹی چھوٹی یا خشخشی سی ڈاڑھی رکھ لیں۔ یہ آپ کی بزرگی کی نشانی ہو گی اور آپ کے وقار میں بھی اضافہ کرے گی۔''

''آپ پر سجے گی۔'' سب سے پہلے گڈو نے شوق کے ساتھ رائے دی۔ چودھری نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پھر مجاہد کی طرف۔

''ابا! سجے گی ضرور اگر آپ اُسے رنگیں نا۔ خاکی یا کالی ڈاڑھی اور سفید جڑیں اچھی نہیں لگتیں۔ آپ سفید ہی رکھیں۔'' مجاہد کی رائے بھی چودھری کو پسند آئی۔

''چودھری جی! آپ خدا کا نام لے کر رکھیں۔ یہ تو گھر کی فصل ہے، جب مناسب سمجھا ختم کر دی۔'' فاطمہ نے حوصلہ افزائی کی۔

فاطمہ کے کہنے پر چودھری نے ڈاڑھی رکھ لی۔

''چودھری جی! آپ اکیلے میں کھانا کھاتے ہیں، مجھے یہ مناسب نہیں لگتا۔'' ایک رات فاطمہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کسی کو ساتھ لے آیا کروں؟'' چودھری نے خوش مزاجی سے پوچھا۔ فاطمہ نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا:

''کسی کو ساتھ کیوں لانا ہے! مجاہد اور آپ اکٹھے کھانا کھایا کریں۔'' فاطمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں اکیلا کیوں؟ گڈو اور تم بھی ساتھ کھایا کرو۔'' مجاہد نے خوشی اور دلچسپی سے کہا۔

''ٹھیک ہے فاطمہ! ہم سب اکٹھے کھانا کھایا کریں گے۔ میں اکیلے کھاتے اُکتا سا گیا تھا۔ تمھیں تو مسئلہ نہیں ہوگا؟'' چودھری نے خوش دلی سے پوچھا۔

''نہیں! میں سارے کام نمٹالیا کروں گی۔'' فاطمہ نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''اب کھانے کا مزہ آیا کرے گا۔'' مجاہد نے خوشی کے ساتھ کہا۔

چودھری پہلے گھر میں صرف سونے اور کھانا کھانے آیا کرتا تھا، بعض اوقات وہ پہننے والے کپڑے دیوان خانے میں منگوا کر، وہیں غسل خانے میں نہا کر تیار ہو کر اپنے کام شروع کر دیتا تھا۔ فاطمہ کے ساتھ تعلق قریب اور گہرا ہونے کے بعد اُس نے گھر میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ وہ بیٹھے ہوئے مجاہد اور گڈو کو کسی کھیل میں مصروف دیکھتا رہتا یا فاطمہ جب کسی کام مصروف ہوتی تو اُس کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔

''فاطمہ! مجھے گھر آنا اچھا لگنے لگا ہے۔'' ایک دن چودھری نے اعتراف کیا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ وہ کتنی آسانی کے ساتھ اپنی شکست تسلیم کر گیا ہے۔

''آپ پہلے گھر آتے نہیں تھے، اگر آتے تو یقیناً آپ کو تب بھی اچھا لگتا۔'' فاطمہ نے اُسے مکمل طور پر ہتھیار پھینکنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتایا یہی گیا تھا کہ گھر جانا مضبوط آدمی کا کام نہیں ہے۔ گھر وہی لوگ چکر لگاتے رہتے ہیں جو کمزور ہوں۔'' چودھری نے حقے کا کش لیتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا۔

''گھر آنے میں مضبوطی یا کمزوری کا کیا تعلق ہے۔ گھر تو گھونسلے کی طرح ہوتا ہے جس میں پکھیروؤں نے آنا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو ایسی جگہ ہے جہاں سکون ملتا ہے۔ آدمی گھر اپنی طاقت یا کمزوری آزمانے نہیں آتا، اُس نے گھر اپنے سکھ کے لیے آنا ہوتا ہے۔''

چودھری کو گھر میں ایسا سکون ملا کہ پھر وہ گھر سے بہت کم باہر گیا۔ وہ دیوان خانے میں اگر جاتا تو اُسے گھر جانے کی جلدی ہوتی۔ گاؤں کے لوگ اُس سے اگر ملنا چاہتے تو اُس کے پاس اُن کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔

''چودھری جی! آپ گھر میں میرے پاس زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ میرے لیے تو یہ خوشی اور فخر کی بات ہے۔ آپ یہاں رہتے ہوئے کسی کام میں حصہ بھی نہیں ڈالتے ہو اور یہ ہے بھی درست لیکن آدمی باہر سے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے آتا ہی اچھا لگتا ہے۔''

چودھری، فاطمہ کی اُس منطق کا کوئی جواب نہ دے سکتا، وہ خاموشی سے فاطمہ کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہتا۔ چودھری کے اِس طرح گھر میں بند ہو جانے سے گاؤں میں اُس کی ساکھ کم ہونے لگی لیکن چودھری کو اب شیر کے گرجنے سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ وہ اُس بادل کی طرح ہو گیا تھا جو نہ گرجتا ہے اور نہ برستا، بس آسمان کے ناکارہ پن کا حصہ بن جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس کے معاملات فاطمہ سنبھالنے لگی۔ وہ چودھری کی جگہ تو نہ لے سکی لیکن اُس نے چودھراہٹ کو قائم رکھا۔ وہ تیسرے فریق کی معرفت پیغام بھجوا کر فیصلے کرتی۔ اُس کے پیغام بر دونوں طرف اپنی مرضی کے پیغام پہنچاتے جس سے فاطمہ کے فیصلے درست نہ ہوتے۔ چوہدری کو اب کسی کام میں دل چسپی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنا حقہ لیے وہیں بیٹھ جاتا جہاں فاطمہ ہوتی۔ فاطمہ اب اُس کے لیے سورج کی طرح تھی جس سے ہر کوئی روشنی کا خواست گار ہوتا ہے۔ چودھری اُس کے تیر سے گھائل ہوا تھا اور وہ اُس کے زخم سے واقف تھی، اُس نے زخم کا علاج کرنے کی بہت کوشش کی لیکن چودھری نے اُسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ فاطمہ نے زمین کا بندوبست بھی سنبھال لیا۔ زمین کے انتظامی معاملات میں اُس کی سوچ اور تدبیراتی گہرائی قابلِ عمل تو تھے لیکن اُس کا عورت ہونا ایک بڑی رکاوٹ تھا۔

''چودھری جی! گھر سے نکلو اور اپنے معاملات کو ہاتھ میں لو۔ پنچائتی کام لوگ پہلے ہی دوسروں سے کروانے لگ پڑے ہیں۔ جن شریکوں کو آپ نے دوسرے درجے کے لوگوں کا رتبہ دیا ہوا تھا، اَب وہ اپنا حکم چلانے کو تیار ہیں۔''

''میں نے یہ کام بہت کر لیا! اب اِن فیصلوں میں ایک کمی کا احساس رہتا ہے۔ شاید میں فیصلے قانون اور رواج کے بجائے کسی ایک فریق کی سہولت یا اپنے تعلقات کو وسیع تر کرنے کے لیے کرتا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم درست فیصلے کرتی ہو۔''

''میں درست فیصلے کیسے کر سکتی ہوں؟ اگر مَیں پنچایت میں بیٹھوں تو درست فیصلہ کروں اور میرا آدمیوں میں بیٹھنا مناسب نہیں۔'' فاطمہ نے اُکتاہٹ سے کہا۔ وہ اب تھکاوٹ کا شکار بھی رہنے لگی تھی۔ تنگ سا صحن جس میں رات سونے تک وہ ہر وقت چکر کاٹتی رہتی تھی اب اُسے کھلا اور خالی خالی لگنے لگا تھا۔ برآمدہ اُسے غیر ضروری سا لگتا اور وہ سوچتی کہ اِس کی گھر میں ضرورت ہی نہیں تھی۔

''چودھری جی! برآمدہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ دالان تک صحن ہوتا اور دالان سے ملی ہوئی کوٹھڑیاں۔ برامدے نے ہمارے چھوٹے سے گھر کی خوب صورتی کو ختم کر دیا ہے۔'' فاطمہ نے گھر کے صحن میں نظر دوڑائی، اُسے کہیں بھی خوب صورتی نظر نہ آئی۔ اُس نے سوچا کہ گاؤں کے سربراہ کے گھر کی خوب صورتی اُس کی اپنی ذات کی وجہ سے ہی ہے ورنہ یہ گھر اِس قابل نہیں تھا کہ اِس میں چودھری جیسا آدمی رہتا۔ صحن میں نظر دوڑانے کے بعد اُس نے چودھری کی طرف دیکھا، وہ ایک تجسس سے اُسے دیکھے جارہا تھا۔

''جائزہ مکمل کر چکیں؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ فاطمہ جھینپ سی گئی اور اُس سے کوئی جواب بن نہ پایا۔ ''دیکھو فاطمہ! برآمدہ گھر میں ایک کار آمد تعمیر ہوتی ہے۔ یہ صحن اور کمروں یا دالان کے درمیان میں ایسی جگہ ہے جو سال کے کسی بھی موسم میں استعمال ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر برسات کے دنوں میں ہم اِس میں جا بیٹھتے ہیں ورنہ دالان کا حبس کہیں کا نہ چھوڑے۔ اِس گھر کو اگر میں نے بنایا ہوتا تو برآمدہ اور زیادہ رکھتا۔ یہ تو ملک بننے سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔ بیل پایوں کے اوپر لگی جالی میں ۱۹۲۷ لکھا ہے، جس کا مطلب ہوا کہ یہ ملک بننے سے بیس سال پہلے کا بنا ہوا ہے۔'' چودھری یہ بتاتے ہوئے ایک سرشاری میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کی آواز میں مٹھاس آ گئی تھی۔ اُس نے حقے کا ایک لمبا کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے فاطمہ کی طرف دیکھا، ''یہ گاؤں دو حصوں میں تھا۔ ایک حصے میں پکے چوبارے تھے اور دوسرے میں کچے گھر۔ کچے گھر ایک طرح سے بستی تھی اور اُس میں چوہڑے رہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چوہڑے نقل مکانی کرتے رہے۔ اب تو وہاں عیسائیوں کا ایک گھر ہے باقی سب نقل مکانی کر کے کراچی چلے گئے۔ سنا ہے کہ وہ وہاں خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن پر شاید وہ جبر نہ ہو جو اُن پر یہاں ہوتا ہے۔ وہاں کی زندگی میں شاید ذات پات اِس طرح حاوی نہیں جیسے یہاں ہے۔ پکے چوبارے والے گھروں میں سردار بلدیو سنگھ سوڈھی کے بھائی اور بھتیجے رہتے تھے اور وہ خود یہاں رہتا تھا اِس گھر میں۔'' چودھری کی آواز میں اب بے نیازی کا ایک سکون تھا۔ اُس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور وہ نشے کی سی کیفیت میں نیم وا آنکھوں سے فاطمہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ فاطمہ کو لگا کہ چودھری کی مسحور کن کیفیت اُسے باتیں سناتے ہوئے ہوئی ہے اور اُسے اپنی اہمیت پر خوشی بھی ہوئی۔ چودھری اُسے جو باتیں سنا رہا تھا وہ اُس کے علم میں نہیں تھیں اور وہ اپنے آپ کو اُس بچے کی طرح محسوس کر رہی تھی جو

میلے میں راستہ گمنے کے بعد اچانک اپنے باپ سے مل گیا ہو۔ اُسے لگا کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں رہی تھی جتنا کہ اُس وقت تھی۔ چودھری جو بجھا بجھا رہتا تھا آج اُسے تازہ دم اور زندگی سے بھرا ہوا نظر آیا۔ اُس نے اپنی کسی قسم کی رائے دے کر چودھری کے سلسلے میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ چودھری نے حقے کا کش لیا اور تھوڑا سا منہ کھول کر دھواں باہر نکالا۔ ''اردگرد کے دیہات میں اُس کی اہمیت تھی، اُس کی دہشت کی وجہ سے اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ مالک تو سب سے بڑا نہیں تھا لیکن پیچھے کی طرف بنے پکے گھروں والے اُس کی آسامیاں بن کر رہ گئے تھے۔ وہ تھے تو اُس کا خون لیکن وہ اُنھیں ملازموں کی طرح رکھتا، اُن کی زمینیں اُس کے قبضے میں تھیں جس وجہ سے وہ ایک بڑا زمین دار تھا ورنہ اُس کی جدی مالکی جتنے رقبے والے چند اور بھی لوگ تھے۔ بلدیو سنگھ رسہ گیر تھا اور مسلمان چور اُس کے لیے چوریاں کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اُس کی جوہ میں کوئی واردات اُس کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی تھی اور ہر واردات میں اُس کی پتی ہوتی تھی۔ جو چور اُس کی پتی نہ دینے میں بظاہر کامیاب ہو جاتا بلدیو اُسے پنڈی بھٹیاں سے بھی پکڑ لاتا۔'' چودھری خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر وہ کیفیت تھی جو کاشت کار کی گندم کے بیج میں سے پودے بنتے ہوئے دیکھ کر ہوتی ہے، وہ ایک خوش کن خواب میں کھو جاتا ہے قطع نظر بے رحم موسم کے تازیانوں کے۔ چودھری کی نظر فاطمہ کے چہرے پر تھی، وہ جانتا تھا کہ وہ اُس کے بیان کی گرفت میں ہے۔ اُس نے گلا صاف کر کے حقے کا ایک لمبا کش لیا، دھوئیں کے پھیپھڑوں تک پہنچ جانے کا انتظار کیا اور بچا کھچا دھواں نکال کر اُس نے بات کا سرا پکڑا۔ ''اِس کے ساتھ وہ ایک رحم دِل آدمی بھی تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو تو کھینچ کر رکھتا تھا کیوں کہ اُسے اُن کی بغاوت کا خوف رہتا۔ وہ گرمیوں میں ہمیشہ چوبارے کی چھت پر سوتا اور سردیوں میں جنوب والی کوٹھری میں جہاں سے اُس نے ساتھ والے گھر میں چور کھڑکی لگا کر راستہ رکھا ہوا تھا۔ وہ اُس کی بہن کا گھر تھا اور یہ منصوبہ صرف اُن دونوں تک محدود تھا، بلدیو کے بہنوئی اور اُس کی اپنی بیوی کو بھی علم نہیں تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کے وار کرنے کی اہلیت سے واقف تھا اِس لیے ہمیشہ محتاط رہتا۔ وہ گنڈاسا اور برچھی چلانے میں بھی ماہر تھا اور اُس پر حملہ کرنے والے کا اُس سے زیادہ ماہر ہونا ضروری تھا۔''

''چودھری جی! وہ رحم دل کیسے تھا۔'' فاطمہ اپنے تجسس کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ وہ آج کی باتیں تمام رات سنتے چلے جانا چاہتی تھی۔ اُسے چودھری کے اندر سے ایک اور آدمی برآمد ہوتے

ہوئے محسوس ہوا۔ وہ تو مجاہد سے بھی کم عمر لگ رہا تھا۔ چودھری کے بات شروع کرنے سے پہلے وہ جلدی سے اُٹھی اور تیزی کے ساتھ چودھری کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔ چودھری نے متشکرانہ نظر سے فاطمہ کو دیکھا اور ایک ہی ڈیک میں آدھا گلاس ختم کر دیا۔

''میں کسی اور طرف نکل گیا تھا.....وہ اپنے شریکوں کو تو کھینچ کر رکھتا لیکن مجال ہے کہ کسی چوہڑے پر اُس نے زیادتی کی ہو۔ وہ اُن کی ہر غمی خوشی میں شامل ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے گھروں میں جا کر بیٹھتا، سنتا، سناتا، کبھی کبھار کھانا کھاتا اور بوتل بھی پی لیتا۔'' چودھری ہلکے ہلکے ہنسنے لگا، اب اُس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اُس کے ہونٹ تھوڑا تھوڑا کانپ رہے تھے۔''اور اگر دل کرتا تو وہیں سو جاتا اور کوئی عورت کسی وقت اُس کے ساتھ لیٹ جاتی۔ وہ ایک خوب صورت آدمی تھا.... لمبا قد، چوڑی چھاتی اور مضبوط ہاتھ پاؤں.....وہ جس عورت پر ہاتھ رکھتا وہ ہی اُس کی ہو سکتی تھی، مزے کی بات یہ کہ وہ بھی عورتوں کا شوقین تھا لیکن اُسے صرف کالی عورتیں پسند تھیں جو کھیتی میں ملتیں۔'' چودھری نے ایک گھونٹ لے کر خشک گلے کو تر کیا،''اِس کے علاوہ غریبوں کے بچوں کی شادیوں پر اُنھیں بالن، گڑ اور جنس دیتا اور اگر کسی غریب کا ڈھور چوری ہو جاتا تو اُس کی واپسی تک چین نہ لیتا۔''

''اچھا آدمی تھا۔ جاتے ہوئے ہمیں یہ گھر تو دے گیا۔'' فاطمہ نے بلدیو سنگھ کی تعریف میں اپنی رائے بھی شامل کر دی۔

''اِس گھر میں کسی پناہ گزین نے تو آنا ہی تھا سو ہم آ گئے۔ اُدھر ہمارا گھر اِس سے بہت بڑا تھا۔ تم نے کہا کہ جاتے ہوئے گھر دے گیا.....وہ گیا نہیں تھا.....'' چودھری نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''کیوں نہیں گیا تھا؟ قلعہ دیدار سنگھ میں آج بھی ایک خاندان ہندوؤں کا اور ایک سکھوں کا ہے، اِس کے علاوہ تو ارد گرد کوئی سکھ خاندان آباد نہیں۔''

''اُسے مار دیا گیا تھا۔'' چودھری کی آواز میں دکھ تھا، سننے والا یہی محسوس کرتا کہ چودھری اپنے کسی عزیز کے مارے جانے کا بتا رہا ہے!

''بہت دکھی کر دیا چودھری جی۔'' فاطمہ نے بے چینی سے اپنی کلائی پر ڈوپٹے کو گرہیں دیتے اور کھولتے ہوئے کہا۔''جس طرح تم نے اُس کے متعلق بتایا، میرا تو یہی خیال تھا کہ اُسے قدرت کے علاوہ کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ مارا کیسے گیا؟'' فاطمہ کا تجسس پھر غالب آ گیا۔

''جب بلوے شروع ہوئے تو گاؤں والے ایک دوسرے کی حفاظت میں رہنے لگے۔ وہ راتیں اکٹھے گزارتے، کبھی کسی کے گھر اور کبھی کسی کے۔ یہاں ایک ہی خاندان آباد تھا جن کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی۔ بلدیو کے شریکوں نے ایک سازش کر کے رات سوئے ہوئے کو مار دیا۔ اُنھوں نے اُسے مار کر اپنے آپ کو آزادی دے دی۔ اگلی رات ایک قافلے کی شکل میں وہ یہاں سے چلے گئے۔ بلدیو کی لاش کئی دن چوک میں پڑی رہی۔۔''

''اُس کی بیوی اور بچے؟'' فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''اُن کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں۔ وہ بھی قافلے کے ساتھ ہی چلے گئے ہوں گے۔ شاید بڑے ہو کر اُس کے بیٹے نے بدلہ لیا ہو یا اُسے بھی بدلے کے خوف کی وجہ سے کسی وقت مار دیا گیا ہو۔ یہ تو میری اپنی رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔''

گھر میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ چودھری چارپائی پر بیٹھا، نے ہونٹوں میں دبائے باہر کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا گویا اُسے کسی کے آنے کا انتظار ہو اور فاطمہ سامنے پیڑھی پر بیٹھی کبھی چودھری اور کبھی باہری دروازے کو دیکھتی۔ وہ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، اُنھیں یہ خوف تھا کہ اُن کے بولنے سے سوڈھی گھر کے کسی کونے سے نکل کر سامنے آ جائے گا۔ چودھری نے ڈرتے ڈرتے حقے کا کش لیا اور کن انکھیوں سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ فاطمہ کو وہ حوصلہ اور دانش کی انتہا سمجھنے لگا تھا اور اُس کا اُس کی طرف دیکھنا اپنے آپ کو سہارا دینا تھا بالکل ویسے جیسے بچہ باپ سے ڈر کر ماں کا آنچل تھام لیتا ہے۔ ماں جو اُس وقت خود بچے سے بگڑی ہوئی ہوتی ہے، بچے کی بے بسی دیکھ کر اُسے گود میں لے کر بے ساختہ پیار کرنے لگتی ہے۔ چودھری کو فاطمہ کسی حد تک خائف لگی لیکن اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے خاوند کی طرف ایسے دیکھا جس طرح ماں، باپ سے ڈرے ہوئے بچے کو دیکھتی ہے۔ اُس کی مسکراہٹ میں دلیل اور اپنائیت تھیں، چودھری کو ایسے لگا کہ فاطمہ نے گود میں اُٹھا کر اُسے پیار کیا ہے۔ اُس کا دل اُس بچے کی طرح ہنسنے کو کیا۔ وہ ایک محبت سے بھرپور خفت کے ساتھ مسکراتے ہوئے فاطمہ کو دیکھتا رہا۔

''میں اِس واقع کے متعلق جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے ایسے ہی محسوس ہوتا ہے کہ بلدیو ابھی کسی کونے سے نکل آئے گا۔ اُس کے ہاتھ میں کرپان ہوگی اور وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں اِسی لیے گھر میں اکیلا نہیں سوتا، اُسے کئی لوگوں نے قتل کیے جانے کے بعد چارپائی پر سر پکڑ کر بیٹھے دیکھا

ہے۔ وہ سفید لباس میں ہوتا ہے۔ اب تم نے مجھے اتنا حوصلہ دے دیا ہے کہ میں بلدیو کا مقابلہ کر سکوں۔'' فاطمہ نے جھجک بھری تشکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ چودھری کی طرف دیکھا، اُسے اپنی زندگی کامیاب لگی۔

''چودھری جی! گھروں میں رہتے ہوئے ڈرا نہیں کرتے، یہی قبرستانوں اور گھروں میں فرق ہے۔ اب ہم وہم سے نکلیں؟'' فاطمہ کے سوال سے چودھری گھبرا گیا، اُسے لگا کہ وہ روشنی کو ایک لمحے کے لیے دیکھ کر پھر کھو بیٹھا ہے۔ وہ ڈوبتی ہوئی روشنی میں فاطمہ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش میں تھا کہ وہ اُٹھ کر لالٹین جلانے چلی گئی۔ اُس نے ایک لالٹین والان کے کنڈے کے ساتھ لٹکائی اور دوسری برآمدے کے وچلے پائے کے ساتھ رکھ دی۔ اَب صحن میں روشنی تھی اور چیزوں کے سائے بغیر حرکت کے چھوٹے اور لمبے تھے۔ فاطمہ واپس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ چودھری کو اُس کے چہرے پر سکون کی گرد جمی ہوئی نظر آئی تو وہ بھی کچھ مطمئن سا ہو گیا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' چودھری کی آواز میں تجسس کے ساتھ جھجک بھی تھی۔

''چودھری جی! تم نے کھیتوں کی طرف جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ کامے جانوروں کو اُس طرح پٹھے نہیں ڈالتے، دودھ بھی کم ہو گیا ہے اور جو آتا ہے اُس میں پانی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔'' فاطمہ چودھری کا ردِّعمل دیکھنے کے لیے رُکی تو چودھری نے ایک درد بھری سی آہ لی۔ فاطمہ کو محسوس ہوا کہ چودھری کی اُس آہ میں اُس کی نسلوں کا دکھ سمٹ گیا تھا۔

''تم مجھے اِس سے ملتی جلتی باتیں طعنوں کی صورت کئی مرتبہ کہہ چکی ہو۔ پٹھے ڈلوانا یا دودھ دوہے جانے کی نگرانی کرنا میری شان کے شایاں نہیں۔ ملازم اِسی لیے رکھے ہیں کہ مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' چودھری حقے کا کش لینے کے لیے رُکا تو فاطمہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی بات جاری رکھنے سے روکا۔ اُسی وقت مجاہد بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اُسے گھر کا سنجیدہ اور معتبر سا ماحول جس میں ایک کھچاؤ تھا اچھا لگا۔ وہ ایک پیڑھی لے آیا اور اپنائیت سے فاطمہ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ چودھری کو پہلی مرتبہ مجاہد کا فاطمہ کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ناگوار لگا۔

''چودھری جی! حویلی کا مسئلہ ہم زیرِ بحث نہیں لاتے۔ آپ فصلوں کا تو چکر لگائیں۔ گندم پکنے پر آئی ہوئی ہے، کٹائی اور تھریشر کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ منڈی سے آڑھت کا حساب بھی ہونے والا ہے.....''

''میں نے ایک طویل عرصے تک یہ کام کیا ہے۔ اَب اِسے تم سنبھالو، مجھے لگتا ہے کہ میں ہمت ہار بیٹھا ہوں۔'' چودھری نے روہانسی سی آواز میں فاطمہ کی بات کاٹی، ''میرا مشورہ سمجھو، حکم یا درخواست تصور کرو لیکن اِس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ زمین کا کام تم سنبھال لو۔'' چودھری نے آہستہ آہستہ، سوچتے ہوئے اپنا نقطہ پیش کیا۔

''ہوش میں ہو؟'' فاطمہ کی چیخ سے مجاہد بھی چونک گیا۔ فاطمہ تو ہمیشہ میٹھے لہجے میں دلیل کے ساتھ بات کیا کرتی تھی۔

''فاطمہ! میں تو ڈر ہی گیا۔'' مجاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں جسے ڈرانا چاہتی ہوں وہ پتا نہیں ڈرا ہے کہ نہیں!'' فاطمہ کھسیانی سی تھی۔ اُس نے یہ مصالحتی فقرہ بغیر مقصد کے کہہ دیا تھا، اُس کے چہرے پر سنجیدگی اُسی طرح کھنڈی ہوئی تھی۔

''جلدی ہی مجاہد کو اپنی پڑھائی کے لیے قصبے یا شہر میں جانا ہوگا اور اگلے سال.....'' فاطمہ تھوڑا جھجکی، اُس نے تھوک نگلا اور بات جاری رکھی، ''اور گڈو کو بھی جانا ہے۔ خرچ بڑھ جاتا ہے اُس کے مطابق ہمیں اپنی آمدنی کو بھی بڑھانا ہوگا اور اگر نہیں بڑھانا تو ہم اِنھیں ان پڑھ رکھ لیں۔'' فاطمہ جانتی تھی کہ چودھری کبھی اتفاق نہیں کرے گا اِس لیے اُس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔

''یہ ضرور پڑھیں گے۔''

''کیسے؟'' فاطمہ نے خوشی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے اپنی گردن جھکائے رکھی تاکہ چودھری اُس کی آنکھوں میں کھلتے ہوئے پھول نہ دیکھ سکے۔

''تعلیم سب سے بڑا زیور ہے۔ میں تھوڑی تھوڑی کر کے زمین بیچتا جاؤں گا تاکہ اِن کا خرچہ پورا ہوتا رہے۔ جب یہ پڑھ جائیں گے تو مجھے زمین کی کیا ضرورت ہوگی؟ گاؤں کی زندگی ویسے بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے موافق نہیں ہوتی۔'' چودھری کی آواز میں شکست تھی۔ فاطمہ نے سُن رکھا تھا کہ دس سال پہلے اُن کے گاؤں میں ایک بھینس کی چوری ہوئی تھی۔ وہ پہلی اور آخری چوری تھی جو اِس گاؤں میں ہوئی۔ علاقے میں چودھری کے، تعلقات اور سیاسی طاقت کی وجہ سے، اِتنی دہشت تھی کہ چور ہر طرف وارداتیں کرتے لیکن اِس گاؤں میں نہیں۔ گاؤں کے لوگ اِتنے پُراعتماد تھے کہ سردیوں میں کڑھوں اور گرمیوں میں باکھوں میں اپنے مویشیوں کی حفاظت رکھنے کے بجائے گھروں میں سوتے۔ اردگرد کے چند نوجوانوں نے مل کر ایک ٹولہ بنایا

جو کسی کی عزت کو اہمیت نہیں دیتا تھا اور نہ ہی کسی کو اتنا طاقت ور سمجھتا کہ اُن کی راہ میں حائل ہو سکے۔ پوس کی ایک رات اُنھوں نے گاؤں سے ایک بھینس چوری کی جس کی اطلاع صبح ہوئی۔ پورا گاؤں اکٹھا ہو کر ٹیوے لگا رہا تھا اور اِسی اثنا میں کوئی ساتھ والے گاؤں سے کھوجی کو لینے چلا گیا اور کسی نے چودھری کو اطلاع کر دی۔ چودھری جب چوک میں آیا تو اُسے لوگوں کی نظروں میں الزام نظر آیا۔ ''دیکھو محمد بخشا! یہ چوری تمھاری نہیں میری ہوئی ہے۔ بھینس کی واپسی اور چور کو سزا دلوانا میرا کام ہے۔ کھوجی کو بلایا ہے؟'' اُس نے گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہاں چودھری جی، آدمی گئے ہیں لینے۔'' کسی نے جواب دیا۔ ''ٹھیک! جب کھوجی آئے تو جوان اُس کے ساتھ کھوج پر نکلیں اور محمد بخشا! تم اپنے دوسرے مال کے پٹھے چارے کا بندوبست کرو۔ باقی میرے ذمے۔'' لوگ ایک دبے دبے سے احتجاج، رضامندی، دل چسپی اور عدم دل چسپی کے شور میں منتشر ہو گئے۔ چودھری اُنھیں بکھرتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر خاموشی کے ساتھ دیوان خانے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری کی گھوڑی لائی گئی اور وہ اُس پر بیٹھ کر دھن کی طرف نکل گیا۔

کھرا ابھی لوٹا نہیں تھا کہ چودھری واپس آ گیا لیکن اکیلا نہیں، ایک خستہ حال نوجوان بھینس کو ہانکتے ہوئے لا رہا تھا اور چودھری اُس کے پیچھے تھا۔ چودھری گھوڑی پر بیٹھا رہا اور اُس نے گاؤں کو اکٹھا کرنے کا سدّا بھیجا۔ گاؤں کے لوگ ایک طرح کے جوش اور دل چسپی کے ساتھ چوک میں پہنچ گئے۔ ''محمد بخشا! وہ رہی تمھاری بھینس اور وہ ہے تمھارا چور۔'' چور کو سب جانتے تھے۔ وہ گاؤں میں اکثر آتا رہتا تھا۔ ''چوھر جی! یہ رات میرے گھر آیا اور رات کا کھانا کھا کے گیا۔''، ''بھینس بھی ساتھ لے گیا۔'' کسی نے آواز لگائی۔ ''اِس کا کیا کیا جائے؟'' چودھری نے سوال کیا۔ مجمع ایک دم خاموش ہو گیا اور کھسر پھسر ہونے لگی۔ فیصلہ ہوا کہ اُسے معاف کر دیا جائے، بھینس تو مل گئی تھی۔ چناں چہ گاؤں کے متفقہ فیصلے پر اُسے معاف کر دیا گیا۔

فاطمہ نے سوچا کہ یہ وہی چودھری تھا جو اکیلے، کھرے والوں سے پہلے ہی، چوروں تک پہنچ گیا؛ اُسے دیکھتے ہی دو بھاگ گئے اور ایک کو چودھری نے موقع نہیں دیا اور اب چودھری اِتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ زمین داری کرنے کے بجائے زمین بیچنے کو تیار تھا۔ زمین تو زمیندار کی ماں ہوتی ہے اور اُسے بیچنا تو ماں کو بیچنا ہو گا۔ اُس نے فوری جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

''زمین کے بیچنے کے علاوہ بھی کوئی حل ہو سکتا ہے!'' مجاہد اِس گفتگو میں شامل ہو گیا۔

اُسے باپ کے تھکے ہوئے لہجے سے کوفت ہوئی اور پریشانی بھی۔ وہ اپنے باپ کو ایک باہمت آدمی سمجھتا تھا۔ وہ اُس سے اتنا متاثر اور مرعوب تھا کہ بعض اوقات پیچھے ہاتھ باندھ کر اُس کی طرح چلنے کی کوشش کرتا۔

''تم بتاؤ؟'' چودھری نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ اُس کے لیے اب یہ سوال جواب ایک بے معنی سی مشق ہوتے جا رہے تھے۔ ''یہ زمین میری ہے یا کسی اور کی؟'' اچانک اُس کی آواز میں پرانا دبدبہ لوٹ آیا۔ فاطمہ خوش ہوئی کہ شیراز سرِ نو دھاڑا ہے اور مجاہد پریشان کہ ابا کا غصہ واپس آ گیا ہے۔ اُسے تو راضی بہ رضا باپ ہی وارے میں تھا۔ گڈو بھی پیل پائے کے سائے میں بظاہر کسی کو نظر آئے بغیر بیٹھ گئی تھی۔ اُسے چودھری کی یہ تبدیلی دل چسپ لگی اور پسند بھی آئی کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ اُس کی ماں اور مجاہد، چودھری کے کمزور ہونے کے بعد زیادہ شوخے ہو گئے تھے۔

''میں نے زندگی میں کبھی جوا نہیں کھیلا، میں جوئے کو پسند ہی نہیں کرتا لیکن اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے کھیل رہا ہوں۔ جب مجاہدی پڑھ جائے گا تو کیا یہ گاؤں میں رہے گا؟'' مجاہد کو چودھری نے پہلے کبھی مجاہدی نہیں کہا تھا۔ مجاہد کو ایک دم باپ کی محبت کی اُٹھتی ہوئی لہر میں ڈوبتے ہوئے اپنی سانس بند ہوتے محسوس ہوئی۔ وہ فاطمہ کی ٹیک چھوڑ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''یہ یہاں اِس جہالت میں کیوں رہے گا؟ صرف اِس لیے کہ باپ دادا کا نام چلتا رہے اور یہاں رہتے ہوئے چوریوں اور لڑائیوں کے فیصلے کراتے ہوئے اپنی زندگی گال دے۔ یہ تو میرے جیسے کم پڑھے یا ان پڑھ چودھریوں کا کام ہے۔''

رات کافی گزر چکی تھی اور کسی کو خیال ہی نہیں تھا کہ رات کا کھانا نہ پکا ہے اور نہ ہی کسی نے کھایا ہے۔ یہ مسئلہ خاندان کے لیے زندگی اور موت کے درمیان کھڑی شیشے کی دیوار تھی جس کی کرچیوں کے خوف سے کوئی اُسے توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چودھری ہی آگے بڑھا۔

''اگر یہ زمین رہی تو مجاہد بار بار گاؤں آئے گا اور یہ گاؤں، گھر، یہاں کا ماحول اور اِس نقلی زندگی کی کشش مقناطیس بنی رہے گی۔ میں مجاہد کو اِس قید سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔''

رات کا بھاری پن چودھری کی آواز میں بھی در آیا تھا۔ سرگوشی سے قدرے بلند، اُس کی آواز ایک حکم لگ رہی تھی۔ وہ اُس سپہ سالار کی طرح تھا جو جنگ جیتنے کے لیے واپسی کے ذرائع ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ یہ جوا جیت کر آخری کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بلدیو سنگھ کے گھر میں کوئی

بھی آباد ہونے کو تیار نہیں تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُس نے کسی وقت زندہ ہو کر واپس آ جانا ہے اور چودھری جواب میں کہتا: ہاں وہ میرے ہاتھوں دوبارہ مرنے کے لیے آئے گا۔

''فاطمہ!''

''جی چودھری جی!'' فاطمہ کی آواز میں خوف تھا۔

''مجاہد اور ...... اور گڈو کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی زمین اتنی بچ جائے گی کہ ہم دونوں کو سہارا دیتی جائے گی۔'' چودھری نے کسی حد تک سنجیدگی اور کسی حد تک تمسخر کے ساتھ کہا۔

''جی چودھری!'' اِس مرتبہ فاطمہ کے لہجے میں تحکم تھا۔ ''یا تو زمین پوری کی پوری بکے گی یا ایک مرلہ بھی نہیں۔ اور چودھری دنیا طاقت ور کی ہے۔ تمھاری زمین خریدنے والے ہی تمھارے مخالف ہوتے ہیں جو تم برداشت نہیں کر سکو گے۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' مجاہد نے انگڑائی لیتے ہوئے اپنا خالی پیٹ ملا جس میں سے بادل کی گرج سے مشابہ ایک آواز آئی۔ گڈو دبی دبی سی ہنسی ہنسی تو چودھری نے مڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے ہنسے جا رہی تھی اور چودھری بھی مسکرانے لگا۔

''جھلی! اِدھر آؤ!'' چودھری اُسی طرح مسکراتے ہوئے ہنسے جا رہا تھا، گڈو پاس آئی تو چودھری نے پیار کے ساتھ اُس کا سر تھپتھپا کر اپنے پائنتی بٹھا لیا۔

''تم سب بیٹھو، میں کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔'' فاطمہ خجالت سے ہنستے ہوئے اُٹھی اور کاڑھنی کی طرف چل پڑی۔ ''مجھے روز کے وقت پر جاگ لگانا یاد نہیں رہا۔'' وہ کاڑھنی کی طرف جاتے ہوئے اچانک رُک کر برآمدے میں گئی اور وہاں سے جاگ والا پیالہ اُٹھا لائی۔ اُس نے دعائیں بُڑبُڑاتے ہوئے چولی میں دہی بھر کر کاڑھنی میں دودھ پر چھنا دیا اور کوٹھری میں جا کر شکر والا مرتبان اُٹھا لائی۔

''گڈو!'' اُس نے برآمدے میں سے آواز دی۔ ''بڑے والی رکابیاں لے آؤ اور مجاہد کے لیے چمچ بھی لے آنا۔''

برآمدے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا جو چودھری نے بعد میں بنوایا۔ یہ عجب طرح کا بے ڈھنگا سا کمرہ تھا، لمبا اور کسی تعمیراتی حسن کے بغیر۔ اُس میں نلکا تھا اور بارش کے دنوں اور سردیوں میں استعمال کرنے کے لیے باورچی خانہ۔ وہاں دیواروں کے ساتھ برتنوں کے لیے

پر چھتیاں بنائی گئی تھیں جہاں استعمال کے بھانڈے رکھے ہوتے۔ کمرے کی بناوٹ کی وجہ سے گڈورات کو اُس کمرے میں جانے سے ڈرا کرتی تھی، وہ تھوڑا جھجکی اور پھر اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے اُٹھی اور پیل پائے کے پاس سے لالٹین اُٹھا کر رکابیاں لینے چلی گئی۔

''زمین بیچنا شروع کردوں؟'' چودھری نے رازداری سے پوچھا، ''میں اب اُس کا اکیلا مالک نہیں ہوں۔''

مجاہد دالان کے دروازے کی کنڈی کے ساتھ لٹکتی لالٹین کو دیکھنے لگا، اُس کا ذہن صحن میں پھیلے اندھیرے اور اُجالے کی طرح تھا۔ اُسے چودھری سے اتفاق تھا اور نہیں بھی تھا، زمین اگر نہ بِکی گئی تو اُس کے پاس امکانات رہیں گے اور اگر بِک گئی تو ختم ہو جائیں گے۔ اُس کے پاس تعلیم سب سے بڑا امکان تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرے گا، اُسے زمین کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ کھیتوں کی وٹوں، واہنوں، بوہلوں، کدوؤں اور وتر کی تصدیق کے لیے کیوں مارا مارا پھرے؟ وہ شہر میں رہتے ہوئے ایک ایسی زندگی گزارے گا جس میں ایک ترتیب ہوگی جس کا اُس کے باپ کی زندگی میں فقدان ہے۔ گاؤں میں زندگی موسموں کی مرہونِ منت ہے: زیادہ بارش نقصان دہ اور کم بارش بھی، زیادہ سردی نقصان دہ تو زیادہ گرمی بھی۔ اُس نے جن بڑے لوگوں کے متعلق اپنی کتابوں میں پڑھا تھا وہ تمام زندگی کو ایک چیلنج سمجھتے تھے۔ گاؤں میں زندگی کوئی چیلنج پیش نہیں کرتی، یہاں ایک ہی معمول کئی کئی سال چلتا ہے۔

''بیچ دیں۔ میں زمین بنوں گا۔'' مجاہد نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ چودھری نے ایک لمحے کے لیے اُسے دیکھا، اُس ایک نظر میں اُس کے باپ، دادا، پردادا اور اُن سے پہلے کی کئی نسلیں مجاہد کو پرکھ رہی تھیں کہ کیا وہ سب کر سکتا ہے جس کا دعویٰ کر رہا ہے؟ چودھری نے آنکھیں بند کر کے اُن سب کو وہاں سے واپس اپنے اندر کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

''یہ زمین صدیوں سے میرے خاندان کی پہچان رہی ہے۔ اِس کی جدائی کو برداشت کرنا اتنا آسان کام نہیں اور شاید اِسے بھلانے میں میری دو نسلیں لگیں۔ مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔'' چودھری کی آواز میں دکھ تھا لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے سوچا زمین اب اُس کے لیے غیر اہم تھی، وہ اُس کا سہارا اور پہچان رہی تھی اور اِسی زمین کے بل بوتے پر وہ اپنے باپ اور دادا کا نام روشن رکھے ہوئے تھے۔ کیا وہ بھی زمین کی پہچان رہا تھا؟ نہیں، وہ تو اِس کے

گماشتوں کی طرح تھا، وہی کیا جو وہ چاہتی تھی۔ کسی سال اگر فصل کم ہوئی تو وہ اُس کی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتا تھا اور اگر اُس نے محنت اور زرعی دانش سے اچھی فصل حاصل کر لی تو اُسے اُس کی کامیابی سمجھا جانے کے بجائے خدا کی برکت کہا جاتا ہے۔ وہ اکثر سوچتا کہ اُس کی اپنی ذات کہاں ہے؟ زمین بیچ کر کیا وہ اپنی انا کو تسکین دے دے گا؟ ویسے بھی کسی خاندان کا مستقبل دیہات کے بجائے شہر میں ہے۔ لوگوں کا گاؤں میں دم گھٹنے لگا ہے، یہاں اُنھیں وہ مواقع میسر نہیں جو شہر میں ہیں۔ عام آدمی کے لیے آتھری بن کے زندگی گزارنا یا کھیت مزدور بننا اب کوئی مستقبل نہیں رہا۔ اِن مزدوریوں کا معاوضہ اُنھیں صرف جنس کی شکل میں ملتا ہے اور اگر کبھی نقد رقم کی ضرورت پڑی تو زمین دار سے اُدھار پکڑنا پڑتا ہے جو اُس کی جنس میں سے منہا کر لیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرح سے زمین دار کے غلام ہوتے ہیں اور اب اُن میں اس غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا احساس پیدا ہو رہا ہے اور وہ شہر کا رخ کرنے لگے ہیں۔ اُس جیسے زمین دار بھی شہروں میں ٹھکانے بنانے لگے ہیں، اُنھیں صنعت اور کاروبار میں زیادہ امکانات نظر آ رہے ہیں۔ اُس کا اپنا نقطہء نظر قدرے مختلف بن گیا ہے؛ وہ مجاہد کو ایک افسر بنانا چاہتا ہے۔ وہ اگر پولیس کا افسر بن گیا یا کہیں ڈپٹی کمشنر لگ گیا تو زمین کے سو مربعے بھی شاید اُن عہدوں اور رتبوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ وہ مجاہد کو ایک افسر سمجھ بیٹھا اور اُسے خیال آیا کہ زمین دار کے لیے ایک افسر کی جھلک دیکھنا بھی عید کا چاند دیکھنے سے زیادہ خوشی کا باعث ہوتا ہے اور جب مجاہد افسر بنے گا تو؟ سارا علاقہ کہے گا: اپنا خاص افسر ہے۔ اِس کے باپ دادا کی زمینیں ہماری زمین کے ساتھ لگا کرتی تھیں۔ اُس کے باپ نے اُسے پڑھانے کے لیے زمین بیچنا شروع کر دی۔ پتا نہیں قدرت کا کیا کھیل تھا، جس جس نے بھی زمین خریدی، سکھی بس نہیں سکا اور اِس کا بیٹا پڑھتے پڑھتے آج دیکھو کتنا بڑا افسر ہے۔

"ابا کیا سوچ رہے ہو؟"

اُس نے چودھری کے خواب کے دھاگے کو درمیان میں سے توڑا تو چودھری نے بے یقینی اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ کہیں دور نکل گیا تھا!"

فاطمہ نے چولہا جلا کر سوئیاں اُبال لی تھیں۔ وہ دیگچی کو چودھری اور مجاہد کے پاس رکھ کر بھڑولی کی طرف جا کر کاڑھنی اُٹھا لائی۔ کاڑھنی کے بوجھ سے اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور چند قدم کا فاصلہ اُس نے تیزی کے ساتھ طے کیا۔ کاڑھنی چودھری اور مجاہد کے پاس رکھ کر اُس نے کمر سیدھی کی اور ایک لمبی سانس لے کر مسکرائی۔ چودھری اُسے دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کی پہلی بیوی نے گھر پر اپنی موجودگی، دبدبے اور زبان سے قبضہ کر رکھا تھا اور کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی، یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا کہ گھر میں اُسے کوئی یاد بھی نہیں کرے گا! کیا دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو موجود ہو وہی سب کچھ ہے اور جو چلا گیا اُسے بھلا دیا جائے۔ مجاہد نے کبھی اپنی ماں کا اِس طرح ذکر نہیں کیا جیسے سگی ماں کی محرومی کا کیا جاتا ہے۔ اُسے تو آج بھی اپنی ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے اور ایک مجاہد ہے کہ فاطمہ نے اُسے سگی ماں ہی بھلا دی۔ ایسا کبھی ہوا نہیں۔ یہ فاطمہ کا کمال تھا کہ اُس نے گھر کے ہر فرد کی ضرورت کا خیال رکھا اور اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اُس کے دل کی گہرائی میں اپنا نقش بنا دے۔ اُسے یہ مقام تعمیر کرتے ہوئے کافی حوصلہ دکھانا پڑا تھا اور وہ ثابت قدم رہی۔ اب وہ نہ صرف گھر پر، اُن کی زندگیوں پر بھی قبضہ کر چکی تھی۔

گڈو نے رکابیاں لا کر فاطمہ کے آگے رکھ دیں جس نے اب ہر رکابی میں سوئیاں ڈالیں اور اُن پر شکر ڈالی۔

''اب یہ نہ دودھ ہے اور نہ دہی۔ یہ کڑھا ہوا دودھ اور اِسی طرح دہی کی کچھ کچی قسم۔'' اُس نے ایک پیالے سے ہر رکابی میں جاگ لگا دودھ ڈال کر ایک چودھری اور دوسری مجاہد کے سامنے رکھی۔ مجاہد کو اُس نے چمچ تھمایا جس سے وہ کھانے لگا اور چودھری انگلیوں سے لقمے بنا کر جب کہ فاطمہ اور گڈو بھی اِسی طرح کھانے لگیں۔

''شکر نے تو مزا دے دیا۔'' چودھری نے بھرے ہوئے منہ سے کہا۔

''دودھ یاد ہی نے نہیں؟'' مجاہد نے پوچھا۔
''اُس کا اپنا ذائقہ ہے۔ دراصل ہم لوگ شکر کا استعمال بھول چکے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگ کھرے پر جا رہے تھے۔ کھرا آگے ہی چلتا جا رہا تھا۔''
''آپ گاؤں والی چوری کی بات کر رہے ہیں؟'' مجاہد نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں۔ یہ میرے والے میں ہوئی تھی۔ کھرا نتھوسیویا کی طرف جا رہا تھا، سب لوگ کچھ بے چین سے تھے کہ وہاں اُن کا سامنا مرزے جٹ سے ہوگا۔'' چودھری نے ہاتھ اُٹھا کر ہنستے ہوئے باقیوں کو بولنے سے روکا، ''وہ مرزا، صاحباں والا نہیں تھا۔ مجاہد نے شاید اُس کے متعلق سنا ہوگا، وہ ہمارے علاقے کا ایک نامی گرامی چور تھا۔ مجھے شک سا تھا کہ وہ اِس چوری میں ملوث نہیں، میرے اور اُس کے کافی قریبی تعلقات تھے.....''
''آپ اُس سے پتی لیا کرتے تھے؟'' مجاہد بات کر کے خود ہی ہنسنے لگا اور گڈو اُس کی ہنسی کا مذاق اُڑاتے ہوئے ہنسنے لگی۔
''اب بات غور سے سنو.....'' چودھری بھی ہنسنے لگا، ''چناں چہ اُس نے مجھے یقین دلایا ہوا تھا کہ وہ اُس گاؤں میں کبھی واردات نہیں کرے گا جہاں میرا تعلق ہو۔''
''آپ کے تو تقریباً ہر گاؤں میں تعلق ہیں، مرزا خاں تو اِس طرح بھوکا مر جاتا۔'' مجاہد نے چودھری کو خوش کرنے کے لیے کہا۔
''اُس کی مراد ذاتی تعلق سے تھی۔ خیر، کھرا چلتے چلتے نتھوسیویا تک جا کے حافظ آباد کی طرف مُڑ گیا۔ مرزے کو کھرے کی خبر لگ گئی تھی۔ وہ گاؤں کے باہر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم کوئی دس کے قریب لوگ تھے۔ اُس نے ہمیں روک لیا۔ اُس دور میں یہ رواج تھا کہ اِس طرح کھرے والوں کو کھانے یا رات رکھے بغیر آگے جانے نہیں دیتے تھے۔''
''آپ لوگ اِس طرح راتیں بھی باہر گزارتے تھے؟'' مجاہد نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔
''جب کھرا چلتا ہی جائے تو بعض اوقات رات بھی کہیں گزارنا پڑ جاتی تھی۔ میں اِس طرح کبھی باہر نہیں رہا تھا۔ مجھے میرے باپ نے نصیحت کی ہوئی تھی کہ بہت مجبوری کے علاوہ رات

کو گھر سونا ہے۔ میں نے اب تک ارد گرد کے دیہات میں چند راتیں ہی باہر گزاری ہیں۔"
چودھری نے مجاہد کو جواب دینے کے بعد اپنی بات جاری رکھی، "مرزا نے ہمیں روک لیا۔ اُس نے پہلے میرے والوں کو یقین دلایا کہ اُس کا اُن کے ہاں ہونے والی چوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور وہ اپنے طور پر چوروں کا پتا لگانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اُس نے کہا کہ ہم لوگ کھانا کھائے بغیر اُس کے گاؤں سے آگے نہیں جا سکتے۔ یا تو ہم لوگ واپس چلے جائیں اور یا کھانا کھا کر جائیں۔ میں گھوڑی پر تھا، پیدل چلنے والے تھک چکے تھے۔ سب کو حقے کی تازہ واری اور کھانے کی بھی ضرورت تھی۔ ہمارے لیے چار پائیاں بچھ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کھانا آ گیا۔ جانتے ہو کھانا کیا تھا؟" چودھری خاموش ہو گیا۔ سب اپنی اپنی سوئیاں کھانا چھوڑ کر چودھری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "آم کا اچار، شکر، تنور کی موٹی موٹی روٹیاں اور کچی لسی۔ کم از کم مجھے آج تک اُس کھانے جتنا مزا کبھی نہیں آیا۔"

"آج مجھے بھی آپ والا ہی مزا آیا ہے۔ فاطمہ نے چٹکی بجاتے ہی ہمیں ایک نئی طرح کا کھانا کھلا دیا۔" مجاہد نے فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے چودھری کو مخاطب کیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ بس گھبراہٹ میں اور کوئی ایسا کھانا ذہن میں نہیں آ رہا تھا جو جلدی تیار ہو جاتا۔ تمھارا تو بھوک سے پیٹ ڈکرانے لگ پڑا تھا۔" مجاہد اور گنڈو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

فاطمہ چائی اُٹھا کر بھڑولی میں رکھ کے مڑی تو گنڈو جوٹھی رکابیاں اور سوئیوں والی دیگچی اُٹھا کر تکیے والے کمرے میں لے گئی۔ چودھری نے تمباکو کی جان جانچنے کے لیے چھوٹا سا کش لیا، حقہ بجھا نہیں تھا۔ اُس نے لمبا کش لے کر دھواں باہر نکالا، فاطمہ اپنی جگہ واپس آ گئی۔

"چودھری جی! کھانا کھایا جا چکا۔ چلم بھرنے کی ضرورت تو نہیں؟" فاطمہ نے چلم کو ہاتھ لگا کر کوئلوں کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! ابھی اس میں کافی ست ہے۔" چودھری نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم زمین اور اُس سے جڑے ہوئے معاملات کی بات کر رہے تھے۔" فاطمہ نے دھاگہ جوڑتے ہوئے بات شروع کی۔

"جب تم کھانے کے بندوبست میں لگی ہوئی تھیں تو میں نے مجاہد سے اُس کی رائے لی تھی۔" فاطمہ نے تیزی اور کسی حد تک ناپسندیدگی سے پہلے مجاہد اور پھر چودھری کی طرف

دیکھا۔ ''کیا کہا اِس نے؟'' اُس نے باری باری دونوں کی طرف پھر دیکھا۔

''مجاہد نے کہا کہ بیچ دو۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں ہے۔ انھیں قصبے میں داخل کروا دیا جائے۔ میں اِن کے لیے تانگہ بنوا دوں۔ دونوں روزانہ تانگے میں سکول جائیں۔ جب اِن کی جماعت بڑی ہو جائے تو دو ایک ایکڑ بیچ کر کار لے لوں اور قصبے میں چھوٹا سا ایک گھر خرید لوں۔ دونوں کار میں روز شہر جا کر پڑھ آیا کریں۔ شہر میں کرائے کا مکان اور دوسرے اخراجات کافی ہو جایا کرتے ہیں۔ قصبے میں میرا دوسرے تیسرے دن چکر لگتے رہنا ہے اور تم بھی ایک آدھ رات رہ آیا کرو گی۔''

''اِن کے پاس کون ہوگا؟'' فاطمہ نے چودھری کی بات سے نہ اتفاق کیا اور نہ ہی اختلاف۔

''غفور!''

''اُس کا اپنا یہاں کام ہے، کیا وہ چلا جائے گا؟''

''اُس کی کون سی ٹیکسٹائل مِل ہے۔ میں اُس کو گندم، مونجی اور تھوڑی سی ماہانہ نقدی دے دیا کروں گا۔''

''چودھری جی! اب جنس پر زیادہ انحصار نہیں کرنا۔ اگر ہم نے زمین بیچتے جانا ہے تو ہمارے حصے کی جنس بھی کم ہوتی جائے گی۔'' فاطمہ نے چودھری کو عملی مشکل سے آگاہ کیا۔

''فاطمہ! میں کتنے لوگوں کو ششماہی جنس دیتا ہوں، اُن سے بغیر کوئی کام لیے۔''

''آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا!'' فاطمہ کی آواز میں شکایت تھی۔

''جن لوگوں کو میں ششماہی دے رہا ہوں اُن کے لیے یہ پہلے سے ہی طے ہے۔ میرا باپ اُن لوگوں کو دیا کرتا تھا اور میں نے بند نہیں کیا۔ اب آہستہ آہستہ، کم ضرورت مند کو دینا بند کرتے جائیں گے۔''

فاطمہ نے ایک بار پھر چلم کو محسوس کیا اور اُسے لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نے آپ کو پینے کے لیے دودھ نہیں دیا۔ آپ سارے دن کا کڑھا ہوا دودھ پی چکے ہو۔''

''اگر تم پوچھتیں تو بھی میں نے انکار کر دینا تھا۔'' مجاہد نے جواب دیا۔

فاطمہ تھوڑی دیر کے بعد چلم لے آئی۔

''آپ مکان دیکھنا شروع کریں۔''

''کون سی جلدی ہے۔'' چودھری نے ستے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

''فوری جلدی تو نہیں مگر جلدی ہے۔ گھر کون سا منٹوں سکنڈوں میں خریدا جاتا ہے، کچھ وقت لگ جاتا ہے اور اگر کوئی مناسب گھر مل گیا تو تانگے میں روزانہ کے سفر کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''کار کون چلایا کرے گا؟'' مجاہد نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کسی ٹیکسی ڈرائیور سے ٹیکسی چھڑوالوں گا۔ اُسے تو تنخواہ چاہیے۔''

''قابلِ اعتبار آدمی نظر میں ہے؟'' فاطمہ کی آواز میں پریشانی تھی۔

''کئی آدمی ہیں۔''

''تانگے کا تو کل سے پتا کرنا شروع کریں۔'' فاطمہ نے پھر چودھری کو دھکیلا۔

''ہو جائے گا۔'' چودھری نے لاتعلقی سے جواب دیا۔ وہ ایک کش لے کر مجاہد اور گڈو کی طرف مڑا، ''تم دونوں کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟''

گڈو نے نفی میں سر ہلایا جو کسی کو نظر نہیں آیا۔ مجاہد نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد اپنی رائے دی: ''بارش میں کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔''

''بارشوں میں سواریاں تو چلتی رہتی ہیں، تم لوگوں کو تانگہ بھی سکول پہنچایا کرے گا۔''

''اب سونے کا وقت تو نکل گیا ہے لیکن سونا تو ہے ہی۔ گڈو چارپائیاں لا کر اُن پر بستر بچھاؤ۔'' فاطمہ نے حکم دیا۔ گڈو برآمدے میں سے تین چارپائیاں ایک ایک کر کے اُٹھا لائی اور اُنھیں ایک قطار میں بچھا کر دالان سے بستر لا کر اُن پر بچھا دیے۔

''مجاہد!''

''ہاں......جی!'' مجاہد نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

''ایک لالٹین بجھا دو اور دوسری کی بتی چھوٹی کر کے دالان کی کھڑکی میں رکھ آؤ۔''

صحن میں اندھیرا ہو گیا اور سب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

چودھری کے لیے زمین بیچنا اتنا آسان کام نہیں تھا جتنا بیچنے کا منصوبہ بنانا۔ وہ تو اِس تمام رقبے کا مالک کم اور سرپرست اور محافظ زیادہ تھا، اُس کے فرائض میں اِسے بیچنا نہیں سنبھالنا تھا۔ اُس کے باپ نے زمین کی حفاظت کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سکھوں کے جتھوں سے جنگ کی اور آبادکاری کے عمل میں اُتنی ہی زمین لی جو اُس کے زیرِ کاشت تھی، وہ زمین جو اُس کی ملکیت ہونے کے باوجود اُسے اناج نہیں دیتی تھی، قبول نہیں کی۔ وہ اِس زمین کو اِس طرح اپنے ساتھ لگا کے بیٹھا رہا جیسے آندھی میں بھوکی اور بیمار ماں بچے کو ساتھ چمٹائے رہے۔ فاطمہ نے بھی ٹھیک کہا تھا کہ زمین تو ماں کی طرح ہوتی ہے۔ اَب زندگی کی پیچیدگیاں بڑھ گئی تھیں، اُس کے باپ کے زمانے میں زمین ایک دکھاوا زیادہ اور معاشی اکائی کم تھی۔ اب زمین آہستہ آہستہ اپنی معاشی قدر بھی سامنے لا رہی تھی اور آبادی کے بڑھنے کے ساتھ جنس کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر زمین دار یا کاشت کار گنا ضرور بیجا کرتا تھا اور یہ صرف گھر کی ضرورت کے لیے میٹھا بنانے اور مویشیوں کو گڑ دینے کے لیے بیجا جاتا تھا۔ اب جب شوگر ملیں بن گئی تھیں تو لوگ اپنے بیلنے چلانے میں اتنی دل چسپی نہیں رکھتے تھے، اُنھیں ملوں میں کماد بیچنے میں زیادہ فائدہ تھا اور بعض اوقات گندم بھی کم بیجی جاتی۔ کاشت کاری میں معاشیات زیادہ اہم ہو گئی تھیں اور زمین ایک صنعت بنتی جا رہی تھی اِسی لیے صنعت کاروں نے بھی زرعی رقبے خریدنا شروع کر دیے تھے اور وہ اپنے پیداواری اصول کے تحت چھوٹے زمین دار کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چھوٹا زمیندار جو زراعت کا ایک دیرینہ خادم تھا اب خطرے کی زد پر تھا۔ صنعت کار جس کے پاس زراعت کو مشینی سہولت فراہم کرنے کے ذرائع تھے، وہ اِن مشینوں اور دوسری مشینوں سے تیار ہونے والی ایسی اشیا جو زراعت میں استعمال ہو سکتی ہیں..... مثلاً مصنوعی کھادیں..... اِس طرح مہنگی کیے جا رہے تھے کہ وہ اکثریت کے بس سے باہر ہو جائیں۔

چودھری نے زمین بیچنے کا فیصلہ کر کے اپنے آپ کو کئی اُلجھنوں میں ڈال لیا تھا۔ وہ

اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے زمین بیچنا چاہتا تھا لیکن اپنے خاندان کے ماضی کی طاقت کو برقرار بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا باپ انگریز کے وقت میں اپنے علاقے کا اہم زمین دار تھا۔ گرد و نواح کے مسائل کو حل کرتے ہوئے انگریز ہمیشہ اُس کی رائے کو اہمیت دیتا اور لوگ اِس حقیقت سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ اُس کو اپنا سربراہ بھی تصور کرتے تھے۔ اُس کے باپ کے دیوان خانے میں ہمیشہ چار پائیاں بچھی ہوتیں، لوگ بیٹھے باتوں میں مصروف ہوتے، بیچواں حقے گردش میں ہوتے، لسی کے ڈوہنوں میں سے ایک ملازم ہر وقت کسی نہ کسی کو لسی پلا رہا ہوتا اور اُس کا باپ کسی نہ کسی کے ساتھ گاؤں یا علاقے کے کسی مسئلے پر بات چیت کر رہا ہوتا۔ کھانے کے وقت پر جو کوئی کھانا چاہتا اُس کے لیے گھر سے فوری طور پر کھانا آ جاتا۔ وہ خود کھانا ہمیشہ گھر جا کر کھاتا۔ ہر رات چند مہمان دیوان خانے میں سوتے، اُن کی خاطر مدارت کے لیے ایک ملازم یا کمی وہاں حاضر ہوتا۔ وہ خود سورج غروب ہوتے ہی گھر چلا جاتا اور اگلے دن ناشتے کے بعد گھر سے آتا۔ تب تک مہمان ناشتہ کر چکے ہوتے اور جنھوں نے اپنے سفر پر نکلنا ہوتا وہ جا چکے ہوتے۔ اُس کا دستور تھا کہ آنے والے سے کبھی آنے کا مقصد نہیں پوچھتا تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا کہ کتنے دن ٹھہرنا ہے۔ گھر میں اُس کی بیوی اور رشتے کی ایک خالہ گاؤں کی چند عورتوں کے ساتھ، جو اُن سے اپنے وقت اور کام کے بدلے میں جنس لیتی تھیں، سارا دن چولھے کے آگے گزارتیں۔ حویلی میں بالن اور من چھٹی کو سال بھر کے لیے ایک طرف محفوظ کر دیا جاتا اور ہر صبح ایک کاما اُس دن کی ضرورت کے مطابق لکڑی اور من چھٹی گھر پہنچا دیتا۔ ہفتے میں ایک دن خراس پر گندم پیسی جاتی اور اُس سے ایک دن پہلے چھین کیا جاتا۔

گھر کی دونوں عورتیں اپنے تھکا دینے والے معمول سے تنگ تھیں لیکن اِس کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ جس دن مہمان کم آتے اُنھیں اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈنا پڑتی جو کہ بہت کم ہوتا۔ اُس دن وہ اپنے بالوں میں کچی گھانی کے تیل کی مالش کرواتیں، لیکھوں کے لیے لکڑی کے باریک کنگھے کو جلد کے ساتھ رگڑ کر پھرواتیں، نائین کو بلوا کر پیروں اور ہاتھوں کے ناخن ترشواتیں اور کھٹی لسی سے بال دھو کر ولایتی صابن سے نہاتیں ورنہ دن کے معمول میں اُن کا کسی وقت تاری لگا نا ہی نہانا ہوتا۔

خالہ بیوہ تھی اور اُس کا بڑے چودھری کے علاوہ دنیا میں کوئی اور نہیں تھا۔ اُس کی بیوی

گاؤں کے ایک دور کے رشتے دار کی بیٹی تھی جو بیاہی آنے کے بعد اپنے والدین کے گھر غمی خوشی میں بھی نہیں گئی تھی۔ خالہ کو ہمیشہ فکر رہتی کہ جس رفتار سے گھر میں اناج ضائع ہو رہا ہے، شاید ایک وقت ایسا آئے کہ کھانے کے لیے بھی نہ بچے۔ وہ ہمیشہ کہتی:

''محمد مالک! اپنے خرچ کو سنبھال۔ لوگ تمھیں ملنے کے لیے نہیں آتے، اُن کے آنے کا مقصد تمھیں غریب کرنا ہے۔ جنس کا حساب رکھ اور گھر کے بھڑولوں کو اِس طرح نکو نک مت بھر۔ زیادہ جنس منڈی بھیجا کر......''

محمد مالک فوراً قہقہہ لگا کر اُسے روک دیتا۔ اُس کی آواز میں محبت اور دل چسپی ہوتی، ''ماسی! مولا نے مجھے بہت دیا ہے۔ میں اگر بانٹنا شروع کروں تو بھی ختم نہیں ہوگا۔''

ماسی غصے میں آجاتی، اُس کے نتھنے پھول جاتے، ''پتر نہیں۔ وہ دیتا ہے تو اُس کے دینے کی بے حرمتی نہیں کرتے۔'' محمد مالک کی بیوی کو دخل دینے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ خاموش نظر سے ماسی کو اکساتی رہتی۔ ماسی کا غصہ اور بڑھ جاتا، ''اِس بے زبان کا ہی کچھ پاس رکھ۔'' وہ محمد مالک کی بیوی کی طرف اشارہ کرتی اور پھر اچانک خاموش ہو جاتی۔ محمد مالک کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے اور ابھی تک اُس کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ تھوڑا خوف زدہ ہو گئی کہ محمد مالک اُس کی بات کا کوئی اور مطلب نہ نکال بیٹھے، اُس نے اپنے کہے کو اور رنگ دینا شروع کر دیا، ''مسلمان تو آکر کھاتے ہیں ہمارے برتنوں میں لیکن دوسرے مذہب والوں کو کیوں کھلاتے ہو؟ لوگوں کے لیے جانور ذبح ہوتا ہے، جھٹکا کیا جاتا ہے اور بھاجی ترکاری بھی بنتی ہے۔ جس کا جتنے دن جی کرے ٹھہرتا ہے۔ تمھیں ملتا کیا ہے؟''

''ماسی! میری بات غور سے سنو۔'' محمد مالک کی آواز میں پیار بھری سختی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہوا تھا، وہ سوچتا کہ اُس نے ماسی کو صرف اِس لیے گھر میں رکھا ہوا تھا کہ وہ کہیں اور جا نہیں سکتی تھی۔ ''اگر میں یہ نہ کروں تو مجھے کون جانے گا۔ یہی چودھراہٹ ہے، لوگ آتے ہیں، اپنے معاملات اور مسائل پر میرے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ انگریز تک یہ بات جاتی ہے، وہ مجھے علاقے کا اِسی لیے سردار مانتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔'' محمد مالک نے ماسی کو سمجھایا۔ ماسی خاموشی سے، بے یقینی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ محمد مالک کی بیوی نے پیڑھی پر جگہ بدلی۔ وہ دونوں اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے جھینپ کر منہ ٹانگوں

میں چھپالیا۔ وہ اِس گفتگو میں شامل ہونا چاہتی تھی، وہ ماسی کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ چھوٹے گھر سے آئی ہے۔ اُس کے گھر میں صرف ایک وقت کا کھانا تھا اور یہاں چودھری کے پاس اتنا تھا کہ ہر روز گوشت، دالیں اور سبزیاں بنتی ہیں۔ وہ کھاتی تو کم ہے لیکن اتنے پکوان دیکھ کر اُسے سکون ملتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ وہ کبھی بھوکی ہی نہیں تھی حالانکہ بھوک اُس کی پسلیوں میں گھر کیے ہوئے تھی۔ اُس کی زبان کو تالا لگا ہوا تھا۔ محمد مالک نے اُسے کبھی اُس کے ماضی کی غربت کا احساس نہیں دلایا تھا لیکن اُس نے اُسے اپنی زندگی کا حصہ بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ، محمد مالک کے گھر میں بے شمار غیر ضروری چیزوں میں سے ایک تھی۔

''ماسی! میں چودھری کا بیٹا ہوں اور چودھری ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنا گھر کھلائے بنا کوئی چودھری نہیں بن سکتا اور نہ ہی کہلا سکتا ہے۔'' محمد مالک نے گفتگو کا اختتام دیا۔ وہ ماسی کی نصیحتوں کا عادی ہو چلا تھا، اُسے اُس کا خلوص اور محبت پسند بھی تھے۔ کئی دفعہ اُسے محسوس ہوتا کہ ماسی کی باتوں میں کسی حد تک سچائی بھی ہوتی ہے لیکن اُس نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ گرد و نواح میں اپنے سے بڑا چودھری کوئی نہیں بننے دینا۔ وہ اپنی اِس سوچ کی تکمیل کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار تھا۔ وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا اور اُس کی دریادلی کے آگے کوئی ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ ہر کوئی اُس سے خائف تھا اور یہی خوف مخالفوں کو دوستوں میں تبدیل کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دوستی دراصل ایک پھسلن تھی اور اگر وہ اِس پر چلتے ہوئے ذرا بھی پھسلا تو نیچے کی طرف پھسلتا ہی چلا جائے گا۔ اُس نے طے کیا ہوا تھا کہ اُس نے گیلی زمین پر کبھی پاؤں نہیں رکھنا۔''

محمد مالک رات کو چھت پر سوتا۔ اُس نے اپنے لیے ایک چوبارہ تعمیر کروایا ہوا تھا جس میں وہ سردیوں کی راتوں میں سوتا۔ رات کے کام سے فارغ ہو کر اُس کی بیوی بھی چھت پر آ جاتی۔ شادی کے بعد سے دونوں رات کو کبھی الگ نہیں سوئے تھے، سوائے اُن راتوں کے جب محمد مالک کو شہر جانا ہوتا۔ اُس کی کہیں رشتے داری نہیں تھی۔ ماسی بیوہ تھی اور اُس کے بچے نہیں تھے۔ اپنے سسرال وہ کبھی نہیں گیا تھا اور اگر جانا بھی پڑ جاتا تو وہاں رات کو ٹھہرنے کا تُک نہیں تھا، اُن کا گھر اُس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اُس کی بیوی رات گئے تک اِس طرح باتیں کرتی کہ نیچے لیٹی ہوئی ماسی تک آواز نہ پہنچ پائے۔ محمد مالک بھی اُس کی باتیں غور سے سنتا۔ وہ محمد مالک کو گاؤں میں ہونے والے ہر واقعہ کو عورتوں کے نقطۂ نظر سے بتاتی جو اُس کے لیے دل چسپ اور ایک اہم اطلاع ہوتا۔ وہ دیر تک ایسی باتوں میں مشغول رہتے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی، لگتا تھا کہ دونوں اُس موضوع کو چھیڑنے سے خائف ہیں۔

ایک دن محمد مالک ناشتہ کر کے چلا گیا تو اُس کی بیوی نے شرماتے ہوئے ماسی کو اپنی حالت کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو ماسی کو سمجھ نہ آئی اور پھر وہ اُسی جگہ نفل ادا کرنے کے لیے سجدے میں چلی گئی۔ نفل ادا کرنے کے بعد اُس نے تصدیق چاہی:

''سچ نی ہاجرہ؟ کڑیے سچ'' اُس کی آواز میں خوشی اور ایک خوف تھا۔ وہ جو سُن چکی تھی وہی دوبارہ سننا چاہتی تھی۔ اُس نے ایک دم سوچا کہ جو اُس نے سنا ہے کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہ ہو؟ ہاجرہ اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر خوف زدہ سی ہوگئی۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں کوئی غلط قدم تو نہیں اُٹھایا گیا؟ اگر یہ غلط قدم تھا تو ماسی سجدے میں کیوں گئی؟ اُس نے اپنے آپ کو مجتمع کیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر پھیلتی گئی۔ اب اُس کے چہرے پر خوشی اور غرور بکھر گیا تھا۔ اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پہلے اُس کے قہقہے میں ایک خوف سا ہوا کرتا تھی، اُس کی ہر ہنسی گھٹی گھٹی سی رہی تھی۔

''ہاں ماسی!'' اُس نے خوشی میں لپٹی ہوئی سرگوشی میں کہا۔

''خیرات دو۔'' ماسی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے وہاں کسی کو مخاطب کیا اور پھر کوٹھڑی میں سے ایک تھال اُٹھالائی جو اُس نے ہاجرہ کو دیا۔

''یہ گندم سے بھر لاؤ۔ میں ڈیوڑھی میں کسی ضرورت مند کا گلی میں سے گزرنے کا انتظار کرتی ہوں۔''

ہاجرہ شام تک گندم سے بھرے تھال لوگوں کی جھولیوں اور صافوں میں ڈالتی رہی۔ اُس کی طبیعت کچھ سی ہو رہی تھی، اُسے تھکاوٹ کا بھی احساس تھا لیکن وہ ماسی کی ہر آواز پر تھال لے کر جاتی رہی۔ اُسے یہ خبر محمد مالک کو سنانے کا انتظار تھا اور اُسے یہ خدشہ تھا کہ وہ اُسے سنا نہیں سکے گی۔ اُنھوں نے ذاتی معاملات پر کبھی بات کی ہی نہیں تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک حصہ وہ جو اُس کا نہیں تھا اور ایک وہ جو اُس کا تھا۔ وہ محمد مالک کی بیوی تھی لیکن اُس کا مقام بیوی والا نہیں تھا، وہ تو اُن عورتوں میں سے ایک تھی جو گھر کے کام کرنے آتی تھیں۔ وہ گھر میں کام کرنے والی عورتوں میں سے ایک تو تھی لیکن رات کو صرف اُسے ہی محمد مالک کا قرب حاصل ہوتا تھا جس کے نتیجے میں وہ آج اتنی خوش تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو کبھی محمد مالک کی بیوی سمجھا ہی نہیں تھا اور آج اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اُس کی بیوی ہے۔ وہ یہ بھی سوچتی کہ اچھا ہی ہوا گر اُسے یہ خبر ماسی بتادے۔

''ہاجرہ کڑیے! جا نہا اور صندوق سے اچھے کپڑے نکال کر پہن۔ آج محمد مالک کو تُو دلہن لگنی چاہیے۔'' ماسی یہ کہہ کر نہانے کے لیے برتنوں میں پانی دیکھنے لگی۔ پانی کم تھا، وہ پھر ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی تاکہ کسی کے ہاتھ جھیر کو پیغام بھیجے کہ پانی کی ایک مشک لا دے۔ گو یہ وقت جھیر کے گھر پر ملنے کا نہیں تھا پھر بھی اُس نے کہیں سے بندوبست تو کرنا تھا۔ گاؤں کے تین گھروں میں کھوئیاں تھیں، اگر جھیر نہ ملا تو کسی ایک کھوئی سے دو ڈوہنیاں بھروالے گی۔ گلی میں سے دو لڑکے گزر رہے تھے۔ اُس نے اُن کو آواز دی: ''وے پترو! ادھر آؤ۔'' دونوں لڑکے اعتماد مگر ناگواری سے چلتے ہوئے اُس کے پاس آن کھڑے ہوئے۔

''ہاں ماسی؟'' اُن میں سے ایک بولا۔

''کون ہو؟'' ماسی نے اُس سے پوچھا۔

''ماسی یہ کھیرو کا پوتا ہے۔'' دوسرے لڑکے نے شرارت سے کہا۔

''میں صدقے۔ میرے بھائی کا پوتا ہے۔ پتر کسی کھوئی سے دو ڈوبے تو بھر کر لا دو۔''

''چودھریوں کے پاس تو قبر بھی نہیں ہونی چاہیے۔'' کھیرو کے پوتے نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

تین اطراف میں کمرے اور درمیان میں کھلا صحن رات کو بعض اوقات ڈراونا لگتا، خاص کر اگر صحن کے وسط میں لگے ہوئے نیم کے درخت کے ساتھ لالٹین نہ لٹک رہی ہوتی۔ ماسی نے گھر میں کام کرنے والی عورتوں کو چھٹی دے دی تھی اور سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے جب محمد مالک آیا تو ماسی نیچے اکیلی تھی، ہاجرہ اپنا سُرخ جوڑا پہن کر چھت پر جا چکی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی، اُسی طرح جیسے شادی کی پہلی رات، فرق صرف اتنا تھا کہ تب وہ خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ اُسے محمد مالک کے سامنے اپنے آپ کو کھولنے کا کوئی خوف نہیں تھا، وہ تو اُس کی شخصیت کا سامنا کرنے سے خائف تھی۔ اُس کی گھبراہٹ کے کئی پہلو تھے۔ وہ جانتی تھی کہ محمد مالک کو اُس کے ہاں حمل ٹھہر جانے کا انتظار تو تھا لیکن اُس نے کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بس ایک دبی دبی سی بات کہتا، جیسے اُس سے کچھ چھپا رہا ہو یا اپنے ہی کسی راز کو سامنے لانا چاہتا ہو۔ وہ نرمی سے، ایک لاتعلق سی اپنائیت سے پوچھتا: ''کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی؟'' پھر وہ اندھیرے میں اپنی نظروں سے اُس کا چہرہ ٹٹولنے لگتا۔ ہاجرہ اپنے چہرے کو سرخ ہوتے محسوس کر سکتی تھی۔ وہ محمد مالک کو اپنے بارور ہونے کے بارے میں بتانا تو چاہتی تھی لیکن اُسے ایک گھبراہٹ روکے ہوئے تھی، وہ محمد مالک سے خائف تھی کہ وہ کہیں یہ ہی نہ کہہ دے کہ اتنی دیر کیوں کر دی؟ وہ محمد مالک کو کیا بتاتی، وہ تو پہلے دن سے ہی چاہتی تھی کہ اُس کے حمل ٹھہر جائے لیکن ٹھہرنے میں پانچ سال لگ گئے۔ اُسے خود بھی شرمندگی تھی۔

ہاجرہ نیچے صحن میں محمد مالک کی آواز سُن سکتی تھی۔ ماسی صحن میں چھوٹے چھوٹے کام کرتی پھر رہی تھی۔ اُسے برتنوں کے ٹکرانے، گلاس میں پانی کے ڈالے جانے اور ماسی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہاجرہ کو انتظار تھا کہ محمد مالک ماسی سے اُس کے متعلق پوچھے۔ وہ نیچے سے آنے والی ہر آواز، سرگوشی یا خاموشی کے وزن میں سے معنی نکالنے کی کوشش میں تھی۔ محمد مالک نے مہمانوں، مسئلوں، فصلوں اور جانوروں کے متعلق باتیں کیں، اُسے ہاجرہ کہیں نظر

نہیں آئی اور نہ ہی اُس نے اپنی بیوی کی کمی کو محسوس کیا۔ ہاجرہ کو آسمان کی کھلی چھت کے نیچے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا، وہ اپنے آپ کو غیر اہم تو سمجھتی ہی تھی، اب اُسے اپنا آپ بے وقعت لگنے لگا۔ وہ صحن کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئی۔ اب اُسے محمد مالک کا انتظار تو نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ محمد مالک آ جائے۔ اُس کے آنے پر وہ محمد مالک کو کیا بتائے گی؟ کیا ظاہر کرے گی کہ سو گئی ہے یا...... سیڑھیوں پر قدموں کی آواز نے اُس کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا اور اپنی گھبراہٹ اور بے بسی سے مجبور ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

محمد مالک نے اُسے ایک نظر دیکھا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ کر معمول کے مطابق جوتوں میں سے پاؤں نکالنے لگا۔ ہاجرہ کو مانوس سا، بو کا ہلکا سا بھبھوکا آیا جو خلافِ معمول آج اُسے ناگوار لگا اور اپنا اندر باہر آتے محسوس ہوا لیکن وہ تھوک کے ساتھ اُسے اندر نگل گئی۔ تھوک نگلتے ہوئے اُس نے ایک طرح سے گھونگھٹ نکال لیا اور ایسے بیٹھ گئی کہ محمد مالک اُسے اچھی طرح سے دیکھ نہ سکے۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے اور پھر محمد مالک نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ماتھا چھوا، اِس لمس نے ہاجرہ کے جسم میں ایک کپکپی دوڑا دی۔ اُس نے ایک دبی سی آہ بھری۔

''تمھاری طبیعت خراب ہے؟'' محمد مالک کی آواز میں معمول کا غرور اور لاتعلقی تھے، ہاجرہ اُس کی آواز میں اپنے لیے پریشانی کا بھاری پن دیکھنا چاہتی تھی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' اُس نے سرگوشی کی۔ وہ محمد مالک کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔

''مجھے شک سا ہوا۔ کیا بات ہے؟'' اُس نے اُسی لہجے میں پوچھا جس میں وہ بُوری بھینس کے دودھ دینا چھوڑ دینے کا بتایا کرتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی، اُسے اپنے متعلق بتاتے ہوئے کسی حد تک جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اپنی آواز سے بھی خوف سا آ رہا تھا۔ اُس کے لیے اپنی کیفیت کا احاطہ کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اُس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور گھونگھٹ میں سے محمد مالک کی طرف دیکھا۔

''میں.....'' وہ ہکلائی، ''میں نہیں آپ باپ بننے والے ہیں۔''

اور اُس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ صبح سے ہی خوف، جھجک اور خوشی کے بوجھ تلے دبی اِن آنسوؤں کو دبائے ہوئے تھی اور اب اچانک اُس کی چھاتی کے اوپر سے یہ بوجھ اُٹھا تو آنسوؤں

نے اپنا راستہ پالیا۔ محمد مالک خاموش سی حیرت کے ساتھ اُسے دیکھتا رہا۔ وہ جب رو کر ہلکی ہوگئی تو ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی، اپنے ہنسنے پر اُسے بھی حیرت ہوئی۔ اُس نے تو آج تک محمد مالک کے سامنے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی۔

''ہاجرہ!'' محمد مالک نے اُسے اپنائیت کے ساتھ بلایا۔ ہاجرہ کو اچانک اپنی اہمیت کا احساس ہوا، اُس نے اپنے آپ کو محفوظ اور ماسی سے زیادہ طاقت ور جانا۔ اُسے یک دم لگا کہ گھر کی مالکن تو وہ ہے اور ماسی کی حیثیت تو ایک کام کرنے والی کی ہے۔

''جی؟'' اُسے اپنے اعتماد پر خود حیرت ہوئی۔

''بیٹے کا نام عبدالرشید رکھنا ہے۔'' محمد مالک کی آواز میں حکم تھا۔

''اگر بیٹا نہ ہوا تو؟'' اُس نے خوف اور بے یقینی کے ساتھ پوچھا۔

''ہمارے بیٹے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے لکھ دیا گیا ہے کہ ہم نے کسی کے آگے گردن نہیں جھکانی۔ ایک اور بات یاد رکھنا، عبدالرشید کی شادی کسی غریب گھر میں کرنا۔'' اگلے لمحے ہی اُسے محمد مالک کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔

ہاجرہ کو اپنے آپ اور اپنی غربت سے نفرت ہونے لگی۔

عبدالرشید، ہاجرہ کے لیے ایک کھلونا بن گیا۔ وہ اُس کے پیٹ میں تھا اور ہاجرہ اُس کے ساتھ باتیں کرتی۔ اُس نے ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا ہوتا جس کے ذریعے وہ اُس کے جواب سنتی۔ ماں، بیٹا بیشتر وقت یہ کھیل کھیلتے رہتے۔ محمد مالک نے اُسے مشورہ دیتے ہوئے حکم دیا تھا کہ وہ راتوں کو نیچے سویا کرے۔ شروع میں تو ہاجرہ کو یہ مشورہ یا حکم اپنی تضحیک لگا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اُسے اِسی میں اپنے لیے ایک بہتری نظر آئی۔ وہ کھلے صحن کے ایک کونے میں چارپائی ڈال کر لیٹی رہتی۔ ماسی نے اُس کے پاس سونے کی خواہش کا اظہار کیا تو ہاجرہ نے شادی کے بعد پہلی بار سخت لہجے میں بات کی اور اُسے خود بھی حیرت ہوئی۔

''ماسی! مجھے اپنی چارپائی کے ساتھ اپنے گھر والے کے علاوہ کسی اور کی چارپائی پسند نہیں۔ دِن ہم ساتھ گزاریں گے لیکن رات نہیں۔''

ماسی نے پہلے حیرت اور پھر صدمے سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بیوہ ہونے کے بعد 'نہیں' سننے کی عادی نہیں رہی تھی اور جب تک وہ اپنے سسرال میں رہی محمد مالک کی حیثیت کے بوجھ نے اُن لوگوں کی گردنوں کا جھکائے رکھا تھا۔ ماسی کی زبان سے جوابی کلمات نکلنے ہی والے تھے کہ اُس نے اپنے مقام کو سمجھتے ہوئے خاموشی کو ترجیح دی۔ اُس نے اپنی زندگی بھی تو گزارنا تھی۔ ماسی کو لگا کہ وہ سولوں کی تیز آندھی میں کھڑی ہے جن کی تیز نوکیں اُس کے جسم کو زخمی کیے جا رہی تھیں۔ درد نے اُس کی آنکھوں میں اپنا پانی بھر دیا جسے اُس نے بہنے سے روک دیا۔ ایک بڑا چودھری اُس کا بھانجا تھا اور ایک غریب کی بیٹی کے سامنے آنسو بہانا اُس کے بھانجے کی شان کے شایاں نہیں تھا!

''ماسی!'' اُسے اپنے کہے ہوئے الفاظ پر پشیمانی نہیں تھی لیکن اب اُس کی آواز میں ایک نرمی آگئی تھی۔ ''مجھے غلط نہ سمجھو۔ میری حالت کچھ ایسی ہے کہ میں .....'' اور وہ بات کرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئی۔

اُس بڑے سارے گھر میں کسی کا کوئی کمرہ نہیں تھا، جہاں کوئی بیٹھ گیا وہ جگہ ہی اُس کی ملکیت تھی۔ محمد مالک نے دیوان خانے میں اپنے لیے ایک غسل خانہ بنوا رکھا تھا جس میں ایک نل لگایا گیا تھا۔ اُس کے لیے ذاتی ملازم دو بالٹیاں پانی کی بھر دیتا اور سردیوں میں نل چلاتا رہتا اور محمد مالک صافا باندھے تازہ اور نکھے پانی سے نہالیتا۔ مہمانوں کے لیے دیوان خانے کے صحن کے ایک کونے میں ٹونٹی بنائی گئی تھی جہاں وہ باری باری نہالیتے جب کہ ایک ملازم چھوٹی سی کھوئی میں سے بوکے نکال نکال کر ٹونٹی کی ٹینکی میں ڈالتا جاتا۔

''ماسی!'' اُس نے دہرایا۔ ''میں رات کو سیڑھیوں کے پاس لیٹا کروں گی۔ تم نیم کے اُس طرف سویا کرو۔ ہمارے بیچ یہ درخت ہونا چاہیے۔''

''نہیں گڑیے! تم سیڑھیوں کے پاس نہیں لیٹو گی۔ تم ایسی حالت میں ہو کہ باہر کی مخلوق تم پر قبضہ کر سکتی ہے۔'' ماسی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ وہ ہاجرہ کو ڈرانا نہیں چاہتی تھی لیکن اُس نے کئی ایسے قصے سن رکھے تھے جن میں اُن لوگوں نے ماں کے اوپر قبضہ جما کر اُس کے بچے کو ضائع کر دیا تھا۔ ہاجرہ نے بھی ایسی کئی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اُسے عبدالرشید خطرے میں محسوس ہوا، اُس نے سیڑھیوں والی جگہ ماسی کے حوالے کر اپنی چارپائی دور ایک کونے میں کر لی۔

نیم کا درخت اُن دونوں کے بیچ میں رہا۔

گھر میں دو بڑے کمرے، دو چھوٹے کمرے اور اِن سے جڑی ہوئی تین کوٹھریاں تھیں۔ ہاجرہ نے اپنے لیے ایک چھوٹا کمرہ منتخب کیا اور اُس میں رہنے لگی۔ وہ اپنا ٹین کا ٹرنک بھی اُسی کمرے میں لے گئی اور ماسی سے کہہ کر دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا آئینہ لٹکا لیا، اِتنا چھوٹا کہ اُسے اُس میں صرف اپنا چہرہ ہی نظر آتا۔ وہ یا تو چارپائی پر لیٹی رہتی، ماسی بھی کام نمٹا کر یا کام کرنے والی عورتوں کو ہدایات دے کے وہاں آ جاتی اور یا اُس چھوٹے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھتی رہتی۔ ماسی اُسے کہتی:

''اپنا چہرہ اتنا نہ دیکھا کر کڑیے، اپنی نظر بھی کھا جاتی ہے۔ عورت کا حسن تو حمل کے شروع میں سجتا ہے۔ تم اِن دنوں شہزادی لگ رہی ہو۔'' ماسی نے پیار اور کسی حد تک فخر سے کہا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مَیں چولھے میں مرچیں وار کر آئی۔'' اور وہ پاؤں گھسیٹتے ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ہاجرہ کو اُس کی بات سچی بھی لگتی۔ وہ جب بھی آئینے کے سامنے جاتی اُسے اپنا چہرہ واقعی ہی کسی اور کا لگتا؛ گالوں کے اوپر اُٹھی ہوئی ہڈی، موٹی آنکھیں اور باریک ہونٹ! اُس نے آئینہ دیکھنے کی شرم سے کبھی آئینہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس نے اگر کبھی اپنا چہرہ دیکھنا ہوتا تو پانی بھری بالٹی میں اپنا عکس دیکھ کر بال درست کر لیتی۔ آئینہ اُس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ ماسی پاؤں گھسیڑتی ہوئی واپس آئی: ''توبہ کڑیے توبہ! اتنی بڑی نظر لگی تھی۔ میرا تو کھانستے ہوئے بُرا حال ہو گیا، آنکھوں سے پانی بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔''

محمد مالک کے ساتھ اُس کا رابطہ کافی کم ہو گیا تھا۔ جب سے وہ بیاہی آئی تھی، محمد مالک سورج غروب ہوتے ہی گھر آ جاتا۔

''مہمانوں کو اِس طرح چھوڑ آنا اچھا اخلاق نہیں لیکن مجھے میرے باپ نے بتایا تھا کہ اُس کا باپ اور دادا سورج غروب ہوتے ہی گھر آ جایا کرتے تھے۔ چودھری کا رات دیر تک دیوان خانے یا بیٹھک میں بیٹھنا اُس کی اہمیت کو کم کرتا ہے۔ راتوں کو گاؤں کے عام لوگ بھی حقے کی واری کے لیے آ جاتے ہیں اور گھٹیا قسم کی بات چیت، فقرے بازی اور بیہودہ سے مذاق چلتے ہیں۔ چودھری کو اپنا مقام قائم رکھنا ہوتا ہے۔ ایک چودھری جب کسی اکٹھ میں جائے تو وہاں خاموشی ہو جانی چاہیے اور تب تک قائم رہنی چاہیے جب تک وہ خود بات کرنا شروع نہ کر دے۔'' ایک رات محمد مالک نے اُن دونوں کو بتایا۔ وہ اُن دنوں کچھ پریشان سا رہنے لگا تھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے چھپنے کی کوشش میں ہو۔ ہاجرہ نے یہ محسوس تو کیا لیکن اُس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا، محمد مالک نے اُسے اپنے کسی مسئلے میں ساجھے داری نہیں دی تھی۔ وہ بھی لاتعلق سی رہی۔ پہلے اُس نے پوچھنے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ اُسے محمد مالک کے لہجے کی مٹھاس میں چھپے غرور سے بعض اوقات خوف آنے لگتا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس نے کیا کہنا ہے؟

عبدالرشید نے اَب ہاجرہ کے جسم میں اپنی حرکت شروع کر دی تھی۔ وہ اُسے اپنے اندر چلتے ہوئے محسوس کر کے خوش ہوتی۔ وہ سوچتی کہ کیا ہی اچھا ہو اگر اُس کی چال اپنے باپ جیسی نکلے۔ محمد مالک چھاتی پھیلا کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے ایسے چلتا جیسے ہر پاؤں رکھنے سے پہلے زمین کی طاقت ناپ رہا ہو۔ اُنہی دنوں میں محمد مالک دیر سے گھر آنے لگا۔ وہ دونوں اُس کے رات کو جلدی گھر آنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اُنھیں محسوس ہوتا کہ گھر میں ایک بھرا نہ جانے والا

خلا پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے اُنھیں اُس کے آنے کا انتظار نہیں ہوتا تھا کیوں کہ اُس کا سورج کے غروب ہونے کے وقت پر آنا معمول کا حصہ تھا، اب وہ انتظار کرنے لگیں۔ اُنھیں گلی میں سے آتی ہر آواز محمد مالک کی لگتی۔ بعض اوقات وہ رات کا کھانا بھی دیوان خانے میں ہی کھاتا۔ ایک رات وہ معمول کے وقت پر گھر آیا، دونوں کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ اُنھیں لگا کہ وہ کبھی دیر سے آیا ہی نہیں تھا۔ ماسی اُس کے گرد کبوتر کی طرح چکر کاٹ رہی تھی اور ہاجرہ اپنے پیٹ کو چھپائے ہوئے اُس کے سامنے پیڑھی پر ایسے بیٹھی تھی کہ جسم کے نچلے حصے پر بوجھ نہ پڑے۔ جب ابتدائی حیرت اور خوشی ختم ہوئی تو ماسی بھی سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"کھانے کا نہیں پوچھوگی؟" اُس نے ہنستے ہوئے دونوں کو کہا۔ ماسی ایک دم اُچھلی، جیسے اُس کے پیروں کے نیچے سانپ آ گیا ہو۔

"ابھی لائی۔" ہاجرہ ڈوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ ماسی نے کچھ شرمندگی اور کچھ مصنوعی ناراضی کے ساتھ ہاجرہ کی طرف دیکھا۔

"تم دونوں کو معلوم ہونا چاہیے۔" محمد مالک نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ چند لمحے پہلے والی خوشی اُس کے لہجے کی مایوسی اور تھکن کے سبب بھک سے اُڑ گئی۔ وہ ایک پل میں ہی کسی اندیشے کے بے نام سے بھاری بوجھ تلے دب گئیں، ہاجرہ کو اپنے جسم کے نچلے حصے پر بوجھ محسوس ہوا، اُس نے پیڑھی پر اپنی جگہ بدلی۔

"ایک بڑا چودھری بننے کے لیے وہ سب جو کم کرنا پڑتے ہیں جو میں نے کیے۔ ماسی مجھے ہمیشہ منع کرتی رہی لیکن میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا تھا۔ گھر بچا کر چودھری نہیں بنا جاتا اور میں نے گھر نہیں بچایا۔ میرے خرچے آمدن سے بڑھتے رہے، میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ میرا یہی خیال تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح حالات کو سنبھال لوں گا جو نہیں ہو سکا۔ ماسی!" اُس کے لہجے میں پرانا غرور آ گیا تھا۔ "کھانا کھا لوں تو مجھے حقہ تازہ کر دینا اور ہاں چلم میں نیچے کوئلے دبا کر بھرنا اور اوپر اُس طرح نہیں۔" ماسی نے حقے میں پانی بھرا اور نَے میں پھونک مار کر پانی نکالا اور پھر ایک کش لیا۔ حقہ ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ اُس پر چلم رکھی جاتی۔ اُس نے پھر ایک پھونک ماری اور کش لیا۔ اب گڑگڑ کی آواز میں گونج تھی۔ وہ چولھے کے آگے بیٹھ کر چلم میں کوئلے رکھنے لگی۔ جب وہ حقہ لے کر آئی تو محمد مالک کھانا ختم کر چکا تھا۔

''میں نے گھر میں کبھی حقہ نہیں پیا۔تم دونوں جانتی ہو۔سارا دن دیوان خانے میں پینے کے بعد رات کو میں اپنے آپ کو،'' وہ دل چسپی کے ساتھ ہنسا،'' بچانا چاہتا ہوں۔آج مجھے اُس کی ضرورت ہے، نشے کے لیے نہیں طاقت کے لیے۔''

ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا کہ محمد مالک گھر آ گیا تھا اور اُس کے آنے کی خوشی میں دونوں دیا اور لالٹین جلانا بھول گئیں تھیں۔اندھیرا گھر کسی آسیب کے قبضے میں لگتا تھا، ہاجرہ کو ہر طرف دائرے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔اُسی وقت عبدالرشید نے ایک تیز حرکت کی، ہاجرہ کو لگا کہ وہ بھی خوف زدہ ہو گیا ہے۔وہ اُسی وقت اپنے پیٹ کو ہلکے ہلکے سے تھاپڑنے لگی جیسے عبدالرشید کو سلا رہی ہو۔محمد مالک جب کش کھنچتا تو چلم کے کوئلے ایسے روشن ہو جاتے جیسے رات کو روشنی پڑنے پر کسی جنگلی جانور کی آنکھیں۔

''میں نے دراصل زمین کی طرف توجہ نہیں دی، کبھی کسی مزارع سے حساب نہیں کیا اور نہ ہی آڑھت پر گیا۔دراصل ایسا کرنا میرے رتبے سے نیچے تھا۔چناں چہ میں آڑھتی سے پکڑ کر خرچ کرتا رہا۔میں خوش تھا کہ کام چل رہا ہے اور وہ بھی خوش.....'' وہ ایک خشک سی تلخ ہنسی ہنسا، ایسے لگ رہا تھا کہ اُس کی ہنسی گلے میں اٹکے خشک کانٹوں سے رگڑ کھا کر آ رہی ہو۔وہ دونوں ایسے دم بخود بیٹھی ہوئی تھیں جیسے اُن پر جادو کر دیا گیا ہو۔''اور وہ بھی خوش کہ اپنے کھاتے میں جو چاہے لکھتا جائے، کس نے پڑتال کرنی ہے۔'' وہ رُکا، اُس نے وسیع گھر میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''کیا بات ہے؟ گھر میں اندھیرا کیوں ہے؟''

ماسی اور ہاجرہ نے شرمندگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ماسی پاؤں گھسیٹتی ہوئی کوٹھری کی طرف چل پڑی۔تھوڑی دیر کے بعد وہ دو لالٹینیں اُٹھائے ہوئے باہر آئی اور اُنھیں مخصوص جگہوں پر رکھ کر دو دیے اُٹھا لائی، ایک کو کچی کوٹھری کی باہر والی دیوار کے آلے میں اور دوسرے کو نیم کے نیچے رکھ کر اپنی پیڑھی پر آن بیٹھی۔اب گھر میں ہلکی سی زرد روشنی پھیل گئی اور وہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھ سکتے تھے، ہر چہرے پر ایک کھچاؤ تھا۔

''آڑھتی خوش تھا کہ میں حساب نہیں لے رہا اور آج اُس نے ساٹھ ہزار میری طرف نکال دیے۔اب مجھے اُسے پیسے واپس کرنے ہیں اور ساٹھ ہزار تو بادشاہوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔''

''پتر! اتنی بڑی رقم!'' ماسی نے جیسے کوئی ڈراونا خواب دیکھ لیا ہو۔ہاجرہ چہرے پر کوئی

تاثر لائے بغیر نظر نیچے کر کے بیٹھی رہی۔ گھر میں اچانک متلاطم سی خاموشی پھیل گئی جو انھیں ڈبوئے جاتی تھی۔ کبھی خاموشی بھاگن کی صبحوں کو گندم کے کھیتوں کے اوپر تیرتی ہوئی دھند کی طرح تھی جو باہر سے تو نظر آتی تھی لیکن اندر داخل ہونے کے بعد باہر کچھ بھی دیکھنے نہیں دیتی تھی اور کبھی ہاڑ کی دوپہروں میں زمین میں سے اُٹھتی ہوئی گرمی کی لہروں کی طرح تھی جو اپنی طرف بڑھتی دکھائی پڑتی ہیں۔

''ہاں ماسی!'' محمد مالک نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''اب کیا ہوگا پتر؟'' ماسی کی آواز میں دُکھ، بے بسی اور محرومی تھی۔

''بے بے کی ٹومبیں بیچوں گا اور اگر پورے نہ ہوئے تو کچھ رقبہ بیچوں گا۔'' بے بے کی ٹومبوں کا سُن کر ماسی کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ محمد مالک نے اِس کپکپی کو دیکھ لیا۔

''یہ ٹومبیں ساری کی ساری بے بے کی نہیں، کچھ میری دادی کی بھی ہیں۔ میں وہی بیچوں گا جو دادی کی ہیں۔ بعد کے کسی وقت میں اِسے بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

ہاجرہ نے سارے زیور دیکھے نہیں تھے، جب اُن کے بیچنے کی بات ہوئی تو اُسے لگا کہ اُس کے کپڑے اُتارے جا رہے ہیں۔ اُس کے خوف کی تصدیق میں عبدالرشید نے بھی اُس کے پیٹ میں جیسے ایک طرح کی دولتی ماری ہو۔ ہاجرہ کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

''ٹومبیں اور زمین بیچنا ضروری ہیں؟'' ہاجرہ کو اپنی آواز پر یقین نہیں آیا، یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی بچہ ماسٹر کو وہ سبق فرفر سنا دے جو ابھی تک پڑھایا ہی نہیں گیا تھا۔ محمد مالک اور ماسی نے بھی چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ہاجرہ نے اُن کے درمیان میں ہونے والی گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا، وہ تو وہاں ایک غیر ضروری، بے جان چیز کی مانند، ایک طرح سے رکھی ہوتی۔

''اِتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ میں نے آڑھتیے کو کہہ دیا ہے کہ جلد پیسے دے دوں گا۔ اِس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں! بنیے سے سود پر لینا اپنے آپ کو برباد کرنا ہوگا۔'' محمد مالک کی آواز میں اب دلیل کا اعتماد اور بھاری پن آ گیا تھا۔

''ہو سکتا ہے!'' ہاجرہ نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ماسی اور محمد مالک نے ایک بار پھر چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''کیسے؟''

''جانور بیچیں۔ کتنے جانور ہیں؟'' اُس کے سوال میں ایک حکم بھی تھا جو محمد مالک ہی

محسوس کر سکا، ماسی کے دماغ نے سوچنا بند کر دیا تھا۔

''دس بڑی بھینسیں، پانچ گائیں، تین گھوڑیاں اور ایک گھوڑا اور ..... ''اُس نے سوچا

''اور پانچ کنیاں۔''

''آپ آٹھ بھینسیں، دو گھوڑیاں، گھوڑا اور تین گائے بیچ دیں۔''

''حویلی خالی ہو جائے گی۔''محمد مالک کی آواز میں دکھ تھا۔

''نہیں! کٹیاں اور وچھیاں ہیں۔ آپ کو پٹھوں کے لیے کم زمین چاہیے ہوگی جس میں آپ جنس کاشت کروا سکیں گے۔''

''جانور تقریباً دس ہزار سے کچھ کم یا زیادہ کے ہو جائیں گے، باقی؟''محمد مالک نے طنز کیا۔

''باقی! ماسی اکثر بتاتی ہے کہ آپ کا باپ ہر روز اپنی زمین کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اُسے اپنے ہر کھیت کی فصل کا پتا ہوتا تھا۔ وہ وٹوں، کونوں، پانی کی واریوں، رہٹوں کے پہیروں اور نوکروں پر ہمیشہ نظر رکھتا۔ آپ تو دیوان خانے سے کبھی اپنی زمین کی طرف گئے ہی نہیں۔'' وہ رُک رُک کر بول رہی تھی۔

''تم چاہتی ہو کہ میں وٹوں اور رواہنوں میں ٹھڈے کھاتا پھروں؟''محمد مالک کچھ برہم سا ہو گیا۔

''ٹھڈے کیوں کھائیں گے؟ آپ گھوڑی پر جایا کریں۔''

''پھر؟''محمد مالک کی آواز میں دل چسپی تھی۔

''اپنی بجریوں اور بوہلوں کا حساب رکھیں، فصل آنے کے دنوں میں روز آڑھتیے کے پاس جائیں۔ ایک ہی ششماہی میں آپ کا قرض ختم ہو سکتا ہے۔''

''تم نے تو بہت آسان کر دیا ہے۔''

''ہے ہی آسان!''ہاجرہ کی آواز میں اعتماد کی مٹھاس تھی!

عبدالرشید نے پوری رات سوتے ہوئے گزاری!

عبدالرشید جب پیدا ہوا تو بھینسوں اور گھوڑے سمیت گھوڑیاں بک چکی تھیں۔ گائیوں کا سودا چل رہا تھا۔ محمد مالک اپنی زمین کے معمول کے چکر پر تھا جب اُسے عبدالرشید کی آمد کی اطلاع ملی۔ اُس نے خبر لانے والے کی طرف حیرت سے دیکھا، جیسے اُسے اس خبر کی توقع ہی نہیں تھی یا اُسے بتانے کی کیا ضرورت تھی، اُسے تو پتا ہی تھا۔ خبر لانے والا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔ محمد مالک نے لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ساتھ ہلکی سی ایڑھی لگا کر گھوڑی کو آگے بڑھا کر اگلے کھیت کی طرف چل پڑا جہاں اُس کا مزارع کسّی لے کر کھیت کی مٹی گوڈ رہا تھا۔

”یہ کھیت درمیان سے تھوڑا اونچا ہے، وہاں پانی نہیں پہنچتا۔ بیج ڈالنے سے پہلے کراہ لگا لینا۔“ مزارع پہلے تو تھوڑا حیران ہوا، پھر کسّی رکھ کر دل چسپی سے ہنسنے لگا۔ ”زمین دار کا بیٹا چاہے جتنا بھی دیوان خانوں میں بیٹھے وہ رہتا زمین دار ہی ہے۔ چودھری اب لوگوں کا خیال تھا کہ تمھیں زمین دارا نہیں آتا اور میں کہا کرتا تھا کہ سیدوں کے منہ ہمیشہ تیز ہوتے ہیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس پٹی کا لک اونچا ہے۔“ اور وہ کسّی پکڑ کر دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا۔

محمد مالک جب دیوان خانے پہنچا تو سارا گاؤں وہاں جمع تھا۔ اُسے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ ماسی کے کہنے پر بکرا ذبح کر دیا گیا تھا اور نمکین اور میٹھے چاولوں کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جب سے بھینسیں بِک گئی تھیں اُس نے اپنے آپ کو چودھری سمجھنا چھوڑ دیا تھا، وہ لوگوں کے ساتھ ملنے سے کترانے لگا تھا۔ سارا گاؤں دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس کی گردن تن گئی اور وہ گھوڑی سے اتر کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے دیوان خانے کی طرف چل پڑا۔ چیچواں جتنے گردش میں تھے اور خوشی میں ڈوبی باتوں کی دھیمی سی بھنبھناہٹ نے اُس کا استقبال کیا۔ وہ بھی اپنے جذبات پر قابو پا چکا تھا اور روز والا محمد مالک بن گیا...... مغرور اور بے نیاز۔

دن اندر باہر تھا جب وہ گھر گیا۔ گھر میں نئی دھونیوں کی بو آ رہی تھی۔ ماسی کبھی باہر والے چھوٹے کمرے میں جاتی اور کبھی کسی دوسرے کمرے میں۔ محمد مالک کو آتے ہوئے دیکھ کر وہ رکی، مسکرائی

اور جلدی سے چلتے ہوئے اُس کے پاس آئی اور ہاتھ بڑھا کر اُس کے سر پر پیار سے پھیرا۔

''بہت مبارک ہو پُتر! ہاں پتر سب ٹھیک ہے۔'' محمد مالک نے سوچا کہ ماسی اتنے سالوں سے اُس کے گھر میں رہ رہی ہے، اُس نے کبھی پیار کا اظہار نہیں کیا تھا، شاید وہ کرنا چاہتی ہو لیکن اُس کی اپنی سرد مہری اُسے روکے رکھی ہو! وہ بھی محبت سے مغلوب ہو کر مسکرایا، اُس کی آنکھوں میں محبت کی نمی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماسی اس کی آنکھوں کے راز کو جان پائے، اُس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

گھر میں ایک طرح کی گہما گہمی تھی۔ عورتیں ادھر اُدھر تیز تیز پھر رہی تھیں، اُسے یہ اچھا بھی لگا۔ کئی سالوں سے گھر میں وہ تنہا ہی رہ رہا تھا، رات کا کھانا کھایا، دن کے واقعات پر تھوڑا سا تبصرہ کیا اور اوپر جا کر سو گیا۔ اُس کا دل حقہ پینے کو کر آیا۔ اُس رات کے بعد اُس نے گھر میں حقہ نہیں پیا تھا۔

''ماسی! کھانے کے بعد حقہ تو لانا۔''

''نی جیتے!'' ماسی نے کسی کو دیکھے بغیر ایک لمبی تان لگائی۔ ہاجرہ کے کمرے سے وہ عورت اپنی قمیص پر ہاتھ ملتے ہوئے باہر آئی اور محمد مالک کو دیکھتے ہی فوراً قمیص چھوڑ دی۔ اُس نے ماسی کی طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا۔

''چودھری کے لیے حقہ تازہ کرو۔'' ماسی نے اُسے حکم دیا اور خود چارپائیاں بچھانے لگی۔ محمد مالک ایک چارپائی پر بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ کھانا دیوان خانے سے ہی آیا تھا، جو اُس نے پیٹ بھر کا کھایا۔ وہ ابھی کھا ہی رہا تھا کہ جیتے جھجکتے ہوئے حقہ رکھ کر تیزی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ چودھری نے ایک کش لیا اور تعریفی نظر سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔

''اِس نے تو آدمیوں سے بہتر تمباکو بھرا ہے۔'' محمد مالک نے تعریف کی۔ ماسی اُس کے سامنے والی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

''پُتر! سب ٹھیک ہو گیا۔ تمھیں پروردگار نے چاند جیسا بیٹا دیا ہے۔ کچھ شکل اپنے دادکوں پر ہے اور تھوڑا سا نانے پر، باقی شکل اپنی ہے۔'' ماسی نے محمد مالک کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے اطلاع دی۔ محمد مالک نے سوچا کہ دادکوں میں اُس کے اپنے نانکے بھی شامل ہیں، اُس کے بیٹے کو تو مکمل طور پر دادکوں کی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اُس کے سامنے اپنے نانا کی شکل

گھوم گئی جو دیکھنے میں ایک گھامڑ سا شخص لگا کرتا تھا۔

''ماسی! مجھے میرے باپ کی باتیں سناؤ۔'' محمد مالک کو بیٹا پیدا ہونے کے بعد سے اپنا باپ یاد آرہا تھا۔ اُسے خوشی تھی کہ بیٹا پیدا ہونے سے اُس کے باپ کا سلسلہ رکا نہیں، بیٹی بھی پیدا ہو سکتی تھی لیکن خاندانی روایت جاری رہی جسے وقت آنے پر عبدالرشید بھی یقیناً جاری رکھے گا۔

''پتر! تو بڑا چودھری ہے لیکن وہ تم سے بڑا چودھری تھا۔'' ماسی نے بات شروع کی۔

''وہ کیسے؟'' محمد مالک ایسی باتیں کئی مرتبہ سن چکا تھا، پھر بھی اُس نے دل چسپی سے پوچھا۔

''پُتر! دیوان خانے میں انگریز افسر کچہری لگاتے تھے، وہ یہاں آکر علاقے کے فیصلے کرتے۔ افسر کے آنے سے کئی دن پہلے اُن کے کارندے آنے شروع ہو جاتے، بیل گاڑیوں میں اُن کا سامان آتا۔ تیری ماں اور میں تب بچیاں ہی تھیں، ہم ابھی گھروں سے باہر گھوم پھر سکتی تھیں۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ ہم اُن کا سامان اُترتے دیکھتے، وہ ایک میلہ ہوتا۔ کارندے ہمیں وہاں سے بھگاتے اور ہم تھوڑی دور تک بھاگ کر واپس آجاتے۔ گاؤں سے باہر افسروں کے رہنے کے لیے تنبو لگ جاتے اور دیوان خانے کے بڑے کمرے میں دفتر لگتا۔ کئی مرتبہ بڑے صاحب کی میم بھی آتی۔ اُن کا سامان اور عملہ کئی دن تک آتا رہتا۔ افسر کا کھانا اُس کے اپنے آدمی پکاتے جب کہ باقی لوگوں کا کھانا تیرا باپ پکواتا۔ افسر کی میم کئی مرتبہ اِس گھر میں آئی ہے، تیری دادی ابھی زندہ تھی۔ وہ تیری دادی سے ہاتھ ملاتی تو وہ شرما کر دوپٹے میں منہ چھپا لیتی اور میم قہقہہ لگا کر ہنستی اور پھر کچھ گٹ مٹ کرتی۔ ہم بچے اُس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ کئی مرتبہ وہ یہاں سے گھوڑے پر سواری کرتی دور تک نکل جاتی۔ پتا ہے وہ گھوڑے پر کیسے بیٹھی ہوتی؟ اُس نے دونوں ٹانگیں ایک طرف کی ہوتیں، لگتا کہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی ہوئی ہے۔'' ماسی بھی منہ پر دوپٹہ لے کر ہنسنے لگی، ''ہم سوچتے کہ میم کا اگر پیشاب نکل گیا تو!'' وہ پھر ہنسنے لگی۔

''ماسی، تم نے بتایا تھا کہ عملے کا کھانا ہم پکاتے تھے۔''

''ہاں! یہ کافی خرچا ہوتا تھا لیکن تیرا باپ ہر تیسرے مہینے یہ خرچ کرتا۔ اس کے بدلے میں انگریز تیرے باپ کی عزت کرتے۔ اُسے سرکاری دفتر میں کرسی دی جاتی۔ اردگرد کسی کے گھر انگریز نہیں آتے تھے۔ وہ سب اُس سے حسد کرتے تھے اور اُس کی مخالفت بھی ہونے لگی۔ اُنھوں نے اُسے کئی قسم کے مقدمات میں پھنسانا چاہا لیکن انگریز بہت ہوشیار ہے، وہ ہر دیسی چال کو اچھی

طرح سے سمجھتا ہے۔ اُس نے ہمیشہ اُن کے خلاف فیصلہ کیا۔'' ماسی رُکی، ''میں ابھی آئی!'' وہ اُٹھ کر پاؤں گھسیٹتے ہوئے تیزی کے ساتھ ہاجرہ والے کمرے میں گئی اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئی، ''سب ٹھیک ہے۔ دائی اندر ہی ہے۔ ہاں پتر! دائی کو انعام دل کھول کر دینا۔''

''ٹھیک ہے ماسی۔ اُسے دانے، گڑ اور ایک کٹی دوں گا۔ دینے کے لیے ابھی بھینس تو ہے نہیں کوئی۔ ہاجرہ نے بکوا دیں۔'' محمد مالک نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں خوشی بھی تھی۔

''تم انگریز کی بات کر رہی تھیں۔''

''ہاں۔ پھر ایک دن اطلاع آئی کہ ضلع کا بڑا افسر گاؤں آرہا ہے۔ ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگی، کہا جانے لگا کہ وہ عبدالرحمان کو سیدھا کرنے آرہا ہے۔ بیل گاڑیوں کی قطاریں کیڑیوں کی طرح آرہی تھیں۔ اُن میں بڑے صاحب کا سامان تھا۔ اُس کی میز آئی، اونچی ٹو والی کرسی آئی، میز پر بچھانے کے لیے رنگ دار کپڑا آیا۔ ایک موٹی ساری دری آئی اور کرسی میز کے اوپر ایک رنگلا، چھوٹا تنبو لگایا گیا۔ پھر صاحب آیا، اُس کے ساتھ اُس کی میم بھی تھی۔ اُس بار وہ تمھاری دادی سے ملنے نہیں آئی۔ یہ صاحب کوئی اور تھا۔'' ماسی منہ پر کپڑا لے کر ہنسنے لگی، ''بالکل بورا باندر....'' وہ پھر ہنسنے لگی۔

''میں نے بورے باندروں جیسے افسر دیکھے ہیں۔'' وہ بھی ماسی کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

''بڑا صاحب کئی دن یہاں رہا۔''

''صاحب کے عملے کا کھانا کس نے پکایا؟''

''تمھارے باپ نے نہیں۔ حکم تھا کہ سرکار اپنے عملے کے کھانے کا خود بندوبست کرے گی۔ جانوروں کے لیے چارہ آتا، کھانے پکتے، کنوؤں سے سارا دن پانی نکالا جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ اتنی رونق تو پیر غازی کے میلے پر بھی نہیں لگتی۔ بڑا افسر اور اُس کی میم سارا دن علاقے کے لوگوں سے ملتے۔ اُن ملاقاتوں میں پٹواری اور تھانے دار بھی موجود ہوتے۔ کوئی ایسا معتبر نہیں تھا جس کے ساتھ ملاقات نہ کی گئی ہو۔ کوئی اگر کہیں دور نزدیک گیا ہوا تھا، اُسے بھی بلایا گیا۔ تیرے باپ سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ میم بھی ملی۔''

''میم کے ساتھ کیا ملاقات ہوئی؟'' محمد مالک کی آنکھوں کی چمک اندھیرے کو چیر رہی

تھی۔ اُسے اِن باتوں کو ہر بار سنتے ہوئے یہی محسوس ہوتا کہ پہلی بار سن رہا ہے۔

ماسی ہنسنا شروع ہو گئی۔ "تب تیری ماں اس گھر میں آ گئی تھی۔ جب کوئی پوچھتا: 'چودھری جی میم کے ساتھ کیا بات ہوئی؟' تو تیرا باپ جھوٹ موٹ کی گٹ مٹ کرنے لگتا اور وہ لڑنا شروع کر دیتی۔ 'وہ باندری اسے ساتھ ہی لے جاتی تو بہتر ہوتا۔' تیرے باپ نے بتایا کہ میم نے میرے ساتھ موسم، بارشوں اور دریا کی لہروں کی بات کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ صرف میو اور وہ ہی برسات میں دریا پار کر سکتے ہیں۔ میم نے یہ سوال کئی لوگوں سے پوچھا، ہر کوئی لہروں سے ڈرتا تھا۔"

"اور اگر وہ دریا پار کرنے کو کہہ دیتی؟" محمد مالک کسی حد تک گھبرایا ہوا تھا۔

"وہ کہتا کہ میں نے کود جانا تھا، بعد میں دیکھی جاتی۔ اُس نے دریا ہمیشہ بیڑی میں پار کیا اور وہ بھی تب جب پانی کم ہو۔ وہ پانی سے بہت ڈرتا تھا اور ویسے بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا جس میں خطرہ ہو، اور قہقہہ لگا کر ہمیشہ یہی کہتا کہ میں ماں باپ کی واحد اولاد ہوں۔"

"میں بھی واحد اولاد ہوں۔" محمد مالک نے تلخی سے کہا۔

"اور عبدالرشید.....؟" ماسی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ محمد مالک نے اندھیرے میں اُس کے چہرے کو نظر سے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"جس طرح دادا اکیلا تھا، چاچا اکیلا تھا، میں اکیلا ہوں اُسی طرح وہ بھی اکیلا ہی ہوگا اور شاید میں بھی اپنا پوتا نہ دیکھ سکوں۔"

"ایسے نہیں سوچتے۔" ماسی اب گھبرا سی گئی تھی۔ ساری شام خوش گوار گزری تھی اور اُسے باتوں کا یہ رُخ پسند نہیں آ رہا تھا۔

"ماسی! ہم نے ہمیشہ اپنے خاندان کی روایت کو نبھایا ہے۔" اُس کی آواز میں مٹھاس تھی۔ "میرے باپ نے میری شادی بہت دھوم سے کی تھی....."

"تمھارے باپ کی شادی اُس سے بھی بڑی تھی۔ ایک ہفتہ دیگیں پکتی رہیں اور لوگ کھاتے رہے۔ مذہب اور ذات برادری کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک طرح کا میلہ تھا، لوگ آ اور جا رہے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ مہاراجہ کپورتھلہ کے ولی عہد کی بھی ایسی شادی نہیں ہوئی تھی۔"

ماسی تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ "اچھے دن تھے۔" اُس نے ایک لمبی سانس لی اور تائید کے

لیے محمد مالک کی طرف دیکھا؛ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔

''ہم مہاراجہ کپور تھلہ سے بھی بڑے راجہ ہیں۔ اُس کی چھوٹی سی ریاست سازشیوں اور پٹھوؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ہم یہاں آزاد ہیں۔ غلامی تو کوئی نہیں۔ انگریز سب کا حاکم ہے، ہمارا بھی اور مہاراجہ کا بھی۔ میرے باپ کی شادی اُس کے ولی عہد کی شادی سے زیادہ دھوم دھام سے ہی ہونا تھی۔'' محمد مالک کی دھیمی آواز فخر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے خاندان کی روایت کے اندر رہتے ہوئے ہی زندگی گزارتا آیا تھا اور یہ روایت کہیں تحریر نہیں تھی، اِس کا سینہ بہ سینہ انتقال ہوتا چلا آیا تھا۔ وہ ہمیشہ اِس کوشش میں ہوتا کہ گاؤں کے بوڑھوں کے پاس کبھی نہ کبھی ضرور بیٹھے؛ اُن سے وہ اپنے باپ دادا کے قصے سنتا۔ اُس کے دادا کا صرف شریف لوگوں کے ساتھ تعلق تھا، وہ علاقے میں واردات کرنے والے لوگوں کو اپنے آپ سے ہمیشہ علیحدہ رکھتا، اُس کی شرافت اور ایمان داری کی ہر طرف دھوم تھی۔ کئی لوگ اِسے کمزوری سمجھتے کہ چودھری شاید اُن لوگوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔ وہ جواب میں یہی کہتا کہ شریف لوگوں کا بدمعاشوں کے ساتھ کوئی تعلق بنتا نہیں۔ اُس کا باپ جب جوانی میں داخل ہو رہا تھا تو یہ تمام معاملات اُس کی نظر میں تھے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاندان کی شرافت اور روایت کا پاس رکھنے کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں سے بھی رابطہ رکھے گا جو بُرے سمجھے جاتے ہیں لیکن بُرے ہوتے نہیں۔ وہ کہتا: میں اِن لوگوں کو استعمال کرتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مجھے استعمال کرتے ہیں۔ اردگرد کہیں بھی واردات ہوتی، وہ مال واپس کروانے اور پھر وارداتیوں کو چھڑوانے میں اپنا کردار ادا کرتا۔ محمد مالک کے دادا نے سرکار کے ساتھ کبھی غیر ضروری رابطہ نہیں رکھا تھا لیکن باپ نے تحصیل دار، ضلع دار، قانون گو، گرداور، پٹواری اور تھانے دار، سب کے ساتھ تعلق رکھا۔ وہ جب علاقے کے دورے پر آتے تو ہمیشہ اُس کے دیوان خانے میں اُن کا ڈیرا ہوتا۔ وہ علاقے کے بارے میں ہونے والے فیصلوں میں اپنی رائے دیتا اور اُس رائے پر عمل درامد بھی کرواتا۔ پٹواری جب گرداوری کے لیے آتے تو وہی کیا جاتا جو وہ چاہتا۔

''تم بڑے انگریز صاحب اور اُس کی میم کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ وہ لوگوں سے ملاقاتیں کیوں کر رہے تھے؟'' محمد مالک نے اپنے خیالوں کے گھوڑے کی باگ کھینچی۔

''سرکاری طور پر علاقے کا بڑا پنچ منتخب کرنے کے لیے۔'' ماسی نے مختصر سا جواب دیا۔

ماسی ابھی تک محمد مالک کی موت کو خوش آمدید کہنے والی بات بھولی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس خاندان کے مرد مرنے سے نہیں ڈرتے اور لمبی عمر بھی نہیں پاتے۔ محمد مالک تھا تو اُس کا بھانجا لیکن اُس نے ہمیشہ اُسے باپ کا درجہ دیا تھا۔ آدمی تو پیدا ہوتے ہی باپ بن جاتا ہے، اپنی کوکھ سے نکالنے والی کو ننگے سر پھرتے دیکھ کر اپنی عزت کو خطرے میں محسوس کرتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو اُسے ٹھکانے بھی لگا دیتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب ماں کا مقام ختم ہو جاتا ہے اور پھر بیوی اُس کی عزت بن جاتی ہے۔۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ سُولوں کے منہ تیز ہوتے ہیں۔

''پھر؟'' محمد مالک ہر بات کو ذہن میں بٹھائے جا رہا تھا۔

''انگریز نے ملاقاتوں کے بعد سب کو اکٹھا کیا اور اُنھیں بتایا کہ تمھارا باپ سرکار کا نمائندہ ہے اور علاقے کا بڑا پنچ۔ اگر کسی نے آج کے بعد عبدالرحمان کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو وہ انگریز سرکار کے قانون کو توڑتا ہو گا اور سرکار کسی کو یہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔'' ماسی نے ایک لمبی آہ بھری۔ ''وہ اچھے دن تھے۔''

محمد مالک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا: کیا وہ اُتنا طاقت ور اور مضبوط ہو سکتا ہے جتنا اُس کا باپ تھا! ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور وہ اپنے زمانے کے تقاضے پورے کر رہا تھا۔ لوگ اُس سے ڈرتے تھے، اُس کا ضلع میں ایک مقام تھا اور افسر اُسے ایک اہم آدمی سمجھتے تھے جس کے بغیر اُس علاقے میں سرکار چل نہیں سکتی تھی۔ شاید وہ اتنا اہم نہ ہوتا اگر اُس کے باپ نے اپنے وقت میں خاندان کے نام اور وقار کو چار چاند نہ لگائے ہوتے۔ پتا نہیں وہ اپنے باپ جیسا ہے کہ نہیں لیکن وہ اُس کی توسیع ضرور تھا۔ جہاں سے اُس کے باپ نے اپنی زندگی کا اختتام کیا تھا، اُس نے وہیں سے آغاز کیا۔

''پتر! ایک بات تو بتا؟'' اِس مرتبہ ماسی نے گھوڑے کی باگ کھینچی۔

''کیا؟'' محمد مالک نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

''کہا جا رہا ہے کہ انگریز سرکار واپس چلی جائے گی؟'' ماسی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

محمد مالک نے ایک لمبی انگڑائی لی۔ وہ سارا دن مصروف رہا تھا اور پھر عبدالرشید کی پیدائش کی خوشی کے بوجھ نے بھی اُسے کافی حد تک تھکا دیا تھا۔ اچانک نیند اُسے اپنے آپ پر حاوی ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔ ''ماسی! ہم لوگ بابر بادشاہ کے زمانے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ انگریز

یہاں نہ بھی رہے تو ہمیں کیا فرق پڑنا ہے۔'' محمد مالک کی آواز میں بھی تھکاوٹ در آئی تھی۔ اُس کے لیے اب آنکھیں کھولے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''پر پتر، کہا تو یہ جا رہا ہے کہ نیا ملک بن جانا ہے اور تمام مسلمانوں نے وہاں چلے جانا ہے۔ یہاں تو ہندو اور سکھ رہ جانے ہیں۔ ہمیں اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑنا پڑنا ہے۔'' ماسی کی آواز میں خوف اور پریشانی تھے۔ محمد مالک نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ماسی! عجیب قسم کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ لیکن ایسی باتیں تو ہم کب سے سن رہے ہیں۔ سنا ہے کہ میرا دادا مغل بادشاہوں کو یاد کیا کرتا تھا اور میرے باپ نے ہمیشہ کہا کہ انگریز زیادہ منصف ہے۔ یہاں سے اُٹھ کر ہم کہاں جائیں گے؟ یہی ہندو اور سکھ نسلوں سے ہمارے ساتھ جی رہے ہیں۔ انھوں نے ہمارے مردے دفن کیے اور ہم نے اُن کے مردوں کو جلایا۔ اب سیاست دان جو مرضی چاہیں کہتے رہیں، ہم ایک دوسرے کو کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں!'' محمد مالک جو اُٹھنے کا سوچ رہا تھا، چارپائی پر جم کر بیٹھ گیا۔

''پُتر! تم کہتے تو ٹھیک ہو لیکن ہم اور ہندو آپس میں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اُن کی عورتیں ہمارے ساتھ کھانا پینا پسند نہیں کرتیں۔ اُنھیں ہم سے ہمیشہ بو آتی ہے۔'' محمد مالک کے قہقہے نے اُس کی بات کاٹ دی،

''ماسی! تم ہو ہی ساری کی ساری گندی۔''

''ساری کی ساری تو نہیں ہاں کچھ ضرور گندی ہوتی ہیں۔ سکھنیاں بھی تو ہماری طرح ہی ہیں۔'' ماسی نے گویا طعنہ دیا۔

''وہ تمھاری طرح کیسے ہوئیں؟'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ ہم سے ناک منہ نہیں چڑھاتیں۔'' ماسی نے دفاعی سی بات کی، ''کبھی یہ تو سوچو کہ اتنے سارے مذہب اکٹھے کیسے رہ سکتے ہیں؟''

''جیسے رہتے آ رہے ہیں۔'' اِس دفعہ وہ سنجیدہ تھا۔ ''بابر بادشاہ کے وقت میں، ہم جب مسلمان ہوئے تو یہاں باقی سب ہندو تھے۔ سننے میں آیا کہ پوری ایک نسل وہ اور ہم ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن رہے۔ اکٹھے رہتے ہوئے اختلاف اتنا لمبا عرصہ نہیں چل سکتا، آہستہ آہستہ ہم پھر اِک مِک ہو گئے۔''

''اُن میں سے بھی کافی مسلمان ہو گئے۔'' ماسی نے اُسے یاد دلایا۔

''مسلمان تو ہو گئے لیکن رہے ہندو۔ ہم بھی آدھے ہندو ہیں۔'' محمد مالک ہنسنے لگ پڑا۔ اُس کی ہنسی میں ایک طرح سے ترنم تھا، وہ دیر تک اسی طرح ہنستا رہا۔

''پُتر! تمھیں پروردگار نے چاند سا بیٹا دیا، اِس خوشی میں ایک مسجد تو بنوا دے۔'' ماسی نے خوشامدی لہجے میں التجا کی۔

''ماسی! تم نے بخشے نہیں جانا۔ اورنگ زیب کے وقت کی ایک مسجد تو بنی ہوئی ہے۔ جب کبھی مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا، میں نے مسجد کو ہمیشہ خالی پایا۔ جب نمازیوں سے یہ مسجد بھرنا شروع ہو گئی تو ہم نئی مسجد کے متعلق سوچنا شروع کر دیں گے۔ ابھی جامعہ مسجد اورنگ زیب کافی ہے۔'' محمد مالک نے طنز کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے، پتر یاد رکھنا۔ ابھی سو جاؤ۔ صبح تم عبدالرشید سے بھی مل لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر محمد مالک سیڑھیوں کی طرف چل پڑا!

محمد مالک کی زندگی میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی تھی لیکن وہ اپنے آپ میں ایک تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا زمین داری کے معاملات میں پہلے سے زیادہ جُٹ جانا تو ایک قدرتی سی بات تھی لیکن ماسی کی اُس رات کی باتوں نے اُس کے اندر ایک تبدیلی ضرور پیدا کر دی تھی؛ اُس کا غیر مسلموں کے ساتھ رویہ کچھ بدل سا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ معاملات کی ساجھے داری اور باہمی روابط ختم تو نہیں ہو سکتے تھے لیکن اُس کے رویے میں ایک محتاط سی سرد مہری ضرور آ گئی تھی۔ اُس نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی کسی حد تک کم کر دیا تھا اور زیادہ وقت گھوڑی کی پیٹھ پر سوار اپنے رقبے کے چکر لگاتا۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا کہ اگر مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن بنا تو اُس کی زمینوں کا کیا ہوگا۔ اُسے وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ اپنے پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں کا کیا کرے؟ قدرتی سی بات تھی کہ زمین ساتھ تو نہیں جا سکتی تھی لیکن اِسے یہاں کسی اور کے مستقل قبضے میں چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ جب بھی محکمہ مال کے افسروں سے ملتا تو گھما پھرا کر یہی سوال کرتا؛ اگر کسی نے کسی دوسرے ملک میں جانا ہو تو اُس کی جائیداد وہاں کیسے منتقل ہو سکتی ہے؟

''چودھری جی! منقولہ جائیداد تو ساتھ جا سکتی ہے لیکن غیر منقولہ جائیداد تو یہیں رہے گی۔''

''کوئی ایسا طریقہ جس کے ذریعے سے اُس کی زمینیں بھی اُس کے ساتھ جا سکیں۔''

''کوئی قانون یا ذریعہ جس سے اُس کی زمینیں بھی ساتھ جا سکیں۔'' وہ پھر پوچھتا۔

''ایک طریقہ بن سکتا ہے۔'' سرکاری اہل کار نے ایک دفعہ اطلاع دی۔ محمد مالک کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اُسے لگا کہ اُس کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے تجسس کو قابو میں رکھا۔ اُس نے اہل کار کی طرف استفہامیہ نظر سے بھی نہیں دیکھا۔

اہل کار نے محمد مالک کے سوال کا انتظار کیا اور پھر بات جاری رکھی: ''وہ جانے سے پہلے اپنی زمینیں بیچ دے۔'' اُس کے بعد اہل کار اپنے معاملے میں اُلجھ گیا لیکن محمد مالک کے ذہن میں اُس کا بتایا ہوا حل گونجے جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگ پڑا کہ اگر اُسے زمین بیچنی پڑی تو وہ کس

وقت بیچنا شروع کرے اور سب سے پہلے کون سی زمین بیچے؛ نیائیں والی یا بانگر والی جو صدیوں کے بعد ابھی تک پوری کی پوری زیر کاشت نہیں آئی تھی۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ گورداس پور مسلمان ملک میں جا رہا ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو سب جیسے ہے ویسے ہی رہے گا، صرف ہندو اور سکھ اپنے ملک کو چلے جائیں گے؛ اُس نے لبانوں کو نہیں جانے دینا۔ لبانے صدیوں سے اُس کے خاندان کی گندگی اُٹھاتے آئے ہیں اور وہ کسی اور کو اِس کام کے لیے کیسے رکھے! یہ تو بے وفائی ہوگی جو اُس نے سیکھی ہی نہیں۔

دوسری بڑی جنگ شروع تھی۔ دنیا میں ایک تبدیلی کا آغاز ہونے والا تھا جس سے محمد مالک تو بے خبر تھا، اُسے صرف جنگ میں دل چسپی تھی۔ گاؤں کے دو نوجوان بھرتی ہو کر لام پر جا چکے تھے۔ ایک کے افریقہ سے خط آتے اور دوسرا برما میں تھا۔ جب بھی اُن میں سے کسی کا خط آتا تو خبر سارے گاؤں میں پکی ہوئی گندم کو لگنے والی آگ کی طرح ہر طرف پھیل جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں اُس گھر کے صحن میں اکٹھا ہو جاتا۔ خدا کا نام لے کر سکول ماسٹر لفافہ کھولتا اور خط کی پڑھائی شروع ہو جاتی۔ خط میں افریقہ کے ریگستانوں یا برما کے جنگلوں کا ذکر ہوتا اور اپنی خیریت کی اطلاع ہوتی اور گاؤں کے ہر خاندان کو فرداً فرداً سلام لکھا ہوتا جس کا بہ آوازِ بلند جواب دیا جاتا۔ جب خط ختم ہو جاتا تو گاؤں والے گھر والوں کو مبارک دیتے اور خط لکھنے والے نوجوان کی تعریف میں کلمات کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں یا کاموں کی طرف چل پڑتے، کچھ حقے کی واری کے لیے رُک جاتے۔ جنگ پر جانے والا ایک نوجوان مسلمان تھا اور دوسرا سکھ۔ سکھ نوجوان کے گھر والے جلدی میں تعلق والے کسی مسلمان گھر سے حقہ پکڑ لاتے۔

محمد مالک سرکار برطانیہ کا وفادار تھا اور اُن کی جنگی کوششوں میں حکم کے مطابق اپنا حصہ ڈال رہا تھا جس میں حکومت کو غلے کی فراہمی شامل تھی لیکن کئی محاذوں پر لڑی جانے والی جنگ میں اُس کی ہمدردی جرمنی کے ساتھ تھی۔ وہ جب جرمن افواج کی کامیابیوں اور اُن کی حکمتِ عملی کے قصے سنتا تو اُس کا دل خوش ہو جاتا۔ دیوان خانے میں جب بھی جنگ پر تبصرہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کہتا:

''جرمن بادشاہ ہے دلیر، کھل کے آتا ہے، ہمارے بادشاہ کی طرح نہیں کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے رات کے اندھیرے میں چھپ کر وار کرے۔''

''اگر جرمن بادشاہ جیت گیا تو کیا ہوگا؟' کوئی سوال پوچھتا۔

اِس سوال کا جواب دینا محمد مالک کے لیے مشکل تھا۔ اُس نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں آنکھ کھولی تھی۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی دوسرا حاکم کیسا ہوگا یا وہ کسی دوسرے حاکم کو قبول ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے خیال میں یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ گاؤں کا چودھری ہے اور گاؤں والے اُس کے علاوہ کسی دوسرے چودھری کا سوچ ہی نہیں سکتے۔ محمد مالک کے باپ نے اپنے باپ کے حوالے سے اُسے کئی واقعات سنائے تھے۔ تخت پر آخری مسلمان بادشاہ کاہل، نالائق اور بوڑھا تھا اور اُس کے پاس انگریز کی کسی چال کا جواب نہیں تھا۔ دہلی سے کئی قافلے لاہور یا ملتان کی طرف جاتے ہوئے اُن کے گاؤں میں سے گزرتے رہتے تھے اور وہ دہلی کے گلی کوچوں میں ہونے والی جنگ کے متعلق قصے بتاتے۔ اُس کے دادا کو غرض نہیں تھی کہ دہلی پر کون حکومت کرے کیوں کہ اُس کے جدِ امجد نے بابر کے خلاف بغاوت کی تھی اور وہ سرکار کے ساتھ ٹکر نہ لینے کی وصیت کر گیا تھا۔ انھیں حکم عدولی کے بجائے اطاعت کرنا ہی سکھایا گیا تھا۔ محمد مالک کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس کا باپ ہمیشہ اُسے حاکم کی اطاعت کرنے کا سبق دیتا رہا تھا۔

وہ اِس سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہتا اور اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی کوئی بول اُٹھتا، ”جس کے نصیب میں لکھا ہوگا وہ جیت جائے گا۔“ وہاں سب لوگ اِس دانش پر اثبات میں سر ہلا دیتے۔

جنگ کے آخری دور میں انگریزوں کے ملک پر حکومت کرنے کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی تھی، ایسے لگتا تھا کہ سرکارِ برطانیہ بھی اُتنی طاقت ور نہیں رہی جتنی جنگ سے پہلے تھی۔ گاؤں سے بٹالہ گھوڑی پر ایک دِن کی مسافت پر تھا۔ جب بھی بٹالہ جانا ہوتا محمد مالک آدھی رات گزرنے کے بعد گھر سے نکلتا۔ وہ کسی کو ساتھ لے لیتا جو دِن کی روشنی ہونے تک اُس کے ساتھ پیدل چلتا اور جیسے ہی تھوڑے فاصلے پر چیزیں نظر آنا شروع ہو جاتیں، اُس آدمی کو واپس بھیج دیا جاتا۔ ایک مرتبہ محمد مالک تحصیل دار سے ملنے کے لیے بٹالہ گیا۔ تحصیل دار کے ساتھ اُس کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ ویسے بھی جب کسی زمین دار گھرانے سے تعلق رکھنے والا تحصیل دار تعین ہو کر آتا تو محمد مالک اُسے ملنے ضرور جاتا۔ ہمیشہ کی طرح اُس نے رات اپنے تعلق والے تحصیل دار کے گھر گزارنا تھی۔ وہ سیدھا تحصیل دار کے گھر پہنچا۔ تحصیل دار اُس وقت اپنے گھر کے باہر بیٹھے ہوئے حقے کے کش لیتے ہوئے اپنی مونچھوں کو بَل دے رہا تھا۔ محمد مالک کو دیکھ کر وہ خوشی کے ساتھ تیزی سے

چلتے ہوئے اُس کے قریب آیا اور گھوڑی سے اُترنے میں اُس کی مدد کی۔

''چودھری صاحب! آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی؟ میں نے دورے پر تو آنا ہی تھا، معاملے کا مسئلہ وہیں پر طے ہو جاتا۔ آپ بیٹھیں۔'' تحصیل دار محمد مالک کو اپنی کرسی تک لے کر گیا اور اُس نے آواز لگائی، ''جورے او جورے!'' اُسی وقت ایک ملازم اندر سے بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے تحصیل دار کے ہاتھ سے گھوڑی کی لگام لے لی۔ ''گھوڑی کو دانہ ڈالو، بخشو کو بتاؤ کہ پہلے پانی لائے اور جلدی سے کھانے کا بندوبست کرے۔''

گھوڑی کی پیٹھ پر کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد محمد مالک کے چوتڑ سُن سے ہو گئے تھے۔ اُس نے ہنستے ہوئے تحصیل دار کو مخاطب کیا، ''چودھری صاحب! میں ابھی کچھ دیر بیٹھوں گا نہیں، آدھی رات سے زین پر بیٹھا رہا ہوں۔'' اور اُس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اُس کے لیے چارپائی بچھا دی گئی، پائینتی کی طرف کھیس رکھ کر سرہانے دو تکیے رکھ دیے گئے۔ تھوڑی دیر چکر لگانے اور جسم میں خون کی گردش بحال کرنے کے بعد وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تحصیل دار اُسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے ڈپٹی کمشنر کو لکھ دیا ہے کہ آبیانہ بغیر پیشگی اطلاع کے بڑھایا گیا ہے، اِس لیے اضافی رقم کچھ اِس مرتبہ اور بقایا اگلی مرتبہ سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جائے گی۔''

محمد مالک قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''میں نے آج کا سفر بھی درخواست کرنے کے لیے کیا ہے۔''

''آپ نے آ کر اچھا کیا۔ رات باتیں کریں گے۔'' وہ دونوں جب کبھی ملتے پوری رات باتیں کرتے ہوئے گزارتے۔ محمد مالک نے حقے کا کش لیا۔

''چودھری صاحب! جنگ کا کیا بنے گا؟'' محمد مالک کے ذہن میں اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''جنگ تو جرمنی ہارے بیٹھا ہے۔ سرکارِ برطانیہ آخرکار جیتتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔''

''جنگ کے بعد؟'' محمد مالک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''آزادی کی تحریکیں شروع ہو گئی ہیں۔ سرکار انھیں دبانے کی کوشش میں ہے۔'' تحصیل دار نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا سرکار کامیاب ہو جائے گی؟'' محمد مالک کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''چودھری صاحب! ایک وقت آنا ہے کہ انگریز کو جانا ہوگا۔'' محمد مالک یہ جواب سن کر پریشان ہو گیا۔ اگر انگریز چلا گیا اور نیا حاکم آیا تو کیا علاقے میں اُس کا مقام وہی ہوگا؟ اُسے حاکم سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

''نیا حاکم کون ہوگا؟'' محمد مالک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ابھی ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ انگریز جب گیا تو اُس کے بعد کیا نقشہ بنے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جناح اور نہرو کے درمیان میں رسہ کشی ہے اور گاندھی دونوں کو روکتے ہوئے اُن کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ انگریز اِس رسہ کشی کو دیکھ رہا ہے اور اُس نے کسی بھی وقت رسے کو کاٹ دینا ہے۔

اور جب رسہ کٹا تو کیا ہوگا؟'' تحصیل دار نے دل چسپی کے ساتھ محمد مالک کی طرف دیکھا۔ محمد مالک حیرت سے تحصیل دار کا منہ دیکھے جا رہا تھا۔ جہاں سے وہ آیا تھا، وہاں ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

''جب رسہ ٹوٹتا ہے تو کھینچنے والے چوتڑوں کے بھار جا گرتے ہیں۔ یہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ہونا ہے۔ انگریز کچی گولیاں نہیں کھیلا، اُس نے ایسا کر کے جانا ہے کہ دونوں قومیں رہتی دنیا تک سکھی نہ بس سکیں گی۔ وہ بہت خبیث ہے۔'' تحصیل دار نے اپنی رائے دے کر محمد مالک کی طرف دادطلب نظر سے دیکھا لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھا، اُسے زمینوں اور سرکار میں اپنی کارمختاری کی فکر تھی۔

''اگر انگریز چلا گیا تو.....'' محمد مالک کو یاد آیا کہ یہ سوال وہ پہلے بھی پوچھ چکا ہے۔ وہ اپنے اصل سوال پر ایک دم جانا نہیں چاہتا تھا ''میرا مطلب ہے کہ ملک کس طرح چلے گا۔'' اُس نے اپنے سوال کو گول مول رکھنے کی کوشش کی۔

''وہ کوئی نہ کوئی نظام تو چھوڑ کر جائے گا۔ اُس نے اِس ملک کو اتنا لوٹ کھایا ہے کہ کوئی حساب ہی نہیں اور اب اُس کا اِتنا تو فرض بنتا ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ ہندوستان میں سے ایک اور ملک جنم لے گا جو مکمل طور پر مسلمانوں کا ہوگا۔'' تحصیل دار نے حقے کی نے محمد مالک کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اُسی وقت تحصیل دار کا ملازم سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کھانا تیار ہے؟''

''جی حضور!''

''صحن میں چارپائیاں بچھاؤ، وہیں بیٹھ کر کھائیں گے۔ گھوڑی کو دانہ ڈال دیا؟''

''ڈال دیا حضور اور پانی بھی پلا دیا۔''

تحصیل دار اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کی تقلید میں محمد مالک بھی اُٹھ گیا اور دونوں چاردیواری کے اندر صحن میں چلے گئے۔ صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور اُن کے کھانے کے برتن اپنی اپنی چارپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ ملازم نے اُن کے ہاتھ دھلوا کر ڈونگے آگے کیے اور وہ سالن ڈال کر کھانا شروع ہو گئے۔ محمد مالک طویل سفر کی وجہ سے بھوکا تھا اِس لیے وہ سر اُٹھائے بغیر کھانے میں جُت گیا۔

''اِس ملک کا نام کیا ہوگا؟ وہی جو ہم سُن رہے ہیں؟'' محمد مالک کا تجسس اُس کے قابو میں نہیں تھا۔

''ہاں! پاکستان۔''

محمد مالک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھانے میں اتنا مصروف نہیں تھا جتنا کہ ظاہر کر رہا تھا، اُسے تحصیل دار کی باتوں میں دلچسپی زیادہ تھی۔

''اگر پاکستان بن گیا تو یہاں سے مسلمان نقل مکانی کر کے پاکستان چلے جائیں گے۔'' تحصیل دار نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ محمد مالک اِسی انتظار میں تھا۔

''اگر ایسے ہوا تو زمینوں کا کیا بنے گا؟'' محمد مالک نے جلدی سے سوال کیا۔ تحصیل دار کو محمد مالک کا مبہم سا سوال سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ محمد مالک سوال پوچھ کر اپنی تھالی پر جھک گیا تھا۔

''میرے خیال میں جس جس کی یہاں جو جو جائیداد ہے اُسے وہاں ملے گی اور اِسی طرح یہاں آنے والوں کو تم لوگوں کا چھوڑا ہوا ملے گا، ہاں دونوں طرف ذرائع کی لوٹ مار بھی ہو گی۔ دراصل پھر ایک نیا معاشرہ جنم لے گا۔''

''لوٹ مار تو غلط ہوگا، جس کا جتنا ہے اُسے اُتنا ہی مانگنا چاہیے۔'' محمد مالک نے اپنی رائے دی۔

''ایسے ہونا نہیں۔ جب تک نئے حاکم اپنا نظام چالو نہیں کر لیتے اِس طرح کی لوٹ مار ہونی ہے۔ اور....'' محمد مالک نے تحصیل دار کی بات کاٹی،

''چودھری صاحب! سچی کہوں گا،'' اُس نے گول مول بات کرنے کے بجائے سیدھی کہنے کا فیصلہ کر لیا،'' آپ جس طرح بتا رہے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اکیلا آدمی ہوں، اپنے

خاندان اور اپنی ملکیت کو کیسے بچاؤں؟''
تحصیل دار کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، اُس نے ملازم کو برتن اُٹھانے کا اشارہ کیا اور اُسے تھالیاں اور گلاس اُٹھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔''چودھری! ابھی تک تو گورداس پور پاکستان کا حصہ ہے لیکن اگر غیر جانب دار طریقے سے دیکھا جائے تو یہ نئے ملک کا حصہ نہیں بن سکتا۔ انگریز نے اکثریت کی بات ماننی ہے۔ گورداس پور سے شمال کے پہاڑی علاقوں کو واحد سڑک جاتی ہے جو ہندو لیڈر کبھی پاکستان کا حصہ نہیں بننے دیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ملکوں کی تقسیم ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔''

محمد مالک نے ایک لمبی آہ بھری۔ وہ حقے کی نے ہاتھ میں لیے کافی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کے آنسو گرنا شروع ہو جائیں گے، وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

''چودھری صاحب! کوئی چار سو سال سے ہم یہاں آباد ہیں۔ ایک ملک کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے جانا بہت تکلیف کی بات ہے۔ ابھی تو میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے باپ اور دادا کے ساتھ غداری کر رہا ہوں۔ انھوں نے بابر بادشاہ سے لے کر میرے ہوش سنبھالنے تک علاقے میں اپنا مقام بنایا۔ آپ حافظ آباد کے رہنے والے ہیں لیکن یہاں آنے سے پہلے ہی مجھے جانتے تھے۔ کیوں؟ میرے پُرکھوں کی شہرت کی وجہ سے۔ وہاں جا کر میں بے نام ہو جاؤں گا۔''

''آپ اگر یہاں رہے تو غیر محفوظ ہوں گے۔'' تحصیل دار نے فیصلہ سنایا۔

محمد مالک کی نظر کے سامنے عبدالرشید آ گیا۔ وہ اُس کا بیٹا نہیں بلکہ باپ اور دادا کی امانت تھا جس نے اُن کے نام کو دنیا میں آگے لے کر چلنا ہے۔ اُس کے خاندان کے وارثوں کو تربیت ہی ایسے دی جاتی تھی کہ وہ علاقے پر حکومت کریں۔ اُنھیں زمین داری سے زیادہ محفل کے آداب اور دوسروں کو اپنی بات منوانے کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ اگر وہ یہاں رہ گیا تو شاید عبدالرشید کی زندگی کو خطرہ ہو! اُس کے لیے یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔ نیا ملک ہوگا اور نئے لوگ ہوں گے، وہ ازسرِ نو کوشش کر کے اپنا مقام بنا لیں گے۔ زندگی ہوگی تو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

''مجھے اپنے خاندان کو لے کر چلے جانا چاہیے؟'' اِس دفعہ اُسے کوئی جھجک نہیں تھی، وہ یہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ کہاں جائے؟ اُسے اپنے باپ سے سنی ہوئی وہ باتیں

یاد آ گئیں جب بابر سے شکست کھانے کے بعد اُس کے جدِ امجد کے لیے ہندوستان کی زمین تنگ ہو گئی تھی اور وہ بٹھنڈہ سے چھپتے چھپاتے ہوئے یہاں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ یہاں آباد ہونے کا مقصد اپنی اور اپنی بیوی کی جان بچانا تھا۔ اب وہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا؛ اپنی بیوی اور بیٹے کی جان بچانے کے لیے۔ یہ زمین چار سو سالوں کے لیے اُس کے لیے ایک ماں کی طرح رہی تھی؛ وسیع، فراخ دِل اور معاف کر دینے والی۔ گو اُنھوں نے کبھی کوئی ایسی غلطی نہیں کی تھی کہ انھیں معاف کیا جاتا لیکن پھر بھی اِس زمین نے اُس کے اجداد کی ہر نا کردہ خطا پر اُنھیں اپنے ساتھ لگایا۔

''جی ہاں! میرا مشورہ یہی ہے۔ سمجھدار آدمی وقت سے پہلے اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے۔'' تحصیل دار نے محتاط سے لہجے میں جواب دیا۔ محمد مالک کو یہ مشورہ مثبت لگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کہنا تو آسان ہے لیکن اِسے عملی جامہ پہنانا بہت دشوار ہے۔ وہ کہاں جائے؟ کیا اُس کے لیے بھی ہندوستان کی زمین تنگ ہو رہی تھی؟

''مجھے اگر جانا ہے تو کہاں جاؤں؟'' اب محمد مالک پھر محتاط ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر والا اپنا اعتماد اُسے بھک سے اُڑتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ ہمیشہ خود اعتماد رہا تھا لیکن اب اُسے اپنے آپ سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ وہ جہاں بھی جائے، کیا اپنے جدِ امجد کی طرح ایک بیل گاڑی میں سوار ہوگا اور کوچی کتوں کا جوڑا اُس بیل گاڑی کے گرد چکر کاٹ رہا ہوگا؟ تب اُسے بابر کے سپاہیوں یا جاسوسوں کا خوف تھا اور اب کس کا خوف ہوگا؟ اُس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا، اُس نے کسی کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند نہیں کیا تھا۔

''میرے خیال میں تو تین علاقے ہیں۔ یا تو آپ ہمارے مہمان بن جائیں.....''

''چودھری صاحب! یہ میرے ذہن میں تھا لیکن مجھے وہاں کی زمین.....'' وہ شرمندگی سے تھوڑا ہنسا.....

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، حافظ آباد باہر سے آنے والوں کے لیے غیر دوستانہ علاقہ ہے.....''

''اِس کے علاوہ مجھے زمین کا رنگ اور شکل بھی اتنی پسند نہیں آئی۔'' وہ کھل کر بات کر گیا۔ تحصیل دار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، محمد مالک بھی اِس قہقہے میں شامل ہو گیا۔

''منٹگمری اور لائل پور دوسرے ضلعے ہیں۔ منٹگمری کا فاصلہ زیادہ ہے جب کہ لائل پور تو میرے خیال میں آپ ایک آدھ مرتبہ جا چکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ جڑاں والا کے ارد گرد

کہیں چلے جائیں۔"

محمد مالک اب مطمئن سا ہو گیا تھا۔ اُن کی گفتگو کا دائرہ سمٹتا جا رہا تھا اور منصوبے کی کوئی شکل بن رہی تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر تاروں اور کھیتوں کی جگہوں سے وقت کا اندازہ لگایا۔ اُس کے مطابق ابھی آدھی رات ہی ہوئی تھی۔

"میں نے صریح والا، لاٹھیاں والا اور گٹ والا دیکھے ہوئے ہیں۔ وہاں کہیں نہ کہیں میٹھا پانی بھی مل جاتا ہے۔" پھر اُس نے ایک لمبی آہ بھری، ڈاڑھی کے خشخسی بالوں میں انگلی پھیری اور ایک لمبا کش لیا۔

"چودھری صاحب! حقہ کچھ مرنا شروع ہو گیا ہے۔"

"جورے!" تحصیل دار نے آواز لگائی۔ جورا آنکھیں ملتے ہوئے تیزی کے ساتھ اُن کی طرف آیا۔ "چلم بھرو!" تحصیل دار نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے حکم دیا۔

"نہریں بہنا شروع ہو گئی ہیں۔" تحصیل دار نے محمد مالک کی بات کی تائید کی۔

"یہاں کی زمین کا کیا کیا جائے گا؟" محمد مالک نے اُس کی بات کاٹی۔

تحصیل دار نے کچھ دیر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اِتنی دیر میں جورے نے چلم حقے پر رکھ دی۔

"چودھری صاحب! ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ میں جب دورے پر آیا تو آپ کے ساتھ بات کروں گا۔ میں ایک دو تجربہ کار پٹواریوں کے ساتھ مشورہ کر لوں۔"

محمد مالک نے ایک کش لیا۔ "اب ٹھیک ہے۔" اُس نے کش کے بعد حقے کے بارے میں اپنی رائے دی۔

تحصیل دار نے بھی کش لینے کے بعد دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

عبدالرشید ایک مختلف قسم کا بچہ تھا۔ مختلف اس لیے کہ اُس کی اپنی دنیا تھی جس میں وہ اکیلا ہی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کے کوئی دوست نہیں تھے۔ اُس کے باپ نے اُسے یہی بتایا تھا کہ وہ گاؤں کے تمام بچوں سے مختلف ہے اور دوسرے بچوں سے دوستی رکھنا اُسے اُن کی طرح کا ایک عام بچہ بنا دے گا۔ اُس نے بڑے ہو کر ان بچوں کے دماغ اور جسم اپنے استعمال میں لانے ہیں اس لیے اُس کا اُن کے ساتھ گھلنا ملنا مناسب نہیں۔ محمد مالک ہر وقت اُس پر نظر رکھتا۔ اُس نے بیجو چک سے ایک سوار منگوایا۔ بیجو چک اُس کے گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔ سوار ایک مہینہ اُن کے دیوان خانے میں رہا اور وہ ہر شام عبدالرشید کو گھڑسواری سکھاتا۔ وہ گھوڑیوں پر بیاس کے کنارے تک جاتے۔ پھر وہ دریا کے کنارے دور تک مختلف چالیں چلتے ہوئے مشق کرتے۔ عبدالرشید کو ایویا سب سے پسند تھا۔ ایویا چلتے ہوئے گھوڑی تو جلد ہی ہانپنے لگتی لیکن اُس متوازی چال میں گھوڑی کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے اُسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ ہواؤں پر اُڑ رہا ہے۔ ایک اچھا گھڑسوار ہونا تو اُس کے خون میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ ایک انگریز افسر علاقے کے چند اہم لوگوں کے ساتھ ملاقات کے لیے اُن کے دیوان خانے میں آیا ہوا تھا۔ محمد مالک اُسے تیار کروا کر صاحب سے ملوانے کے لیے ساتھ لے گیا۔ عبدالرشید نیکر جیسا کوئی لباس پہنے ہوئے تھا۔

''صاحب بہادر! یہ میرا بیٹا عبدالرشید۔'' گورے نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی نظر عبدالرشید کی ٹانگوں پر ٹھہر گئی۔ پھر اُس نے اپنا بھورا ہاتھ آگے بڑھایا:

''مصافحہ کرو۔'' محمد مالک نے سن رکھا تھا کہ ہاتھ ملانے کو یہ کہتے ہیں۔ عبدالرشید نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ گورے کے ہاتھ میں دیا۔

''محمد مالک! تم گھٹنوں تک اپنا دھوتی اُٹھاؤ۔'' محمد مالک نے کچھ حیرانی اور کچھ جھجک کے ساتھ گھٹنوں تک اپنی ٹانگیں ننگی کر دیں۔ انگریز نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور سب کو

مخاطب کر کے بولا: ''ویل! میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ بھٹی راجپوت ہمیشہ سے اچھے گھڑ سوار رہے ہیں۔
دیکھو!'' اُس نے باپ بیٹے کی ٹانگوں کی طرف اِشارہ کیا۔ ''اِن کی پنڈلیاں کمان کی طرح ہیں اور
لگا تار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے سے یہ ایسے ہو جاتی ہیں۔ یہ پیدا ہی اِن پنڈلیوں کے ساتھ ہوئے
ہیں، یہ ہیں پیدائشی گھڑ سوار۔''

محمد مالک نے فخر میں ڈوبی ہوئی عاجزی کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا تھا: ''صاحب بہادر! آپ تو چار سو سال پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ اُس کے بعد سے ہم
لوگ یہاں زمین داری میں لگ گئے اور گھوڑے مجبوری کے بجائے صرف ضرورت رہ گئے۔''

''لیکن گھڑ سواری تمھارے خون میں دوڑ رہی ہے اور تم لوگ پیدا ہی کمان کی طرح
ٹانگوں کے ساتھ ہوتے ہو۔ اور یہی تم لوگوں کے اعلیٰ گھڑ سوار ہونے کی نشانی ہے۔'' اُس کے بعد
انگریز صاحب اپنے کام میں ایسے لگا کہ وہ عبدالرشید اور گھڑ سواری کے متعلق بالکل بھول گیا۔

محمد مالک رات کے کھانے کے بعد دیر تک عبدالرشید کے ساتھ باتیں کرتا۔ اُسے
احساس تھا کہ گھر میں دو عورتوں کی صحبت اُس پر کہیں اپنے اثرات ثبت کرنا نہ شروع کر دے۔ اُس
کی باتیں ہمیشہ خاندان کی عظمت پر ہوتیں۔

''پُتر! اپنا کوئی دوست نہ رکھو اور نہ ہی کسی کے ساتھ دشمنی رکھو۔'' وہ اپنا فلسفہ بتانا شروع
کرتا۔ عبدالرشید اِن باتوں کو گہری دل چسپی کے ساتھ سنتا، اُسے بھی شام کا انتظار رہتا جب وہ
اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر ایسی باتیں سنے جو اُسے کہیں سننے کو نہیں ملتی تھیں۔

''دوست نہ رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔ ایسے لوگوں کے ساتھ تمھارا تعلق
ہونا چاہیے جو تمھارے خیر خواہ ہوں اور وہ ہر محفل میں تمھارا ذکر اور تمھاری تعریف کریں۔ یہ بھی
نہیں ہونا چاہیے کہ تمھیں اُن کا ہمدرد یا اُنھیں تمھارا حاشیہ بردار سمجھا جائے۔ تم نے ایک غیر جانبدار
چودھری کے طور پر اپنا مقام بنانا ہے۔'' محمد مالک خاموش ہو کر عبدالرشید کی طرف دیکھنے لگا۔ باپ
چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا بھی اپنی رائے کا اظہار کرے لیکن عبدالرشید ابھی اُس عمر میں تھا جہاں وہ ایسی
باتیں سمجھ تو سکتا تھا لیکن اُن پر اپنی رائے دے نہیں سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر تو خاموشی کے ساتھ اپنے
باپ کی طرف دیکھتا رہا۔

''چاچا جی! ایسے تو میں اکیلا رہ جاؤں گا، میرا کوئی بھائی بھی نہیں جس کے ساتھ میں

بات کرلوں۔ کیا اکیلا آدمی چودھری بن سکتا ہے؟" عبدالرشید نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔
محمد مالک کچھ دیر سر جھکائے خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے ایک بھرپور نظر اپنے بیٹے پر ڈالی۔

"میں بھی اکیلا ہوں اور اُس سے پہلے میرا باپ بھی اکیلا تھا اور اُس کا باپ بھی۔ میری دنیا میرے اپنے اندر ہے۔ میں اپنا دوست ہوں اور اپنا ہی رشتے دار۔ ہم نے ہمیشہ اپنی رشتے داری اُن خاندانوں کے ساتھ کی ہے جو رتبے اور مقام میں ہم سے بہت نیچے ہیں۔ تم اپنے نانے اور میرے فرق کو دیکھ لو۔ میری ماں بھی ایک ایسے ہی گھر سے تھی، ہاں، وہ لوگ عزت دار ہونے چاہئیں۔ اُن کے کردار پر کوئی انگلی کبھی اُٹھی نہ ہو۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ وہ اپنی بات کو جذب ہونے کا وقت دینا چاہتا تھا۔

"چاچا جی! کچھ باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں اور کچھ نہیں آتیں۔ میں اکیلے اتنا کچھ کیسے کر سکتا ہوں۔" عبدالرشید کی آواز میں بے بسی تھی۔

"پتر جی! ہر آدمی اکیلا ہوتا ہے، سورج کے بغیر اُس کا پرچھاواں بھی غائب ہو جاتا ہے۔ سو، پرچھاواں غائب ہونے سے پہلے والا وقت ہی تمھارے پاس ہے اور اُسی تھوڑے سے وقت میں تم نے سب کچھ کرنا ہے۔ ہم یہاں اِس لیے آباد ہوئے تھے کہ یہاں آ کر آباد ہونے والے کا خیال تھا کہ وہ یہاں مغلوں کے حملوں سے محفوظ رہے گا۔ اُن کے راستے میں دریا تھا اور پھر و نگیں اور بانگر، یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی اُنھوں نے اُکتا جانا تھا۔ پھر اُنھیں بوچہ مَل اکیلا ہی تھوڑا چاہیے ہو گا؟ بوچامل کو یہاں سکون نظر آیا؛ دریا اور اُس کے بعد کا بے آباد علاقہ! کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی دوہری دھات والی راجپوتی تلوار پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ وہ یہاں کے سکون میں کھو گیا۔ اُس کے پاس بیلوں کی جوڑی تو تھی ہی، یہاں اُس نے اپنی زندگی کا پہلا ہل چلایا۔"

"اُس کے پاس بیلوں کی جوڑی کہاں سے آ گئی؟" عبدالرشید نے معصومانہ تجسس سے پوچھا۔ ہاجرہ بھی آ کر اُن کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی پیڑھی لے آئی تھی اور دونوں کی چارپائیوں کے درمیان میں پائینتیوں کی طرف بیٹھ گئی تھی۔ محمد مالک نے حقے کو اُس کی طرف گھمایا۔ عبدالرشید کے پیدا ہونے کے بعد دائی نے اُسے حقہ پینے کا مشورہ دیا تھا کہ اِس سے پیٹ میں ہوا نہیں ہو گی اور بچے کو اوپھارہ کبھی نہیں ہو گا؛ محمد مالک نے بھی باقاعدگی کے ساتھ گھر

میں حقہ پینا شروع کر دیا تھا۔

''کہا جاتا ہے کہ وہ جب بھٹنڈہ سے چلا تو اُس نے زندگی کی جمع پونجی سے بیلوں کی جوڑی خریدی اور اپنی عورت کے ساتھ کسی پُرسکون جگہ کی تلاش میں چل پڑا۔ وہ راستے میں نکودر یا موگہ کے اردگرد بھی آباد ہو سکتا تھا لیکن اُس نے دریا کی حفاظت اور دریا کے پار دور تک پھیلی ہوئی ریت کو زیادہ ضروری جانا۔ اُسے یہاں اتنا سکون ملا کہ اُس نے یہاں سے کہیں اور نہ جانا مناسب جانا۔ اُسے مہارانا کے پیغام کا بھی انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں بھی ہوا مہارانا نے اُسے ڈھونڈ نکالنا ہے۔ اُسے یہ غداری لگا لیکن اب وہ آنکھ مچولی سے تنگ آ چکا تھا۔'' محمد مالک نے ایک لمبی آہ بھری۔ اُسے رائے بوچہ مل اپنے سامنے کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا، اُسے اپنا اندر پگھلتے ہوئے محسوس ہوا۔ یہ باتیں نسل در نسل چلی آ رہی تھیں اور اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ وہ بوچہ مل کے ساتھ خود بھی موجود ہے اور چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا بھی ایسے ہی محسوس کرے۔

''ایک طرح سے وہ بابر بادشاہ کے گماشتوں سے اگر چھپنے کے لیے یہاں آیا تھا تو وہ مہارانا سے بھی چھپنا چاہتا تھا اور اُسے یہ جگہ موزوں لگی۔ اُسے یہ تو علم نہیں تھا کہ مہارانا مر چکا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے مذہب بھی بدل لیا اور بوچہ خاں کے نام سے یہاں اپنی زندگی شروع کر دی۔''

''رائے بوچہ کی عورت نے مذہب بدلنے کی مخالفت نہیں کی؟'' عبدالرشید نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''شاید کی ہو اور شاید نہ کی ہو، کسی کو اِس بارے میں خبر نہیں۔ میرے خیال میں نہیں کی ہوگی۔ کسی کو اُس کے مسلمانی نام کے بارے میں علم نہیں۔'' محمد مالک کی آواز میں اعتماد نہیں تھا۔

''پھر بوچہ نے اِس زمین کو کاشت کرنا شروع کر دیا۔ اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی، صرف شری گووند پور چند گھروں یا جھونپڑیوں پر مشتمل ایک آبادی تھی۔ تب اُس کا نام کوئی اور تھا یا تھا ہی نہیں، یہ نام تو سکھ مذہب کے آنے کے بعد رکھا گیا۔'' اُس نے پھر ایک لمبی سانس لی۔ وہ بوچہ مل کو ہل چلاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

''انگریزوں نے کچھ عرصہ پہلے یہاں ایک چھوٹی نہر کھود دی ہے، تب وہ فصل کو پانی کیسے دیتا ہوگا؟'' عبدالرشید نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہاں تیتر کھمبی بننا شروع

ہوگئی تھی اور ہوا میں خنکی کا ہلکا سا اثر تھا۔

"تم نے ابھی آسمان کی طرف موسم کا پتا چلانے کے لیے دیکھا۔ ایسے ہی ہے نا؟"

عبدالرشید نے اثبات میں سر ہلایا۔

"موسم کیسا رہے گا؟" محمد مالک کی آواز میں اعتماد اور تجسس تھے۔

"تیتر کھمبی بننے کے چند پہر بعد بارش ہو جاتی ہے۔ کل دن اوپر آنے کے بعد کسی وقت بھی بارش ہو جائے گی۔" عبدالرشید نے ایک بار پھر اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ علم ہم نے بوچل سے سیکھا ہے۔ ہمارا نانا اپنی بھینس اُس سے موسم کے متعلق جان کر بنایا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بوچل کبھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ اُس کے پاس موسم کو جاننے کا علم تھا اور وہ اپنی زمین داری اسی علم کے زور پر کرتا تھا۔ برسات کے دنوں میں وتکیں جب پانی سے بھر جاتی تھیں تو وہ پانی کو واپس دریا میں جانے سے روکنے کے لیے بند بنا دیتا تھا اور وہاں سے برتنوں میں پانی ڈھوتا رہتا، پھر اُس نے بوڑھ والا کنواں کھدوایا اور اُس کے حالات بہتر ہونے لگے۔"

"وہ کنواں تو آج بھی ہے۔"

"ہاں ہے لیکن پتا نہیں کتنی مرتبہ اسے کھودا گیا ہے۔ جیسے جیسے وہ زیادہ زمین زیر کاشت لاتا گیا، کنوؤں کی تعداد میں اضافہ کرتا گیا۔ بوڑھ والے کنویں کے علاوہ دو آج بھی چل رہے ہیں!"

عبدالرشید کو شری گووند پور مڈل سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ محمد مالک نے فیصلہ کیا تھا کہ یہاں سے اُسے بٹالہ کے ہائی سکول میں داخل کروا دے گا، اُس سکول کا ہوسٹل بھی تھا اور ہندو ہیڈ ماسٹر سے اُس کی قریبی جان پہچان تھی۔ عبدالرشید کو پڑھائی میں خاص دلچسپی نہیں تھی۔ محمد مالک خود گاؤں کے سکول میں صرف ایک دِن گیا تھا اور کئی دنوں کے بعد جب اُس کے باپ کو پتا چلا کہ وہ سکول سے بھاگ گیا ہے تو اُس نے جواب دیا تھا: ''منشی ایک اے کو کبھی چھوٹا کہتا ہے اور کبھی بڑا۔ جب اُسے خود پتا چل گیا تو میں جانے لگ پڑوں گا۔'' اور یہاں محمد مالک کی تعلیم ختم ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا اتنا پڑھ جائے کہ جب وقت آئے تو وہ انگریزوں کے ساتھ گٹ مٹ کر سکے۔ گاؤں سے روزانہ عبدالرشید گھوڑی پر شری گووند پور جاتا، ایک آدمی گھوڑی کے آگے چلتے ہوئے اُسے سکول تک پہنچاتا۔ وہ صبح کی روشنی ہونے کے جلد بعد گاؤں سے نکل پڑتے اور جب سکول پہنچتے تو پہلی گھنٹی بج رہی ہوتی۔ عبدالرشید تھکاوٹ اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے جماعت میں اونگھتا رہتا اور جب تفریح ہوتی تو سکھ ہم جماعتوں کے ساتھ گوردوارے میں پرساد کھانے چلا جاتا اور پھر سکول واپس نہ آتا۔ وہ چھٹی کے وقت تک اپنے سنگیوں کے ساتھ قصبے میں گھومتا رہتا۔ یہ آوارہ گردی اُس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ وہ لوگوں کو بازار میں دکانوں کے اندر داخل ہوتے اور چیزیں خریدتے دیکھتا۔ اُس نے کبھی کچھ خریدا ہی نہیں تھا، ہر چیز گھر میں پہنچ جاتی، ہاں میٹھی مچھیاں اور کھانے وہ اپنے گاؤں کی کسی بھی دکان سے لے سکتا تھا جس کی قیمت جنس کی بھری ہوئی تھالی ہوتی تھی اور جو ماسی شام تک دکان میں پہنچا دیتی۔ شری گووند پور میں وہ دکانوں کے باہر کھڑا لوگوں کو اپنی جیبوں میں سے پیسے نکال کر چیزیں خریدتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ ایک دِن وہ ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے پکی اینٹ کے مکانوں کو دیکھتے ہوئے جا رہا تھا کہ اُسے اپنی سمت یاد نہ رہی اور وہ راستہ بھول گیا۔ وہ جس بھی گلی میں جاتا اُسے لگتا کہ یہ وہی گلی تھی جس میں سے چلتے ہوئے وہ سکول سے آیا تھا اور جب وہ گلی اُسے کسی دوسری گلی میں لے جاتی تو اُسے پہلے والی ہی

لگتی۔ اسی طرح چلتے چلتے وہ ایک مٹھائی کی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اُسے تھالوں اور پراتوں میں سجی ہوئی مٹھائی گلیوں کے گھروں کی طرح بھول بھلیاں لگی جسے دیکھے چلے جانے کو جی چاہتا تھا۔ وہ پیڑوں، برفی، میسوؤں، لڈوؤں اور شکر پاروں کو حیرت، تجسس اور بے یقینی کے ساتھ دیکھے جارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اِسے کون لوگ کھاتے ہوں گے؟ اُس کے گاؤں کی شادیوں میں باراتیوں کو بدانہ اور دودھ کے گلاس پیش کیے جاتے تھے اور چودھری کا بیٹا ہونے کی وجہ سے دولہا کے ساتھ اُسے بھی دودھ اور بدانہ دیے جاتے۔ دودھ کے گھونٹ کے ساتھ نرم اور لسیلے بدانے کے دانے جب گلے میں سے نیچے اُترتے تو اُسے لگتا کہ وہ سامنے رکھی ہوئی پوری پرات خالی کر سکتا ہے۔ دکان میں بدانہ تو نہیں تھا لیکن اُسے ایک دم شدید بھوک کا احساس ہوا اور اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دکان دار ایک بڑا سا رال جھلتا جھلتے ہوئے اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ عبدالرشید کو جب احساس ہوا کہ اُس کے منہ میں سے پانی باہر گر جائے گا تو اُس نے منہ میں آئے پانی کا ایک گھونٹ پی لیا۔ دکان دار اُسے دیکھے جارہا تھا اور جیسے ہی اُس نے پانی حلق سے نیچے اُتارا، اُس نے اشارے سے اُسے پاس آنے کو کہا: ''بھوک لگی ہے؟''

شرمندگی نے عبدالرشید کی زبان کو تالہ لگا دیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اُسے بھوک لگی ہے لیکن اُسے یہ اقرار کرنا ممکن نہ لگا؛ وہ خاموشی کے ساتھ چند قدم آگے کو کھسکا ضرور! دکان دار پیپل کے پتے جیسے خشک پتے پر برفی کی دو ڈلیاں رکھ کر آگے بڑھانے ہی والا تھا کہ ایک گاہک آ گیا:

''لالہ جی! پیڑے تو دینا۔'' اور اُس نے دکان دار کو چند سکے تھمائے جو عبدالرشید نہ دیکھ سکا۔

لالہ جی نے سکے اپنے پیروں کے پاس رکھ کر پتے والا ہاتھ عبدالرشید کی طرف بڑھایا۔ عبدالرشید اپنی جھجک پر ابھی قابو پانے کی کوشش میں تھا کہ لالے نے گاہک کو مخاطب کیا:

''لگتا ہے کہ یہ لڑکا گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔'' یہ سنتے ہی بے بسی، ندامت اور کم مائیگی نے عبدالرشید کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔ جب آنسو گرنا شروع ہوئے تو اُسے کسی قسم کی جھجک نہ رہی اور اُس نے ہلکورے لے کر رونا شروع کر دیا۔

''نہ رو بچے۔'' گاہک کی آواز میں ہمدردی تھی۔ ''کسی اچھے گھر کا لڑکا لگتا ہے۔'' اُس نے دکان دار سے کہا اور پھر عبدالرشید سے مخاطب ہوا:

''تمھارا گھر کہاں ہے؟''

''ماڑی بوچیاں۔'' عبدالرشید نے بغیر سوچے جواب دیا۔ گاہک کے چہرے پر بجے تذبذب سا تھا جب کہ دکان دار کا چہرہ لاتعلقی لیے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

''نام سنا ہوا سا لگتا ہے اور نہیں سنا ہوا بھی۔'' اُس نے جیسے اپنے آپ سے بات کی،

''کسی کے ساتھ ہو؟''

''ہاں! رحیم میو کے ساتھ۔''

''وہ کہاں ہوگا؟''

''سکول۔'' عبدالرشید کا اعتماد بھی بحال ہو چکا تھا۔

''آؤ!'' اُس نے عبدالرشید کو اشارہ کیا۔ لالے نے پتا بڑھایا تو عبدالرشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کر دیا۔

وہ اُس آدمی کے پیچھے چلنے لگا اور جیسے ہی گلی میں سے باہر نکلے تو سامنے سکول کی عمارت تھی اور رحیم پریشانی کے عالم میں گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ عبدالرشید، رحیم کو دیکھتے ہی بھاگ کر اُس کی طرف گیا اور دونوں نے خوف اور ایک طرح سے رہائی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عبدالرشید جھجک اور خجالت کے ساتھ پیچھے مڑا تو وہ آدمی جا چکا تھا!

وہ عبدالرشید کی تعلیم کا آخری دن تھا!

''تم گئے کیوں تھے؟'' رات کو محمد مالک نے پوچھا۔ اُس کی آواز میں تجسس اور ناگواری تھی۔ عبدالرشید گھٹنوں کے اوپر سر رکھے پیڑھی پر بیٹھا ہوا تھا اور ہاجرہ متفکر سی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

''پکے مکان دیکھتے ہوئے، مجھے گلیوں گلیوں پھرتے یاد نہیں رہا کہ کون سی گلی کہاں جاتی ہے۔'' عبدالرشید نے سادہ سا جواب دیا۔

''تمھارا سکول پکا نہیں تھا؟''

''وہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ گلیوں میں لوگوں کے رہنے والے گھر اور دکانیں مجھے اچھی سی لگیں اور انھیں دیکھتے دیکھتے راستہ بھول گیا۔''

محمد مالک کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اُس کا اپنا گھر اور دیوان خانہ کچے تھے۔ اُن کا تو دیوان خانہ ہوتا ہی نہیں تھا، گرمیوں میں اُس کا دادا کھتریوں کے بوڑھ تلے اپنی چارپائیاں بچھا کر

بیٹھا کرتا تھا اور سورج غروب ہونے کے بعد مہمان حویلی میں منتقل ہو جاتے۔ سردیوں میں چارپائیاں کہیں بھی دھوپ میں بچھ جاتیں۔ اُن کی دو لمبی کڑ چھتیں تھیں اور اُن کے درمیان میں ایک کمرہ تھا جہاں مہمان رات کو سو جاتے۔ سردیوں میں ایک مرتبہ سات دنوں کی جھڑی لگی اور بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی کہ اُس کے دادا نے دیوان خانہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس خاموشی میں محمد مالک نے دیوان خانے کو گرا کر اُسے پکی اینٹوں سے تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''پکے گھر دیکھتے ہوئے تم اگر اپنا راستہ بھول سکتے ہو تو میں تمھیں یہاں پکے گھر بنا دوں گا۔''

''وہ کیسے؟'' عبدالرشید کے بجائے ہاجرہ نے تجسس سے پوچھا۔

''دیوان خانہ اور گھر پکے بنا کر۔''

گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کچا فرش اب اچانک ناہموار لگنے لگا۔ ہاجرہ کو پکے فرش کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ کسی کو بتائے بغیر قیافوں کی اپنی دنیا میں گم ہو گئی۔ ماسی کو گھر اور دیوان خانے کی تعمیرِ نو پسند نہیں تھی: ''پُتر پکے گھر کس نے بنائے ہیں؟ یہ گھر پتا نہیں کب کا بنا ہوا ہے۔ تم اِس میں پیدا ہوئے اور عبدالرشید بھی یہیں پیدا ہوا، اِس سے پہلے تمھارا باپ بھی یہیں پیدا ہوا۔ تم اِس کی جگہ اب نیا گھر بناؤ گے؟ کیوں؟''

''اِس لیے کہ..... یہ گھر بہت پرانا ہو گیا ہے اور دیوان خانہ بھی۔''

''پھر بھی پُتر! خرچے کا تو سوچو؟ تم نے کتنی فصلوں کے بعد آڑھتیے کو فارغ کیا ہے۔''

''ماسی! ترقی نہ کروں؟ کچے کوٹھے لے کے بیٹھا رہوں؟ ہر سال گوبے اور توڑی کی گھانی سے فرش کی لپائی ہوتی ہے۔ اگر سیمنٹ کا فرش لگ جائے تو یہ مسئلہ کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے تو برسات اور سردیوں کی ہر جھڑی میں ڈر رہتا ہے کہ کوئی دیوار ہی نہ بیٹھ جائے۔'' محمد مالک کی آواز میں جوش اور کسی حد تک غصہ تھا اور اُسے ماسی کا اعتراض کرنا دخل در معقولات لگا۔ اُسے افسوس بھی ہوا کہ اُس نے ماسی کو گستاخانہ رویے میں جواب دیا۔ اُس نے اپنی زندگی میں ہر رکاوٹ کو توڑا تھا، وہ تو بیاس میں اُٹھتی ہوئی ہر اُس لہر کی طرح تھا جو کشتی کو اُٹھا کر کنارے کے ساتھ پٹخ دیتی ہے۔ وہ زندگی میں آگے ہی بڑھنا چاہتا تھا۔

''اُس کے علاوہ، ماسی!'' اب اُس کی آواز میں غصہ نہیں رہا تھا۔ اُس کا لہجہ دھیما اور

ایسی مٹھاس لیے ہوئے تھا جو اُسے خود کو منافقانہ سا لگا۔ ''ہمارے گاؤں میں کتنے گھر پکے ہیں؟ ایک بھی نہیں! اور اگر میں یہیں پر ایک پکا گھر بنالوں تو سارا گاؤں حیران رہ جائے گا۔'' محمد مالک پھر جوش میں آ چکا تھا، وہ اُس بچھو کی طرح دُم اٹھائے ہوئے تھا جو خطرے کو سونگھ چکا ہو۔ ''ماسی! مجھے روکنے کے بجائے میرا ساتھ دو۔ تم میری واحد طاقت ہو۔'' محمد مالک نے ماسی پر ایسا دباؤ ڈالا جس کا بوجھ وہ سہار نہیں سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے، پُتری!'' ماسی نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ آنکھوں سے باہر نکلنے والے آنسوؤں کو روکنے کے لیے اپنی آواز کو دبائے ہوئے تھی، لیکن فرطِ محبت سے وہ آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے، ''میرا تیرے سوا کون ہے۔ تو خوش رہے جو میرے جیسی بیوہ کو سنبھالے ہوئے ہو۔ پتر جو بھی کرنا ہے دِل کھول کر کر میں اور کس کے ساتھ ہوں۔''

ماسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی باڑھ بہہ نکلی۔ وہاں ماحول ایک دم بھاری ہو گیا۔ ہاجرہ پکے کوٹھوں میں رہنا شروع کرنا چاہتی تھی، اُسے ماسی پر بھی ترس آ رہا تھا۔ ماسی گھر کا وہ والا ستون تھا جس پر راج نے سارے کا سارا بوجھ ڈال دیا ہو؛ وہ دیر تک روتی رہی، اُس بادل کی طرح جو گرجے بغیر برستا رہتا ہے۔ گھر کے در و دیوار پر لالٹین اور دیے کے سائے اداسی کو اور بھی گہرا کر رہے تھے۔ محمد مالک اپنے گھر کی اِس حالت سے کسی حد تک خفا سا تھا اور سب کچھ ایک دل چسپی سے دیکھ بھی رہا تھا۔

تب ماسی کا رونا سسکیوں، پھر آہوں اور آخر میں ناک سنکنے میں تبدیل ہونے کے بعد ایک طویل خاموشی میں ڈھل گیا۔ طویل وقفوں کے بعد حقے کی گُڑگُڑ، کسی کے پیڑھی کو حرکت دینے کی آواز اور ماسی کی لمبی آہ اور ناک سنکنا.....!

شری گووند پور سے گدھوں اور بیل گاڑیوں پر اینٹیں اور سیمنٹ آنے لگے۔ پہلے گھر کی تعمیرِ نو کا فیصلہ کیا گیا اور دالان والے حصے کو گرانے کا کام شروع ہو گیا۔ محمد مالک مکان کے گرائے جانے سے دل گیر تھا۔ یہ دیواریں اور چھتیں اُس کے خاندان کو کئی نسلوں سے اپنے اندر لیے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنے ایک جلدی کے فیصلے سے صدیوں کے اِس ٹھکانے کو گرانا شروع کر دیا۔ اُس کا باپ بتایا کرتا تھا کہ گھر کی اینٹیں بنانے کے لیے دادا پتھیروں کا ایک کاری گر گروہ لایا تھا جنھوں نے اینٹیں بنانے کے لیے اپنی مرضی کی زمین کا انتخاب کیا اور گھانیوں کے لیے وہاں ایک

کنواں کھودا گیا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ کنواں خشک نہیں نکلا ورنہ اُس ریتلے علاقے میں کئی کنویں خشک بھی نکل جاتے تھے۔ چودھری کے گھروں کی تعمیر کے لیے الگ سانچے بنائے گئے جو معمول کے سانچوں سے چھوٹی اینٹ بناتے تھے۔ یہ اینٹ دیکھنے میں خوب صورت، حجم کی وجہ سے مضبوط اور کارکردگی کے لحاظ سے سو سال تک چلنا تھی۔ مٹی کے ڈھیر لگائے گئے اور کنواں چلانے کے لیے ایک بیلوں اور ایک بھینسوں کی جوڑی خریدی گئی۔ کنواں آٹھوں پہر چلتا تھا اور اُس کا پانی چھوٹی نالیوں کے ذریعے مٹی کے ڈھیروں تک جاتا جہاں سے پتھیرے اُسے سنبھال لیتے اور گھانی کرنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ مرد کچھ پہنے، دھوتیوں کے لنگوٹ بنائے، کسیاں ہاتھوں میں لیے گھانی کیے جاتے اور اُن کی عورتیں کناروں پر بیٹھیں اُن کے حوصلے بڑھاتی رہتیں۔ کبھی کبھار وہ بھی گھانی میں کود جاتیں؛ گھانی ٹانگوں کے ساتھ لگنی چاہیے تھی لیکن چمٹنی نہیں چاہیے تھی۔ اگر وہ چمٹ رہی ہوتی تو اُس میں پانی کی مقدار بڑھا دی جاتی اور اگر لگ نہ رہی ہوتی تو پانی کی مقدار گھٹا کر مٹی کی مقدار بڑھا دی جاتی۔ پتھیرے ایک ہی خاندان سے تھے، گھانی کے تیار ہونے کی منظوری اُن کی ایک بوڑھی عورت اپنی جھگی سے آ کر دیتی اور جب اُس گھانی کی منظوری مل جاتی تو آدمی نئی گھانی کرنا شروع کر دیتے اور عورتیں اینٹیں بنانے لگتیں۔ اینٹیں بنتی رہیں، سوکھنے کے لیے رکھی جاتی رہیں اور سوکھی ہوئی اینٹوں کے چٹے لگتے رہے۔

گھر کا وہی نقشہ رکھا گیا، آنے والوں کو احساس ہی نہ ہوتا کہ وہ پکی اینٹ سے بنے ہوئے گھر میں آئے ہیں، صرف فرش، تبدیلی کا احساس دلاتا۔ فرش کو کئی رنگوں کی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور گاؤں والے آ کر دیکھتے ہوئے حیران ہوتے رہتے۔ دیوان خانہ بالکل تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ایک برآمدہ اور دو کمرے بنائے گئے جن میں چارپائیاں بچھی رہتیں۔ محمد مالک ایک چھوٹا کمرہ بھی بنانا چاہتا تھا جس میں بستر رکھے جا سکیں لیکن ماسی اور باجرہ نے شدید مخالفت کی کہ بستر آہستہ آہستہ غائب ہوتے رہیں گے چناں چہ بوقتِ ضرورت بستر گھر سے ہی آتے۔ ایک کمرے کے پیچھے نلکا لگا کر غسل خانہ بنایا گیا جہاں صرف محمد مالک نہاتا تھا، مہمانوں کے لیے دیوان خانے کے صحن میں ٹوٹی لگائی گئی۔ برآمدہ بنانے سے پہلے سات سیڑھیاں اونچا ایک تھڑا بنایا گیا تھا اور سیڑھیوں کے اوپر دیوار کی لکڑی کا نقش و نگار والا پھاٹک لگایا گیا۔

محمد مالک نے ایک ایک اینٹ اپنے سامنے لگوائی۔ جب دیوان خانہ مکمل ہوا تو اُس

نے گاؤں کے ہر گھر میں میٹھے اور نمکین چاولوں کی ایک ایک پرات بھجوائی۔ وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی دیوان خانے میں آ کر بیٹھ جاتا اور رات گئے تک وہیں رہتا۔ سورج غروب ہوتے ہی گھر پہنچنے والا اُس کا معمول ختم ہو گیا تھا۔ دیوان خانہ اُس کے لیے دوسری بیوی کی طرح تھا جو جوان ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھی۔ اگر اُسے اکیلے بھی بیٹھنا پڑتا، وہ سارا سارا دن دیوان خانے میں بیٹھا دیواروں کو محبت اور تحسین کے ساتھ دیکھتا رہتا۔ اُسے اب کسی اور کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ صرف دیوان خانے کا ہو کر رہ گیا تھا اور اُس نے زمین داری عبدالرشید کے سپرد کر دی، جس کی عمر ابھی چودہ سال کی تھی!

دریائے بیاس، ماڑی بوچیاں سے اونچائی پر بہتا تھا اور اونچے درجے کی طغیانی میں جب پانی کناروں سے بہہ نکلتا تو واپس جاتے ہوئے اپنے پیچھے ریت کی ایک گہری تہہ چھوڑ جاتا جس میں پچھلے ایک عرصے سے اضافہ ہوتا رہا تھا۔ دریا والی طرف دور تک ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جو چاندنی راتوں میں لشکتے، چمکتے اور اگر ہوا چل رہی ہوتی تو مچلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ ایسی ہی راتوں میں لڑکیاں بالیاں گھروں سے نکل آتیں اور دیر تک گدا اور کیکلی ڈالتیں جب کہ لڑکے ٹولیاں بنا کر ٹپے گاتے اور یا کبڈی کھیلتے۔ کبھی کبھار لڑکیاں اپنی کھیلیں چھوڑ کر لڑکوں کو کھیلتے دیکھنے آجاتیں یا لڑکے اُن کے گدے میں شامل ہو جاتے۔ جوان ہولی کھیلتے اور راتوں کو گھر گھر پھر کر لوہڑی مانگتے۔ دسہرہ بھی ایک جذبے، شوق اور احترام کے ساتھ منایا جاتا اور عیدوں کی رونقیں بھی اپنے نقطۂ عروج پر ہوتیں۔

رائے بوچہ مل، بھٹنڈہ سے آکر جب یہاں آباد ہوا تھا تو یہ جگہ ایک وسیع اور گہرا ویرانہ تھی اور یہ اُسے پہلی ہی نظر میں پسند آگئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تو بھی اُسے ڈھونڈ نہیں سکے گا۔ اُس نے اپنے چھپنے کے لیے ریت کے اِس دریا میں کئی سلوٹیں تلاش کر لیں تھیں۔ سب سے پہلے اُس نے رہنے کے لیے ایک جھونپڑی بنائی۔ یہ جھونپڑی اُس نے وہاں بنائی جہاں ریت ختم ہو رہی تھی اور سُرخ بھربھری مٹی شروع ہو رہی تھی۔ وہ اِس مٹی کو جب بھی ہتھیلیوں میں لے کر ملتا تو ہر بار ہتھیلیاں ٹھنڈی ہو جاتیں اور اُسے مٹی کے اندر سے پھوٹتی ہوئی طاقت جان جاتا۔ وہ اپنا تنبو اور دوسری اشیا تو بھٹنڈہ ہی میں بیچ آیا تھا۔ یہ وسیع اور بے آباد علاقہ اُسے اپنا لگا تھا اور اُسے محسوس ہوا کہ اب تک کی زندگی کا سفر اِسی جگہ کی تلاش میں تھا۔ اُسے زندہ رہنا تھا اور زندہ رہنے کے لیے اُس کے پاس وہ سب کچھ ہونا چاہیے تھا جو زندہ رکھ سکے۔ اُس نے دیوی اور اپنی متاع کو کوچی جوڑی کے سپرد کیا اور خود ہل کی تلاش میں نکل پڑا۔ شام تک وہ ایک ہل اور پنجالی لے آیا۔ یہ وہ فصل کے اُدھار پر لے تو آیا تھا لیکن اُس کے

پاس بیج بھی نہیں تھا اور نہ ہی پانی جو بیج کو زمین کے اندر سے باہر نکلنے میں مددگار ہو۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں تتر کھمبی کو دیکھا، ہوا کے رُخ کا اندازہ لگایا، مٹھی بھر ریت ہوا میں پھینک کر اُس کی رفتار کا اندازہ لگایا اور پھر خوشی سے زمین پر نہ ٹکتے تیز قدموں کے ساتھ اپنی جھونپڑی کی طرف گیا۔

''راجی! اتنے خوش تو تم کبھی نظر نہیں آیا کرتے تھے۔ غیب کا علم جانتے ہو کیا؟'' دیوی جھونپڑی کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا گھا گھرا اُس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا اور وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ بوچہ مل اُس کے سامنے کھڑا اُسے پیار سے دیکھ کر مسکراتا رہا، پھر اُس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور ڈاڑھی میں بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کنگھا کرتے ہوئے سامنے بیٹھ گیا۔

''دو دِن کے بعد بارش آنے والی ہے، اتنی بارش کہ زمین پیاسی نہیں رہے گی اور اتنی بھی نہیں کہ زمین کی پیاس بجھ جائے۔ میں نے اِسی بارش میں باجرہ بیج دینا ہے اور پھر بعد کی بارش کے بعد مکئی۔'' بوچہ مل کی مسکراہٹ میں ایک نرم سی آنچ تھی جس سے دیوی کے گال جلنے لگے؛ اُس نے تپش کی شدت کو محسوس کرنے کے لیے اپنے گال چھوئے تو ہاتھ جلتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ بوچہ مل، دیوی کے محسوسات سے بے خبر، اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔

''گندم کی بیجائی آنے تک میں نے باجرہ اور مکئی اتنے ذخیرہ کر لینے ہیں کہ ہم سردیاں گلہری کی طرح بے فکری سے گزار سکیں۔ مجھے اپنے اندر کا کاشت کار، سپاہی سے باتدبیر لگ رہا ہے۔ مجھے اب بارش کا انتظار ہے۔''

''راجی!'' دیوی کی آواز میں شرارت کی کھنک تھی۔ وہ ایسے ہنسے جا رہی تھی جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی ہو، ''میں تو سمجھی تھی کہ تم غیب کا علم جانتے ہو!'' اب کے اُس نے گھٹنوں میں سر دبا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ اب بوچہ مل بھی متوجہ ہوا۔ دیوی ایک سنجیدہ قسم کی عورت تھی اور اُس طرح کی شوخی بوچہ مل نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُسے حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی ہوا اور خوف سا بھی؛ شاید دیوی کی زندگی کی یکسانیت نے اُکتاہٹ کے بعد اُس کے اندر کسی قسم کا پاگل پن بھر دیا ہو! دیوی نے اپنا سر گھٹنوں میں ہی رکھا، ''راجی! ایک کام کرو!'' اور ہنسی کا ایک اور فوارہ بوچہ مل کے قریب سے گزرتا ہوا ہر طرف پھیل گیا۔ ''ایک دودھ دیتی گائے کا بھی بندوبست کرو۔'' بوچہ مل کہنے ہی والا تھا کہ دریا کے پاس ہونے کی وجہ سے بھینس اچھی مل سکتی ہے کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اُس

پر دیوی کی ہنسی کا راز کھلنے لگا۔ توقع، اُمید اور خوشی سے بھری ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتا جاتا تھا اور وہ گھٹنوں میں سر دبائے ہنستی جاتی تھی۔

''کہاں پر؟'' بوچہ مل کی آواز میں آدھی رات کے بعد کی خاموشی کا ایک بھاری پن آ گیا تھا۔

''بھٹنڈہ، لکھی جنگل میں آخری رات۔'' دیوی کی آواز بھی بھاری ہو گئی تھی۔ اُسے ایسے لگا تھا کہ ہوا چلنا بند ہو گئی ہے اور اُس کا فقرہ فضا میں معلق ہو گیا ہے۔ اُسے ہر طرف سے لکھی جنگل کی خاموش گونج سنائی دینے لگی۔ وہ خوف زدہ ہو کر گھسٹتی ہوئی بوچہ مل کے ساتھ لگ گئی۔ بوچہ مل ایک بازو اُس کے گرد ڈال کر، اُسے اپنے ساتھ لگا کر، کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔

''دیوی!'' بوچہ مل کی آواز اب ایک دم کہیں دور سے آتے ہوئے لگ رہی تھی۔ دیوی یہی آواز سننے کی عادی تھی، بہت کم ہوا تھا کہ بوچہ مل نے اپنے جذبات اور احساسات اپنی آواز کا حصہ بننے دیے ہوں۔ ''میں کچھ عرصے سے یہی چاہ رہا تھا۔ اب ہم سفر میں نہیں ہیں، یہ ہمارا مستقل گھر ہے۔ میں اردگرد کی زمین کو اپنی ملکیت بنا کر سرکار کا اجازت نامہ حاصل کراؤں گا، بے شک مجھے اپنا دھرم چھوڑنا پڑے۔ مسلمانوں کا راج ہے اور دھرم چھوڑنے کا یہ انعام مجھے دے دیا جائے گا۔''

دیوی تو گویا کیڑ ٹلے پر جا بیٹھی ہو، وہ ایک دم چھلانگ لگا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بوچا مل کی پہلی نظر اُس کے پیٹ پر گئی، جو ہمیشہ کی طرح سیدھا سپاٹ تھا۔ اب وہ کولھوں پر ہاتھ رکھے، اپنی ٹانگیں ذرا کھولے ہوئے ایسے کھڑی تھی کہ جھپٹنے کے لیے تیار ہو، اُس کی آنکھیں متواتر شعلے نکال رہی تھیں۔ بوچا مل نے ایک نظر دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی، ''دھرم چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں، میں اِس دھرم کو کتنے یگوں سے اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہوں۔ میں اِس کا عادی ہو چکا ہوں، مجھے پُن یا پاپ سے کوئی غرض نہیں اب تو یہ ایک عادت سی بن گیا ہے اور ساتھ ہی دھرم چھوڑنا اتنا آسان ہے کہ اِسے چھوڑتے ہوئے تکلیف ہی نہیں ہوگی۔ ابھی میں کچھ ہوں اور اگلے پل کچھ اور ہوں گا، اب تک یہ کرتا آیا تھا پھر وہ دھرم میری رَکشا کرے گا۔ مجھے کیا چاہیے؟ رَکشا!''

دیوی ایک دم بیٹھ گئی، ایسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک لمبا سفر طے کر کے آئی ہے، اُس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور سانس تیز چل رہی تھی۔ اُس نے ایک تھکی ہوئی لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے بوچہ مل کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

"دھرم بدلنے سے کیا ہوگا؟" دیوی کی آواز میں تھکاوٹ سے بھری ہوئی اُکتاہٹ تھی۔ "میرا ہی سارے دِن کی خوشی،" اُس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کھولتے ہوئے کہا، "بھگ ہوگئی۔ میں اپنے دھرم کو کبھی اہم نہیں سمجھتی تھی اور اب جب تم اِسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو تو مجھے یہ اپنی زندگی کا پہلا تھم لگتا ہے۔ اِس کے بغیر تو شاید میں غیر محفوظ ہو جاؤں گی۔"

بوچال دبی سی ہنسی ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں دل چسپی تھی۔ دیوی نے سوچا: اِس سادہ سی ہنسی میں رچی ہوئی معصومیت ایک طرف اور ساری دنیا کی خوشیاں ایک طرف، اگر اِنھیں ترازو میں رکھ کر تولا جائے تو ہنسی کا پلڑا ہمیشہ بھاری ہوگا۔ راء جو بھی کرے گا، اِس میں اُن دونوں کی بہتری ہوگی۔

"دیکھ عورت! زندگی میں کامیابی بہت ضروری ہے اور یہ میں نے جنگیں لڑتے ہوئے سیکھا ہے۔ جنگ میں شب خون بھی مارا جاتا ہے۔ اگر اخلاقی نظر سے دیکھا جائے تو رات کی تاریکی میں سوئے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا ایک پست کام ہے لیکن اُس کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ہم نے کامیاب ہونا ہے اور مذہب بدلنا تو زندگی پر شب خون مارنا ہے۔ ہم رہیں گے تو وہی جو ہیں لیکن شاید جنگ جیت جائیں۔"

دیوی نے ایک اور لمبی آہ بھری۔ بوچال کے بازو کی گرفت اُس کے گرد اور مضبوط ہوگئی، اُسے لگا کہ شاید اب دیوی کبھی خوش نہ رہ سکے۔

"کل سے ہل چلانا شروع کر دو گے کیا؟" دیوی نے ایک طرف رکھے ہل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے مذہب کی گفتگو سے خوف آنے لگا تھا، اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی ایک ایک کر کے اُس کے کپڑے اُتارے جا رہا تھا۔

"ہاں! کل شام تک زمین میں ہل چلا دینا ہے۔ اُس رات بارش بھی آجاتی ہے اور جیسے ہی زمین کا وتر واپس آیا باجرے کا چھٹا دے دینا ہے۔ ساتھ ہی مکئی بیجنے کی تیاری شروع کر دینی ہے۔ ابھی بیج کا بندوبست کرنا ہے۔" بوچال نے آنے والے مہینوں میں ہونے والے کاموں کو اونچا سوچتے ہوئے دیوی کو آگاہ کیا۔

دیوی نیچے والے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے غیر حاضر دماغ کے ساتھ بوچال کو دیکھے جا رہی تھی۔ بوچال اپنی دھن میں مگن بولے جا رہا تھا، اُسے دیوی کی نظر کھنڈے کانٹے کی طرح

چبھ تو رہی تھی لیکن وہ سوچ کی زنجیر کی ہر کُنڈی کو سلامت رکھے ہوئے تھا۔ "مکئی اور باجرہ بیچ کر گندم کا بیج خریدوں گا اور زمین کے اور ٹکڑے اپنے قبضے میں لاؤں گا۔" اُس کی آواز کا اعتماد بعض اوقات دیوی کو خوف زدہ کر دیتا، وہ اتنا سچا لگ رہا تھا کہ سچا نہیں لگتا تھا۔

"کیا تم یہ کر لو گے؟" دیوی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ بوچہل جو سوچ لیتا ہے وہ کر بھی لیتا ہے۔

"میرا باپ کرائے کا سپاہی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کرائے کے سپاہی کی کوئی وفاداری نہیں ہوتی کیوں کہ اُس کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ میرے لیے وہ قطب ستارہ تھا اور میں نے اپنی زندگی کی سمت ہمیشہ اُسی سے طے کی۔ میں زندگی کو اُس کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ وہ ساری زندگی سفر میں رہا تھا اور میں بھی اب تک سفر میں رہا ہوں۔ اب یہ سفر ختم ہے۔ میں اگر ایک اچھا سپاہی تھا تو بہتر کاشت کار بھی ہوں گا۔"

بوچاہل خاموش ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ دیوی اُس کی بات نہیں سُن رہی، اُسے اپنا بولے چلے جانا غیر ضروری لگا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیلوں کی طرف چلا گیا جن کے ہونٹوں کے کناروں پر جگالی کا جھاگ بنا ہوا تھا۔ اُس نے اُن کے سامنے پڑے ہوئے چارے کو پھرولا، کتوں کو ایک نظر دیکھا اور جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ جب وہ جھونپڑی میں پہنچا تو دیوی دوسری طرف کروٹ لیے ہوئے لیٹی ہوئی تھی اور اُس کی ہموار سانسوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا کھانا کونے میں لٹکائی ہوئی رسی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے لیٹ کر سو گیا۔

روشنی نے بوچہل کی آنکھوں میں سوئیاں سی چبھوئیں تو اُسے آنکھیں کھولنے میں ذرا دقت ہوئی۔ وہ ہمیشہ روشنی ہونے سے پہلے اُٹھا کرتا تھا لیکن اُس دن اُسے نیند نے دبائے رکھا۔ اُس کی آنکھوں کو تیز روشنی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں کچھ وقت لگا۔ جھونپڑی کے اندر ہلکی سی خنکی تھی اور اُس نے اِس ٹھنڈک کو اپنے جسم میں محسوس کرتے ہوئے ایک مطمئن سی انگڑائی لی اور دیوی کے سونے کی جگہ کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر باہر آیا، اِس وقت دیوی جھونپڑی کے مغرب میں سائے میں بیٹھی ہوتی تھی لیکن اُس وقت وہاں نہیں تھی۔ اُس نے ایک نظر بیلوں پر ڈالی، وہ رات کا چارہ کھا چکے تھے اور اُسے اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ پچھلے

کئی دنوں سے دریا کے کنارے سے ہاتھی گھاس کاٹ کر بیل گاڑی پر لا کر ذخیرہ کیے جا رہا تھا۔ اُس نے گھاس کا ہلکا سا کلاوہ بیلوں کے آگے ڈالا اور پھر دیوی کو نظر سے تلاش کرنا شروع کیا تو وہ اُسے اردگرد کہیں نظر نہ آئی۔ پھر اُس کے اندر کا فوجی جاگ اُٹھا اور وہ دل چسپی کے ساتھ دیوی کے قدموں کے نشانوں کے تعاقب میں چل پڑا جو دریا کی طرف جا رہے تھے۔ اُسے حیرانی بھی ہوئی کہ دیوی آج تک دریا کی طرف اکیلی نہیں گئی تھی۔ اب بوچہ مل کچھ پریشان بھی ہونے لگا۔ دریا اُن کی جھونپڑی سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اتنا نزدیک بھی نہیں تھا کہ دیوی چہل قدمی کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ دیوی کے چلنے کی رفتار تیز تھی اور وہ کہیں کہیں بھاگ بھی رہی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ رُکی تھی، شاید اپنی سانس بحال کرنے کے لیے۔

دریا کے آر پار جانے کے لیے ایک کشتی چلا کرتی تھی۔ وہ کشتی ایک چھوٹے سے گھاٹ پر آ کر رکتی تھی اور دیوی اُسی گھاٹ پر پانی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی دریا کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاید اُسے کشتی کا انتظار تھا یا شاید اپنے اکلاپے سے اُکتا کر دریا کے ساتھ مکالمہ کرنے آئی تھی۔ دریا کے اِس علاقے میں مگرمچھ کافی تعداد میں پائے جاتے تھے، گھاٹ کے اردگرد پانی خاصا گہرا تھا اور اُسے پانی میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی دیوی اچانک غیر محفوظ لگی۔ وہ دبے قدموں سے چلتے ہوئے دیوی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے خائف دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر دیوی نے پانی میں سے اپنی ٹانگیں باہر نکالیں اور بوچہ مل کی طرف بے تاثر نظر سے دیکھا:

''راجی! وہاں دم گھٹ رہا تھا، میں تازہ ہوا میں سانس لینے چلی آئی۔'' پھر وہ ایک بے مقصد چھوٹی سی ہنسی ہنسی، ''مجھے پتا تھا کہ آپ نے کھوج نکالتے یہاں تک پہنچ جانا ہے۔ تم جیسا آدمی جہاں حفاظت دیتا ہے وہاں کبھی غیر محفوظ بھی کر دیتا ہے۔ میرا کوئی پل کبھی ذاتی نہیں ہوا۔'' دیوی کی آواز تلخ تھی، بوچامل نے جواب نہیں دیا۔

''اِس گھاٹ کے اردگرد بڑے بڑے سنسار ہیں جو ریتوں پر لیٹے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اِس طرح ٹانگیں لٹکا کر پھر نا بیٹھنا۔'' بوچامل کی آواز میں پریشانی کا عنصر تھا۔

''تم کاشت کاری کرنا چاہتے ہو؟'' دیوی نے بوچہ مل کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پھر تلخ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!'' بوچہ مل نے محتاط مگر یقین سے بھرے لہجے میں جواب دیا۔

دیوی نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ بوچال کو اُس وقت وہ بہت خوب صورت لگی، اُس رات سے بھی زیادہ جب وہ اُسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ اپنی چھاتی سے کپکپا کر نکلتی ہوئی آہ کو نہ روک سکا۔ دیوی کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم کاشت کاری کرنا چاہتے ہو اور میں نے اپنے باپ کو کاشت کاری کرتے ہوئے دیکھا ہوا ہے۔ کاشت کار ہمیشہ غریب رہتا ہے۔'' دیوی واپس دریا کی طرف دیکھنے لگی۔ بوچال نے سوچا کہ جب وہ ایک گشتی فوجی تھا تو کبھی اتنا امیر نہیں ہوا تھا کہ اپنے لیے گھر بنا سکے۔ اُس کی زندگی کا وہ دور تو لوٹ کھسوٹ کا زمانہ تھا۔ وہ تلوار جسے وہ ایک درخت کے سپرد کر آیا تھا اُس کی رازق تھی اور اب اُس نے ہل کے پھل کو اپنا رازق بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دیوی کی بات نے اُس کے ارادے کو متزلزل تو نہیں کیا لیکن اُسے ایک شک میں ضرور ڈال دیا۔

''راجی! میں نے اپنے باپ کا پہلے کبھی ذکر نہیں کیا تھا، مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تمھاری ذات کے اندر ایک ایسی طاقت تھی جس نے مجھے سب سے دور کر دیا۔ رات سے وہ مجھے یاد آ رہے ہیں۔ کاشت کاری کرتے وہ سارا سال قدرت کی بے رحمی کے ساتھ لڑتے رہتے، قدرت کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ جب تم فوجی تھے تو تمھارا مقابلہ دوسرے فوجیوں کے ساتھ تھا اور کاشت کاری میں تمھارا مقابلہ قدرت کے ساتھ ہوگا۔ جہاں یہ تمھاری بہترین دوست ہوگی وہیں بدترین دشمن بھی ہوگی۔ اِس کے وار کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ یہ اِس پانی میں چھپے سنسار کی طرح ہے، اُسی کی طرح ڈبکی لگا کر آتی ہے۔ میں تمھیں منع نہیں کر رہی، میں تو تمھارا ساتھ نبھانے کا وچن دے چکی ہوں۔'' اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ بوچال اُسے ساتھ لگانا چاہتا تھا لیکن اُسی وقت دوسری طرف سے اُسے کشتی آتے ہوئے نظر آئی۔ وہ دونوں اپنی باتوں کو چھوڑ کر کشتی کو گھاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے لگے۔

جب کشتی نزدیک پہنچی تو وہ ایک طرف کو ہٹ گئے۔ کشتی خالی تھی۔ ملاح نے سوالیہ نظر سے اُن کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا، ''پار چلنا ہے۔''

بوچال نے کسی قدر پریشانی کے ساتھ ملاح اور پھر دیوی کی طرف دیکھا۔ دیوی کے چہرے پر کچھ دیر پہلے والا کھچاؤ نہیں تھا اور وہ دل چسپی کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

''نہیں!'' بوچال نے خشک لہجے میں جواب دیا اور پھر دیوی کی طرف خالی نظر سے

دیکھنے لگا۔

''میں نے اُس طرف سے گھاٹ پر کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا اور مسافر سمجھتے ہوئے تمھیں لینے کے لیے آ گیا۔'' ملاح کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک شگفتگی بھی تھی۔ ''میں نے کبھی کسی کو گھاٹ پر اِس طرح نہیں دیکھا کہ وہ یہاں بیٹھے ہوں اور پار نہ جانا ہو۔''

''ہم یہاں نئے نئے آباد ہوئے ہیں اور کبھی کبھی دریا کے کنارے آ بیٹھتے ہیں۔'' بوچہ مل نے وضاحت کی۔

''اِس طرف آبادی کم ہے اِس لیے یہ علاقہ غیر محفوظ ہے۔ تم لوگ کتنے ہو؟''

ملاح کے اِس سوال سے بوچہ مل ایک دم محتاط ہو گیا، اُس کے اندر کے سپاہی نے فوری طور پر زرہ بکتر پہن لیا۔ وہ پہلا وار کرنے کے بجائے اپنے مخالف کے وار کرنے کا انتظار کرنے لگا۔

''اِس پار سرکار کا اتنا عمل دخل نہیں ہے۔ جنگلیں اور زمین کی غیر ہمواری لوٹنے والوں کو چھپنے میں مدد دیتی ہے اِس لیے وہ کہیں پر بڑی واردات کرنے کے بعد گرد کے بیٹھ جانے تک اِس علاقے میں آ کر چھپ جاتے ہیں۔ یہاں اُنھیں اپنے کام سے کون روک سکتا ہے؟'' ملاح نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔ بوچا مل نے نیم اثبات میں سر ہلایا اور نیم انکار میں سر کو نفی کی بھی حرکت دی۔ ''تمبا کو پیتے ہو؟'' ملاح جواب کا انتظار کیے بغیر کشتی سے گندا سا چھوٹا حقہ نکال لایا۔ پھر اُس نے ادھر اُدھر پھر کر خشک لکڑیاں ڈھونڈیں اور آگ جلا کر کوئلے بننے کا انتظار کرنے لگا۔ بوچا مل دل چسپی کے ساتھ ملاح کو اپنے کام میں مصروف دیکھتا رہا۔

''میرا نام غلام بخش ہے اور میں دریا کے پار ایک بستی میں رہتا ہوں۔''

''بستی میں کتنے لوگ ہیں؟'' بوچہ مل نے پوچھا۔

غلام بخش نے لمحہ بھر سوچا، ''کل آٹھ گھر ہیں، پانچ مسلمانوں کے۔''

''دوسرے مسلمان گھر تمھارے رشتہ دار ہیں؟''

''نہیں!''

دیوی نے بوچہ مل کی طرف دیکھا۔ بوچہ مل نے اثبات میں سر ہلایا۔ غلام بخش اپنا حقہ لے کر اُن کے پاس آ گیا تھا۔ اُس نے ایک لمبا کش لے کر منہ سے دھواں نکالا، کڑواہٹ بھرے تمباکو کی میٹھی سی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔

''تمھارے بچے کتنے ہیں؟'' دیوی نے پہلی بار بات کی۔

غلام بخش قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، ''بہن جی! میں تو سمجھا تھا کہ تم گونگی ہو۔'' بوچا ل آواز نکالے بغیر ہنسنے لگا، دیوی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ بھی سر نیچے کر کے ہنسنے لگی۔

''ابھی تک کوئی نہیں، جب،'' غلام بخش نے آسمان کی طرف دیکھا، ''حکم ہوا آجائیں گے۔''

''تم ایک کام کرو؟''

غلام بخش نے متجسس سی حیرت کے ساتھ دیوی کی طرف دیکھا۔ پیشتر اس کے کہ غلام بخش اُس کی طرف دیکھتا، بوچہل نے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''کہو، بہن جی!'' اب غلام بخش اُتنا پراعتماد نہیں تھا۔

''تم ہمارے پاس آجاؤ۔ تم یہاں اپنا کام کرنا، راجی کاشت کاری کیا کرے گا اور ہم عورتیں دن.....'' غلام بخش نے قہقہہ لگاتے ہوئے دیوی کی بات کاٹی،

''دن سارا باتیں کریں گی۔'' تینوں ہنسنے لگے۔

''آپ کاشت کاری کریں گے؟'' غلام بخش نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں؟''

''دریا کے ساتھ ساتھ اِس طرف کوئی کاشت کاری نہیں کرتا اور اِس کی وجہ دریا کا مزاج ہے۔ دریا جب بھی بپھرتا ہے اِسی طرف آتا ہے اور اپنے ساتھ فصل، درخت..... گھاس تک لے جاتا ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہاں کاشت کرنے کا رواج نہیں۔'' غلام بخش نے ایک کش لیا۔ ''گھر والی سے بات کروں گا۔''

''تم لٹیروں کی فکر نہ کرنا۔ میں نے پوری عمر ایسے ہی کام کیے ہیں۔'' بوچا ل کی آواز میں رعونت تھی جس کا غلام بخش پر فوری اثر ہوا، اُس نے بوچہل کی طرف احترام کی نظر کے ساتھ دیکھا۔ ''میرا بھی مشورہ ہے کہ جیسے اِس..... میری پتنی نے کہا ہے تم ہمارے پاس آجاؤ۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' غلام بخش کی آواز میں اب اطاعت تھی، اُس کے سوال پوچھنے کا انداز ایک کم حیثیت والے کا تھا۔

''رائے بوچہل!'' دیوی نے مناسب نہیں سمجھا کہ بوچہل جواب دے۔

''آپ راجپوت ہیں؟'' پھر وہ ہنسنے لگا، ''مجھے یہ پوچھنا نہیں چاہیے تھا۔ آپ کے

چہرے کا دبدبہ ہی بتا رہا ہے۔'' پھر اُس نے ایک تنکا اُٹھا کر زمین پر لکیریں لگانا شروع کر دیں، وہ کسی سوچ میں گم تھا۔''اُس بھلی لوک سے کیا پوچھنا؟ ہم دو دنوں تک آپ کے پاس آ جائیں گے۔ مجھے آپ لوگ اچھے لگے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔''رائے جی! اب میں چلتا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آؤں تو ایک آدھ گھر اور بھی آ جائے۔''

بوچا مل نے کسی تاثر کے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔ غلام بخش اپنا حقہ اُٹھائے کشتی کی طرف چل پڑا!

غلام بخش کے ہمراہ اُس کے چچا کا بیٹا اپنی بیوی اور چھوٹے سے پھینے بیٹے کے ساتھ آ گیا۔ ونگوں میں جھاڑیوں اور جھاڑی نما درختوں کی بہتات تھی، اِن درختوں اور جھاڑیوں سے اُن دونوں نے اپنے لیے جھونپڑیاں بنائیں۔ تین گھروں کی اِس چھوٹی سی بستی میں زندگی ہر وقت حرکت میں رہتی۔ غلام بخش نے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دی تھیں جب کہ اُس کا بھائی عزیز بخش بوچہ مل کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹانے لگا۔ باجرے کی فصل، دانوں اور چارے، دونوں لحاظ سے اچھی ہوئی تھی۔ عزیز کے مطابق فصل کے اچھے ہونے کی وجہ اُن کی محنت تھی جب کہ بوچہ مل جانتا تھا کہ زمین کنواری تھی اور اُس نے ایسے ہی فصل پیدا کرنی تھی۔ مکئی کا جھاڑ باجرے سے بھی زیادہ تھا۔ غلام بخش ایک دن بہت بڑی مچھلی پکڑ کر لایا۔ دیوی اور بوچہ مل اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں کی ساجھے داری کر رہے تھے کہ دیوی نے غلام بخش کو دیکھا:

''میر بحر! یہ کیا لائے ہو؟'' اُس کی آواز میں حیرت اور خوف تھے۔ وہ مچھلی کو دیکھتے ہوئے دیکھ نہیں رہی تھی۔ اُس کے خیال میں یہ کوئی بلا تھی جو غلام بخش اُٹھا کے لے آیا تھا۔

''مچھلی۔'' غلام بخش نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''مچھلی!'' دیوی نے حیرت سے پوچھا۔ ''مچھلی تو چھوٹی ہوتی ہے، یہ تو......'' بوچہ مل قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''مچھلیوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، کچھ اِس سے بھی بڑی ہیں۔ دراصل بیاس کی مچھلی پورے دیش میں پسند کی جاتی ہے۔ یہاں بیاس میدانوں میں داخل ہو رہا ہے اِس لیے پانی ابھی تک ٹھنڈا، صاف اور صحت مند ہے اور اِسی وجہ سے مچھلی خوش ذائقہ اور صحت مند ہے۔'' بوچہ مل نے بات کاٹتے ہوئے دیوی کو سمجھایا۔

''تم تو مچھلی کے بارے میں ایسے بتا رہے ہو جیسے روز کھاتے ہو۔'' دیوی نے ہنستے

ہوئے اُس کا مذاق اڑایا۔

''کیوں نہیں کھائی؟'' بوچامل نے حیرت سے پوچھا۔ غلام بخش اور اُس کی بیوی ایک دم کھچاؤ میں آگئے اور اُن دونوں کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگے۔ دیوی کے دن قریب آچکے تھے، اُس کی سانس تیز چلنے کی وجہ سے بڑھا ہوا پیٹ پھولتا ہوا اور سکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے نتھنے بھی کانپ رہے تھے۔

''کب اور کیوں؟'' دیوی کی آواز میں جارحیت تھی۔

بوچہ مل کے ہونٹوں پر ایک خوابیدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ڈاڑھی اور مونچھوں کو سہلایا اور پھر غلام بخش کی طرف شرارت سے مسکراتے ہوئے دیکھ کر دیوی کو ایک بھرپور نظر سے دیکھا۔ اب اُس کی آنکھوں میں سختی آگئی تھی۔ ''میں جب آزاد زندگی گزار رہا تھا تو میرا کوئی دھرم نہیں تھا۔ میں ماس کھاتا اور رس پیتا تھا۔ مچھلی تو کھانے والی چیز ہے اور تم جس حالت میں ہو،'' اُس نے دیوی کے پیٹ کو دیکھا، ''مچھلی کا گوشت ان دِنوں میں صحت کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔''

دیوی نے بے یقینی کے ساتھ بوچہ مل کی طرف دیکھ کر نظر جھکالی۔

''مجھے سوچ کر ہی تے کی حالت ہو رہی ہے۔'' اُس نے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے غصہ اِس بات پر ہے کہ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں تھا کہ سب کچھ کھا لیتے ہو۔ مجھے دھرم سے زیادہ تم پر اعتبار ہے۔ تم نے کھانی ہے تو کھاؤ، مجھے کھانے پر مجبور نہ کرنا۔''

بوچہ مل نے غلام بخش کو اشارہ کیا اور وہ مچھلی کو لے کر اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا، اُس کی بیوی بھی اُٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اُن کی جھونپڑی سے مچھلی کے تلے جانے کی خوشبو آنے لگی۔

''میں نے ایک دفعہ تم سے دھرم بدلنے کی بات کی تھی!'' بوچامل نے اُس کے سامنے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ خالی نظروں سے غلام بخش کی جھونپڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ ''مچھلی پکائے جانے کی خوشبو نے میرے پیٹ میں ہلچل مچادی ہے۔'' دیوی نے بوچہ مل کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

''چکھ کے دیکھ لو۔'' بوچہ مل کی آواز سنجیدہ ہوتے ہوئے غیر سنجیدہ لگ رہی تھی۔

''چکھ تو لوں لیکن اُس وہم کا کیا کروں جس کی وجہ سے چکھنا ایک پاپ ہے۔'' دیوی کی

آواز میں اب کسی حد تک مصالحتی رنگ آ گیا تھا، بوچال نے بھی یہ تبدیلی محسوس کی۔

''مچھلی کھانا دھرم بدلنا ہوگا، ہم یہ دونوں کام کریں گے۔'' بوچال کو دیوی کی مدافعت آخری دموں پر لگی اور وہ گرم لوہے پر ہتھوڑا مار دینا چاہتا تھا۔ وہ متعدد بار ایسے حالات سے دوچار ہو چکا تھا جب دشمن کی مدافعت ختم ہو رہی ہوتی اور آخری وار کرنے کے لیے دشمن پر تمام طاقت کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا جاتا۔ ''شاید ایک اُلٹی آ جائے اور بس۔ اگر تم پکے ارادے کے ساتھ کھاؤ تو اُلٹی بھی نہیں آئے گی۔ مجھے نہیں آئی تھی۔''

''راجی! تم تو مہا پاپی ہو۔'' دیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم ایک مرتبہ شکار پر تھے، میوات میں۔ مجھے اُس ندی کا نام یاد نہیں، وہاں ہم رُکے۔ مہارانا نے حکم دیا کہ فوراً مچھلی پکڑی جائے اور پھر ہمیں مخاطب کر کے کہا: دنیا کی سب سے اچھی مچھلی اِس ندی میں ہوتی ہے۔ میں نے تب تک ماس نہیں کھایا تھا اور مہارانا نے فرض کیا ہوا تھا کہ میں پرانا پاپی ہوں اور ماس کھانا میرے لیے نیا نہیں ہے۔ میں نے بھی یہی ظاہر کیا۔ تمھاری طرح مجھے اُلٹی کا ڈر تھا لیکن مچھلی کا ذائقہ اتنا اچھا تھا کہ میں کھاتا ہی گیا۔'' بوچل نے ڈاڑھی سہلاتے ہوئے مونچھوں کو بل دیا اور غور سے دیوی کے چہرے کو دیکھا جو غلام بخش کے گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''میں چند دن پہلے سرکار کے کارندوں سے ملا تھا۔ بابر اب ہندوستان کا بادشاہ ہے، میں نے مہارانا کے متعلق کوئی خبر نہیں لی۔ یہ زمین جو اردگرد خالی پڑی ہے سرکار کے کارندے مجھے دینے کو تیار ہیں اگر میں کوئی فساد کیے بغیر بادشاہ کو لگان دیتا رہوں۔ میں ہندو ہوں اِس لیے وہ مجھ پر اعتماد کرتے جھجک رہے تھے۔ میں اپنی زبان دے آیا ہوں اور اگر وہ کچھ زمین مجھے اور دے دیں تو میں اُن کے دھرم میں داخل ہو جاؤں گا۔'' بوچال ایک دم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، بہت کم ہوا تھا کہ وہ ایسے ہنسا ہو۔ دیوی بھی حیرانی کے ساتھ اُسے دیکھنے لگی۔ ''مجھے صرف ختنہ سے ڈر آتا ہے۔'' دیوی بھی پلو منہ پر لے کر شرماتے ہوئے ہنسنے لگی۔

''مجھے تو سوچ کر ہی ہنسی آ رہی ہے۔'' اُس نے پھر پلو منہ پر لے لیا۔

''دیوی! میں نے بہت سفر کیا ہے۔ میرا ابھی کوئی گھر نہیں تھا۔ ہر دھرم کے لوگوں سے میری ملاقات اور تعلق رہے ہیں۔ جس طرح میرا کہیں گھر نہیں تھا اِسی طرح میرا کوئی دھرم نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے فرق، جیسے ختنہ، اگر نہ ہوں تو سب دھرم ایک ہی بن جاتے ہیں۔ اچھے کام

کرو، جو بھی دھرم ہو، تو تم اچھے آدمی ہو۔ ہر جگہ برائی کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ ہم اگر پاپی ہیں تو اِس میں ہمارے دھرم کا کیا قصور؟ دھرم تو ہمیں سچائی کی راہ دکھاتا ہے۔ اگر ہم بادشاہ کا مذہب لے لیں تو.....'' اُس نے دیوی کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا، ''ہم اُس کے لیے راستہ ہموار کر دیں گے۔''

دیوی نے پیار کے ساتھ اپنا پیٹ سہلایا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ خاموش بیٹھی خلا میں دیکھتی رہی۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور دریا کی طرف سے آنے والی ہوا اپنے ساتھ خنکی بھی پھیلاتی جاتی تھی۔ وہ کب تک خلا میں دیکھتی؟ اُس کی آنکھوں میں خلا نے اپنے ہونے کی رڑک پیدا کر دی تو اُس نے واپس بوچہ مل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اِسی انتظار میں تھا۔ دیوی نے پھر اپنا پیٹ سہلایا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، آنسوؤں سے بھری مسکراہٹ، جیسے دھوپ میں ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اب وہ اپنا پیٹ سہلاتی جاتی تھی اور مسکراتی جاتی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ رائے بوچہ مل خود غرض نہیں، ایک دنیادار آدمی تھا جو اپنے خاندان کی بہتری چاہتا تھا۔ اب اُس کی نظر میں محبت کی مٹھاس تھی۔ اُسے اپنے جسم میں محبت کے ساتھ ساتھ ایک بے چین سی گرماہٹ کا بھی احساس ہوا۔ اُس نے ایک خوف کے تحت پہلے اپنے پیٹ اور پھر بوچہ مل کی طرف دیکھا۔ ''میں ایک امتحان میں ڈال دی گئی ہوں۔'' اُس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کا محبت سے بھرا ہوا چہرہ یک دم بے تاثر اور لاتعلق سا ہو گیا تھا۔

''یہ ایسا مشکل امتحان بھی نہیں، دیوی۔ پہلے ہم دو تھے۔ اب ہماری نسل چلنے والی ہے جو کئی سو سال تک چلے گی۔ ہم نے اُنھیں وہ سب دے کر جانا ہے جو اُنھیں ہمیشہ دوسروں سے الگ اور جدا رکھے۔ میں جو زمین اپنے نام کرنا چاہتا ہوں یہ زمین اُنھیں ہمیشہ خود اعتمادی اور غرور دے گی۔'' بوچا مل کی آواز میں ایک طرح کی تھکاوٹ تھی، وہ ایک ایک لفظ احتیاط کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔ اُس کے نزدیک جہاں دیوی کو قائل کرنا اتنا مشکل نہیں تھا وہاں وہ اپنی رائے اُس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے دیوی کی طرف دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ دیوی نے ایک لمبی سانس لی، بوچہ مل کو لگا کہ وہ اپنے اندر ہمت کھینچ رہی ہے۔

''میں تیار ہوں۔'' دیوی کی آواز میں اعتماد تھا، وہ اپنی کشمکش پر قابو پا چکی تھی۔ بوچا مل نے تیزی کے ساتھ دیوی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے والی کم اعتمادی اور لاتعلقی کے بجائے ایک چمک تھی جو اُس کی آنکھوں سے پھوٹتی تھی۔ بوچہ مل نے اُٹھ کر اُس کا ماتھا چوم کر

آنکھوں پر ہونٹ رکھے جن میں محبت کی نمی آ گئی تھی۔

"پہلے ہم مچھلی کھاتے ہیں۔" بوچا مل کی آواز میں ایک بھاری پن تھا۔ دیوی نے خاموشی کے ساتھ بوچہ مل کو دیکھا۔ بوچا مل، غلام بخش کی جھونپڑی کی طرف چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا تو غلام بخش کی بیوی تھال میں مچھلی کے تلے ہوئے ٹکڑے رکھے اُس کے پیچھے تھی۔ وہ تھال کو دیوی کے سامنے رکھ کے اُن دونوں کو بے یقینی کے ساتھ دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

دیوی کسی قدر بے چینی اور کم اعتمادی کے ساتھ ہنسی اور پھر اپنے جسم کے کسی حصے پر بوجھ ڈالے بغیر دھیرج سے اُٹھی اور جھونپڑی میں سے دو رکابیاں اُٹھا لائی۔ بوچا مل نے ایک ٹکڑا رکابی میں رکھ کر دیوی کی طرف بڑھایا۔ دیوی نے جھجکتے ہوئے رکابی تھامی اور سوالیہ نظر کے ساتھ بوچہ مل کی طرف دیکھا، اُس کی نظر میں التجا تھی اور ایک اعتماد بھی جو کہہ رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ بوچہ مل نے ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیوی کا حوصلہ بڑھایا اور دیوی نے ٹکڑے کو اُٹھا کر سونگھا اور سر کی تعریفی اثباتی حرکت کے ساتھ دانتوں سے کاٹا، اُس چھوٹے ٹکڑے کو تیز تیز چبایا اور پھر ایک بڑا لقمہ بنا کر کھانا شروع کر دیا۔ نگلنے کے بعد اُس نے زبان سے سواد کی آواز نکالی اور سُو سُو کرتے اندر پانی لینے چلی گئی۔ بوچا مل نے بھی ایک ٹکڑا اُٹھا کر چبانا شروع کر دیا۔ دیوی پانی سے بھرا ہوا کٹورا لے کر باہر آ گئی۔

"کہا جاتا کہ مچھلی پیٹ میں جانے کے بعد بھی پانی مانگتی ہے۔" بوچہ مل نے دوسرا ٹکڑا اُٹھانے کے بعد دیوی کو بھی اشارہ کیا جس نے شرمیلی سی ہنسی ہنستے ہوئے اُس کی تائید کی۔

"دھرم کی تبدیلی کی طرف پہلا قدم۔" بوچا مل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ دیوی نے جواب نہیں دیا، وہ مچھلی کھانے میں مصروف رہی۔

"غلام بخش! غلام بخش ہوووووو!" بوچا مل نے ایک لمبی ہیک لگائی۔

دیوی اِس ہیک کے بعد سکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ خائف سی تھی اور گھبرائی ہوئی بھی۔ اُس کے ذہن میں ایسے ہی خیال گزرا کہ بوچہ مل دھرم بدلنے کا بندوبست کرنے لگا تھا۔ وہ دھرم بدلنے سے خائف نہیں تھی، وہ نئے دھرم کو اپنانے سے جھجک رہی تھی۔ وہ بوچہ مل کے سامنے اپنے آپ کو ایسے محسوس کرتی آئی تھی جیسے سیلاب کے سامنے مٹھی بھر بکھری مٹی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور بوچہ مل نے اُس کے آگے بند باندھنے کی کوشش نہ کی۔ دیوی ہلتی رہی، اُس کے

آنسو گرتے ر

روتے ہوئے

بوچہ مل کے چ

بوچہ مل نے لم

بخش ایک طرف

نظر آتا جسے و

عورت ہے، آ

کرانا چاہتا تھ

غلام بخش کو ایک

بوچہ مل کے س

نظر آیا جو ہر

ٹھہراؤ اور مٹ

آج اُسے بو

کے کنارے

آنسو گرتے رہے اور بوچا مل خاموشی کے ساتھ اُسے دیکھتا رہا۔ دیوی جب رو چکی، بوچا مل اُسے روتے ہوئے دیکھ چکا تو دیوی نے کسی تاثر سے خالی چہرے کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور وہ بوچہ مل کے چہرے کی شدت کی تاب نہ لا سکی۔

''میں تیار ہوں۔'' دیوی کی آواز میں ایک کپکپی تھی جیسے وہ اپنی بات ختم کر چکی ہو۔ بوچہ مل نے لمبی سانس خارج کرنے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے لیکن کوئی آواز نہیں نکالی۔ غلام بخش ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اُسے یہ لوگ اچھے لگتے تھے لیکن اُسے اِن میں کچھ ایسا بھی نظر آتا جسے وہ شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ دیوی اپنے ہی اندر خوش رہنے والی ایک عورت ہے، آج اُسے اُس کا اِس طرح پھوٹ کر رونا کچھ عجیب سا لگا۔ وہ آگے بڑھ کر اُسے چپ کرانا چاہتا تھا لیکن بوچہ مل کی خاموش نظر کے بھار نے اُس کے پاؤں اُٹھنے نہ دیے۔

''سامنے آؤ!'' بوچا مل کی سرگوشی پوس کی راتوں کی بے رحم ٹھنڈ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ غلام بخش کو ایک تلوار اپنے آر پار ہوتے محسوس ہوئی۔ وہ خوف زدہ سا بوچا مل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کل اپنے کسی عالم کو لاؤ، ہم نے تمھارے دھرم میں داخل ہونا ہے۔'' غلام بخش کو بوچہ مل کے ساتھ تعلق نبھاتے ہوئے کافی دِن ہو گئے تھے، اُسے بوچہ مل میں ہمیشہ ایک متحمل شخص نظر آیا جو ہر کوتاہی یا غلطی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا اور پھر درگزر کر دیتا، اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور مٹھاس ہونے کے باوجود ایسی سختی بھی ہوتی جو اپنے کہے ہوئے پر عمل درآمد کرواتی لیکن آج اُسے بوچہ مل کی سرگوشی سے ایک خوف محسوس ہوا۔ وہ بستی بستی گھوم کر مچھلی بیچتا آیا تھا اور دریا کے کنارے سے، جہاں آبادی کم تھی، کئی مرتبہ گھر واپس جاتے ہوئے دیر بھی ہو جاتی۔ اُن راتوں میں اُسے جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے کبھی کبھار پھنیر سانپ کی پہلے سرسراہٹ اور پھر شوکر سنائی دیتی۔ وہی شوکر وہ آج بوچہ مل کی آواز میں محسوس کرتا تھا اور اُس کے سامنے کھڑا خوف سے کانپتا تھا۔ اُس کا ذہن فوری طور پر خالی ہو گیا۔ اندھیرا ہوتی شام میں اُس نے سہارے کے لیے دیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ گھٹنوں میں سر دیے اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ وہ کچھ دیر اِسی طرح خالی ذہن کھڑا رہا، پھر بوچا مل کی بات اُس کے ذہن میں اپنا راستہ بنانے لگی۔ اُس کے جسم میں ایک خاموش سی کپکپی دوڑ گئی، وہ خوش بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔ اُس نے پانیوں کے دنوں میں بیاس میں اژدھے بہہ کر آتے دیکھے تھے جو کنارے لگنے پر کئی گھنٹے بے سدھ پڑے رہتے اور جب کوئی

بوچہ مل نے اپنا نام نہیں بدلا، وہ رائے بوچہ خاں بن گیا اور دیوی کا نام رابعہ رکھا گیا جو مُلا نے تجویز کیا تھا۔ اردگرد کی بستیوں کے سرکردہ مسلمان بھی بلائے گئے تھے، کلمہ پڑھنے سے پہلے دیوی اور بوچہ مل کو غسل دیا گیا اور پھر ایک دعوت کا اہتمام تھا۔ بوچہ خاں نے ایک بکرا ذبح کیا جسے دونوں ماہی گیروں کی عورتوں نے پکایا، سب نے مل کر کھانے کے بعد دعا کی اور بوچہ خاں کے ختنے کی رسم شروع ہوئی۔ مُلا اپنے ساتھ ایک نائی کو بھی لے کر آیا تھا جس نے ختنہ سے پہلے ایک بار پھر اپنے اُسترے کو تیز کیا اور ایک اُسترا بوچہ خاں کو تھمایا کہ وہ رسم سے پہلے اپنے زیرِ ناف بالوں کو صاف کر آئے۔ پھر بوچہ خاں کو ٹانگیں کھول کر بٹھا دیا گیا اور بانس کی چھوٹی سی کڑکی اُس کی مردانگی پر ایسے چڑھا دی گئی کہ فالتو ماس اونٹ کے نچلے ہونٹ کی طرح آگے کو لٹک گیا۔ بوچہ خاں کو کوئی خوف نہیں تھا، اِس طرح بیٹھنے سے وہ اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا اور اُسے اپنے آپ پر ترس بھی آ رہا تھا اور وہ اِس طرح بیٹھے کچھ شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا چناں چہ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا اور پھر تیز سے درد کا ایک مختصر سا کوندا اُس کے جسم میں دوڑ گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر نیچے دیکھا تو نائی گوبر کی نیم گرم سواہ کی ایک پوٹلی سی بنا کر اُس کی مردانگی کے گرد باندھ رہا تھا۔ اُس گرم سواہ نے اُسے قدرے سکون دیا۔ بوچہ خاں پھر آنکھیں بند کر کے شام گئے تک اُسی طرح بیٹھا رہا اور رابعہ اُس کے گرد پریشانی کے چکر کاٹتی رہی۔

مُلا کو بوچہ خاں کی ہدایت کے مطابق مکئی اور باجرہ دیا گیا جو غلام بخش اُس کی بستی تک پہنچا کے آیا جو دریا کے پار تھی اور جہاں سے وہ خود اُٹھ کر آیا تھا۔ نائی بھی وہاں کا ہی رہنے والا تھا اور فیصلہ ہوا کہ وہ بوچہ مل کے زخم کے بھر جانے تک وہیں رہے گا۔ بوچہ خاں لنگوٹی میں سارا دِن ٹانگیں کھولے مایوس سا بیٹھا رہتا۔ وہ زندگی کو آگے چلانے میں یقین رکھتا تھا اور مذہب کی تبدیلی اُس کی اِسی سوچ کا حصہ تھا۔ ٹانگیں کھول کر اِس طرح بے عمل بیٹھے رہنا اُسے بے مقصد لگا لیکن وہ جانتا تھا کہ اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ نائی دِن میں تین مرتبہ گرم سواہ کی پٹی تبدیل کرتا۔ نائی

اُسے یہ بھی بتاتا کہ بوچہ خاں کی عمر کی وجہ سے سخت ماس کے بھر جانے میں وقت زیادہ لگتا تھا۔ چند دنوں کے بعد بوچہ خاں نے اپنے لنگوٹ میں تھوڑا چلنا شروع کر دیا، صرف اتنا کہ زخم پر ڈول نہ پڑے، نائی اُسے بار بار یہی بتاتا کہ ڈول پڑنے سے زخم تازہ ہو سکتا ہے۔

''میرے آقا! زیادہ نہ چلو! ماس کھروا ہے اور اس نے اپنی عمر کی رفتار سے ہی بھرنا ہے۔ کچا ماس ابھی تک کب کا بھر گیا ہوتا۔'' بوچہ خاں جب زیادہ چلنے لگتا تو نائی اُسے فوراً ٹوک دیتا۔ بوچہ خاں کو اپنی بے بسی پر غصہ آتا اور ہنسی بھی۔

''بے صبرے نہ بنو راجی!'' رابعہ اُسے مشورہ دیتی۔ ''ہر کام کو وقت لگتا ہے۔ تم تو پرانے سپاہی ہو اور جانتے ہو کہ زخم راتو رات نہیں بھرتے۔''

''بھائی جی! کیسے ہو اب؟'' غلام بخش اور اُس کے چچا زاد عزیز بخش کی بیویاں روز آ کر پوچھتے ہوئے پلوؤں میں منہ چھپا کر ہنسنے لگتیں۔ بوچہ خاں اُن کے ہنسنے کی وجہ جانتا تھا، اور شرمندہ سی مسکراہٹ ہی اُس کا جواب ہوتا۔

''عزیز کو بھیجو جعفرو!'' بوچہ خاں نے اپنی شرمندگی پر قابو پاتے ہوئے عزیز کی بیوی سے کہا۔ نتھی، غلام بخش کی بیوی، رابعہ کے پاس چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد عزیز آ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا اور اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ نائی پہلے ہی بوچہ خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا کام کر رہے تھے؟'' بوچہ خاں نے اُس کے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رائے جی! ہل چلانے کے بعد میں ٹکریں گوڈ رہا تھا۔ گندم کی بوائی سر پر آ گئی ہے۔'' اُس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

''ہاں کام زیادہ ہے اور مجھے یہ ماں یاوا مسئلہ ہو گیا۔'' بوچہ خاں نے اپنے لنگوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عزیز بخش نے اپنے قہقہے کو دبایا:

''ہمیں ایک اور جوگ کی ضرورت ہے۔'' بوچہ مل نے لنگوٹ کو کستے ہوئے کہا۔

''ضرورت تو ہے۔ ایک گھر یہاں آنا چاہتا ہے ویسے آپ کو اب ہل نہیں چلانا چاہیے۔ ہماری طرح وہ بھی دو مرد ہیں اور دونوں میرے ساتھ کام کریں گے۔''

''وہ کون لوگ ہیں؟''

''لبانے۔ اُن کی ایک ہی عورت ہے اور وہ بھن جی کے کام کیا کرے گی۔ آپ نے ہمیشہ اِس جھونپڑی میں تو نہیں رہنا اس لیے ایسی عورت کی ضرورت ہے۔''

بوچہ خاں سوچ میں پڑ گیا۔ چند دنوں سے وہ بھی کچھ ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ اُسے با قاعدہ گھر اور مزید مویشیوں کی ضرورت تھی۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُس کی چند مجبوریاں بھی تھیں۔ وہ مالی طور پر ابھی اتنا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ تمام اخراجات کر سکتا۔ سردیاں زیادہ دور نہیں تھی اور اُس کا بچہ جھونپڑی میں نہیں پلنا چاہیے۔ وہ اپنی نسل کو اِس علاقے کا یا بعد میں وہ جہاں بھی جائیں، سردار بنانا چاہتا تھا اِس لیے بچے کا جھونپڑی کے بجائے گھر میں پلنا ضروری تھا۔

''میں بھی یہاں آباد ہونا چاہتا ہوں، مجھے اپنے رزق کی خوشبو اِس سُرخ مٹی میں سے اُٹھتے ہوئے محسوس ہو رہی ہے۔'' نائی نے بوچہ خاں کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہے۔ کسی دن جا کر اپنا سامان اُٹھا لاؤ۔'' بوچہ خاں کے ذہن میں تین گھروں کی یہ آبادی ایک بڑی بستی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس کے ذہن نے دیکھا کہ چاروں طرف گھروں کی قطاریں ہیں اور فضا میں گوبر کے دھوئیں کی بو دور سے محسوس کی جا سکتی ہے، گلیوں میں بچوں کا شور ہے اور کنوئیں پر عورتوں کے قہقہے سنائی دے رہے ہیں۔ اُس نے پھر چاروں طرف نظر دوڑائی اور اُسے آبادی کے اِس علاقے میں ایک خرابی نظر آئی۔ اُس نے جب یہاں ڈیرہ ڈالا تھا تو اُس وقت اپنے آپ کو چھپانا اولین ترجیح تھی اور اب جب اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آیا تھا تو اُسے اپنی بستی بسانے کے لیے کسی بلند جگہ پر جانا ہوگا تا کہ پانی کے نکاس کا بندوبست رہے اور اگر مسلح ہو کر کسی حملہ آور کا مقابلہ کرنا پڑے تو بستی والے بلندی پر قلعہ بند ہو کر حملہ آور کا جارحیت سے مقابلہ کر سکیں اور بوقت ضرورت نیچے اُتر کر جوابی حملہ بھی کر سکیں۔

''ہمیں تھوڑا آگے جا کر آباد ہونا ہوگا، وہ وہاں پر،'' اُس نے مغرب میں ایک ٹبے کی طرف اشارہ کیا،'' تا کہ ہم بلندی پر ہوں، بارش کا پانی وہاں نہ ٹھہرے اور دریا میں جب پانی آیا ہو تو ہم تک پہنچ نہ سکے۔''

''کنوئیں کھودنا ٹبہ پر مشکل ہوگا۔ ہم جہاں بھی جائیں کنواں پہلے کھودنا ہوگا۔ ہاڑ کے آخری دنوں سے دریا کے پانی کا رنگ تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پینے کے قابل نہیں رہتا۔ ہمیں ایک کھوئی تو فوراً کھودنی چاہیے۔'' عزیز بخش اُس ٹبے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ''میں سوچ

رہا ہوں، کہ اگر ہم یہیں آباد ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے دریا کے پانی کے راستوں کو دیکھا ہے وہ اتنی دور تک کبھی نہیں آیا۔ اُس حساب سے یہ علاقہ محفوظ ہے، یہاں زمین کے نیچے پانی بھی گہرائی میں نہیں۔ تیسرا مبے پر گیلی مٹی تو نکل آتی ہے لیکن پانی کافی نیچے ہوگا۔'' عزیز کی باتوں میں بوچہ خاں کو ایک منطق نظر آئی۔ اب اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے نظر دوڑانا شروع کر دی۔ اُس کے ذہن میں اپنا پہلے والا تاثر چکر کاٹنے لگا، اُسے اچانک وہ جگہ کھلی اور مناسب لگنے لگی۔ ٹبا اپنے تمام مثبت عوامل کے باوجود مستقبل میں آبادی کے پھیلاؤ کو سنبھالنے کے لیے ناکافی تھا اور یہی وہاں منتقلی کے خلاف جاندار عنصر تھا لیکن اُس کے اندر کے سپاہی نے اُسے اونچی جگہ کو قبضے میں رکھنے کو کہا۔

''نہیں! ہم مبے پر ہی جائیں گے، کنواں کھودنے میں تھوڑی محنت ضرور کرنا پڑتی ہے، پانی تو نکل ہی آئے گا۔''

بوچہ خاں نے اپنا گھر درمیان میں رکھا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دوسرے لوگوں کو اپنے اپنے گھر بنانے کے لیے جگہ دے دی۔ وہ سب دریا میں بہہ کر آتے ہوئے دیوداروں اور کنارے کے چھوٹے چھوٹے جنگلوں سے اپنی ضرورت کی لکڑیاں لا کر اپنے گھر بنانے میں لگ گئے اور چند دنوں کے بعد وہاں ایک چھوٹی سی بستی بن گئی۔ شام کو گھروں سے دھواں اُٹھتا اور دور سے آبادی میں زندگی کی آوازیں سنی جاتیں۔ بوچہ خاں ہر شام دریا کی طرف جا کر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ جاتا اور اپنی آبادی کے شور کو سنتا۔ وہ شور اُسے اپنی کامیابی اور ایک طرح سے خدمت بھی لگتا۔ وہ کبھی کبھار اپنی زندگی کی یکسانیت سے اُکتا بھی جاتا لیکن یہی یکسانیت اُسے زندگی بھی لگتی جیسے گام گام چلنے والا گھوڑا کتنے فرسنگ بھاگ سکے گا؟

لبانے اپنے دو بیلوں اور بھینس کے ساتھ آئے تھے۔ بوچہ مل نے اُنھیں اپنے ساتھ کام پر لگانے کے بجائے اُنھیں کچھ زمین کاشت کرنے کو دے دی جس کا وہ اُن سے لگان وصول کرتا۔ وہ اپنی بستی کے لوگوں کے ساتھ محبت سے پیش تو آتا لیکن کسی کی غلطی پر معاف کبھی نہ کرتا.....اُس کی سزائیں سخت ہوتی تھیں۔

وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا بستی کو دیکھ رہا تھا۔ بستی اور اُس کے درمیان کے کھیتوں میں ہل چلا ہوا تھا اور وہ گندم کے بیج کے ایسے منتظر تھے جیسے عورت ڈھیلا بدن کیے مرد بیج کے انتظار میں

لیٹی ہو۔ اُسے اپنے پیچھے مخصوص چاپ سنائی دی۔ وہ چوکنا ہو کر چاپ کی رفتار کے ٹوٹنے کے انتظار میں بیٹھ گیا جو اُس کے قریب آ کر ختم ہو گئی، یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک انجان راستہ موڑ کے بعد فوراً ختم ہو جائے۔ وہ بظاہر اپنے خیالوں میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔

''بوچہ مل! خیریت سے ہو؟'' وہی بھاری آواز جس میں تمسخر کی آمیزش تھی۔

''ہاں رام بھروسے! تم؟'' بوچہ خاں نے پہلی مرتبہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے رام بھروسے کو دیکھا جو اُسے حالات کا مارا ہوا لگا لیکن اُس کی آنکھیں ہوا میں تیرتی تھی۔ بوچہ خاں کے ذہن میں موسلا دھار بارش کی طرح یادوں کے تار بہہ نکلے۔

''جو بھی سمجھ لو۔ تمھیں ڈھونڈنے میں بہت وقت لگا۔'' رام بھروسے نے اردگرد نظر دوڑائی، وہ ہل چلے کھیتوں اور بے پر آبادی کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا، ''تم نے نئی زندگی شروع کر لی ہے۔ ہمارے ساتھی ابھی تک اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے۔'' رام بھروسے نے ایک لمبی سانس لی جس میں شکست اور ایک حسرت تھی۔

''تم یہاں کب سے ہو؟ میری خبر کے مطابق تم اردگرد عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہو، لوگ تم سے ڈرتے بھی ہیں۔''

''میرا اپنے لوگوں کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے اِس لیے میرے متعلق یہ رائے کیسے بن گئی!'' بوچہ خاں کی آواز میں اُکتاہٹ تھی، اُسے اپنے متعلق لوگوں کا کسی قسم کی رائے قائم کرنا پسند نہیں آیا تھا۔

''تمھارے یہاں سے لوگ اردگرد اپنے کاروبار کے سلسلے میں جاتے ہیں اور قدرتی سی بات ہے کہ تمھارے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کر کے اپنی اہمیت بڑھاتے ہیں۔'' بوچہ خاں کے ذہن میں عزیز بخش آ گیا جو ہر روز مچھلی پکڑ کر بیچنے جاتا تھا اور کشتی کے ذریعے اکا دکا سواری بھی ڈھوتا تھا اور پھر نائی بھی کہیں نہ کہیں جاتا ہی رہتا تھا۔

بوچہ خاں نے کوئی جواب نہیں دیا، دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اگلی بات کرنے یا اگلا سوال پوچھنے سے خائف تھے۔

''میں نے دھرم بدل لیا ہے۔'' بوچہ خاں نے خاموشی کو توڑا۔ یہ کہہ کر اُس نے پلے کو ہٹا کر اپنے ختنے ننگے کر دیے۔ رام بھروسے نے ایک نظر دیکھ کر اُسے ڈھانپنے کا اشارہ کیا۔

''تبدیلی آ گئی ہے۔'' اب اُس کی آواز میں تمسخر نمایاں تھا۔''عقل مندی تھی۔'' وہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔''مہارانا اب نہیں رہا۔'' اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر رانا سانگھا کی منزل کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔''ظہیر الدین بابر اب ہندوستان کا بادشاہ ہے۔'' بوچہ ل نیم روشن شام میں دیکھے بنا رام بھروسے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا۔ مہارانا کی موت کی خبر سن کر اُسے اپنا سانس بند ہوتے ہوئے محسوس ہوا، اُسے لگا کہ اتنا بڑا آدمی کچھ حاصل کیے بغیر ہی چتا میں ڈل گیا۔

''ہم نے یہ جنگ جاری رکھنی ہے، میدان اور ہتھیار مختلف ہوں گے۔ میں چاہوں گا کہ میری نسلیں اِس علاقے کی حکمران ہوں، دلّی میں جس کی بھی حکومت رہے۔''

بستی میں دیے جلنا شروع ہو گئے تھے اور تھوڑا نیچے بیٹھے ہوئے بلندی پر روشنیاں بوچہ خاں کو چھوٹی سی دیوالی کی طرح لگیں۔

''میں تمھارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔'' بوچہ خاں کو رات کی تاریکی اپنے اندر سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُسے اپنا آپ اُس اندھیری اور سیلی کوٹھری کی طرح لگا جس میں داخل ہوتے ہی دم گھٹنے لگے۔ اُسے اچانک دیوالی، لوہڑی کی تاریک رات لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے ساری عمر فیصلے کیے ہیں اور مرتے دم تک کرتے ہی جانا ہے۔

''نہیں!'' بوچہ خاں نے مختصر لیکن پُراعتماد جواب دیا۔

بستی سے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

ایک طویل خاموشی کے بعد رام بھروسے نے ایک لمبی سانس لی۔

''تم نے اپنی آبادی کا کوئی نام رکھا ہے؟''

''کبھی سوچا نہیں۔'' بوچہ خاں کی آواز میں طنز تھا۔

''بستی کا نام رکھنا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا پیدائش کے جلد بعد بچے کا نام رکھنا۔''

''کبھی سوچا نہیں۔'' بوچہ ل نے دہرایا۔ اِس دفعہ آواز میں طنز کے بجائے دل چسپی تھی۔

میں ایک نام دوں۔''

بوچہ خاں پہلی مرتبہ کم اعتمادی کا شکار تھا۔ وہ نظر نیچی کیے بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ رام بھروسے اندھیری رات میں دن کی روشنی کی طرح دیکھ سکتا تھا۔

''اپنی بستی کا نام ماڑی بوچیاں رکھو۔''

جس طرح قدموں کی چاپ آئی تھی، اُسی طرح واپس چلی گئی!

چند گھروں کی صورت میں ماڑی بوچیاں آباد ہوگیا اور جیسے کہ ہر آبادی میں ہوتا ہے کہیں سے کتے بھی آ گئے جو چند گھروں کے گرد کھانا سونگھتے اور ڈھونڈتے رہتے۔ وہ یا تو کسی گھر کے سامنے جہاں کچھ پک رہا ہوتا، ایک ٹکڑے کے انتظار میں نتھنے پھیلائے، زبان لٹکائے بیٹھے رہتے اور یا پھر کسی دیوار کے سائے یا سردیوں کی دھوپ میں لیٹے اپنے نھیسے چاٹتے رہتے۔ رائے بوچا خاں کا کوچی جوڑا اب بوڑھا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ کتیا نے دو جھول جنے لیکن کوئی پلا بچا نہیں۔ اب کتیا سارا دِن گھر میں جہاں بھی اُسے آرام کرنے کو جگہ ملتی وہاں سوئی رہتی اور پوری رات چھت پر بیٹھی حفاظت کرتی۔ منہ اندھیرے جب رابعہ دودھ سنبھالنے کے بعد چاٹی میں مدھانی ڈال رہی ہوتی تو کتیا چھت سے نیچے آتی۔ رابعہ جانتی تھی کہ پوری رات کے جگراتے نے اُسے بھوک لگا دی ہے، وہ فوراً رات کی باسی روٹی اور دودھ اُس کی کنالی میں ڈال دیتی۔ کتا اب گھر میں کم ہی آتا۔ اگر اُس کا بوچہ خاں کے ساتھ کہیں سامنا ہوجاتا تو وہ شرمسار سا، سر جھکائے اُس کے پیچھے پیچھے گھر تک آتا اور موقع ملتے ہی کھسک جاتا۔ گاؤں کی آوارہ کتیوں کا جب موسم آتا تو کتے اُن کے قرب کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے اور طاقت ور کتا کتیا کے قریب بیٹھتا یا جفتی کرتا جب کہ کمزور کتے ایک قطار میں بیٹھے ہانپتے ہوئے اُنھیں دیکھتے رہتے۔ کوچی سب سے طاقت ور تھا اور بہار پر آئی ہوئی کتیا کے پاس بیٹھا ہوتا اور پھر دو یا تین موسموں کے بعد کوچی کتیا کے قریب سے ہٹ کر قطار میں بیٹھ گیا۔ ایک لڑائی میں اُسے گردن اور چھاتی پر گہرے زخم آئے اور کسی قسم کی مرہم پٹی نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ زخموں میں کیڑے پڑ گئے۔ اب اُس سے چلا پھرا بھی کم جاتا تھا اور نظر بھی تقریباً جاتی رہی تھی۔ رائے بوچہ کے ساتھ دس سال گزارنے کے بعد وہ ایک دن اندھا ہوکر، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مرگیا۔

رائے بوچہ کو اُس کے مرنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کوچی کتیا بھی اب سارا دن گھر کے ایک کونے میں لیٹی رہتی۔ رابعہ اُس کی خوراک کا باقاعدگی سے خیال رکھتی۔ کتیا بیمار تو نہیں تھی

لیکن بڑھاپا ایک بیماری کی طرح اُس کے ساتھ چپک گیا تھا۔

ایک سردیوں کی شام وہ بھی مر گئی۔ مہندرو لبانی نے جب اُسے مرے ہوئے دیکھا تو اُس نے اپنے گھر جا کے خاوند رام کو بتایا جو چپکے سے کتیا کو کھینچ کر لے گیا اور گاؤں کے باہر ایک خالی کھیت میں پھینک آیا۔

''مہندرو! مجھے کئی دنوں سے ڈبی نظر نہیں آئی۔'' ایک دن رابعہ نے سپاٹ سی آواز میں پوچھا، ایسے لگ رہا تھا کہ وہ سوچ کچھ اور رہی ہے۔

''بی بی جی وہ تو مر گئی۔'' مہندرو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''کب؟'' رابعہ کی آواز سپاٹ ہی تھی۔

''دو، تین دن ہوئے، میں نے آپ کو پتا چلے بغیر اپنے گھر والے کو بتا دیا تھا جو اُسے کھینچ کر لے گیا۔''

رابعہ کچھ دیر کھڑی اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹتی رہی۔ وہ اب ایک جوان عورت نہیں تھی لیکن اُس کی خوب صورتی اُسی طرح اُس کی شخصیت کو سنوارے ہوئے تھی۔ مہندرو نے محسوس کیا کہ اُس نے ایک لمحے کے لیے رابعہ کے اندر ایک بوڑھی عورت کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ رابعہ نے ایک لمبی سانس لی اور مہندرو کو اپنے سامنے پرکشش بی بی کھڑی نظر آئی۔

''مجھے بتا ہی دیتیں؟'' اب رابعہ کی آواز میں پچھتاوے کا عکس تھا۔

''میں نے سوچا کہ آپ پریشاں ہوں گی۔'' مہندرو نے سچ کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔ رابعہ بعض اوقات بدلحاظ بھی ہو جاتی تھی۔

''پھر بھی بتا دینا چاہیے تھا۔'' رابعہ کی آواز میں سختی آ گئی تھی۔

''جی بی بی جی۔'' مہندرو نے ہتھیار پھینک دیے۔

''مہندرو! اِس جوڑی نے نے میری ایک لمبے عرصے تک حفاظت کی۔ میں کیکروں کے ایک جنگل میں تن تنہا رہا کرتی تھی۔ ایک تنبو اور اُس کے اندر میں اور باہر یہ کوجی جوڑی۔ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ میں اتنی ہی محفوظ تھی جتنی کہ اب ہوں۔ راجی جنگوں پر گئے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ ہیں بھی کہ نہیں.....'' اُن دونوں کو پتا نہ چلا کہ کب شکر اللہ وہاں آ کر باتیں سننے لگا تھا۔''..... مجھے یہ بھی پتا تھا کہ مجھ تک پہنچنے والا مجھ تک اُسی وقت پہنچتا جب یہ

دونوں مارے جاتے اور مجھے یقین تھا کہ انھیں مارنا اِتنا آسان نہیں ہے۔" رابعہ نے ایک لمبی ساری آہ بھری۔ "اب تو اپنے کام نمٹا کے جا، تیرا بندہ گھر آ گیا ہوگا۔" اور پھر اُس کے چہرے پر ایک پُر اسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "سن!" رابعہ نے سرگوشی کی۔ مہندرو چلتے چلتے رُک گئی۔ "سب کہتے ہیں کہ دونوں بھائی تیرے بندے ہیں۔ تو اُنھیں کس طرح بھگتاتی ہے؟" مہندرو کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ رابعہ نے کبھی کسی کے ساتھ اُس کی ذاتی زندگی کی بات نہیں کی تھی؛ وہ ہمیشہ کم بولتی اور اُس سے بھی کم سنتی۔ اُسے رائے بوچہ نے بھی یہی کہا ہوا تھا کہ عورتوں کے ساتھ زیادہ گھُلنے سے گاؤں میں اُن دونوں کے وقار پر اثر پڑے گا۔

"دیکھو دیوی!" وہ کہتا۔ "یہ عورتیں گھروں میں جا کر اپنے مردوں کو سب کچھ سناتی ہیں اور مرد سوچتے ہیں کہ یہ عورت تو ہماری عورتوں کی طرح ہی ہے؛ یہ سب مل کر ایک ہی طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ تب ہم اور وہ ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں جو مجھے قطعاً پسند نہیں۔ کل شکر اللہ نے اِن لوگوں پر حکومت کرنی ہے۔" شکر اللہ کا ذہن میں آتے ہی رابعہ نے غیر حاضر دماغی کے ساتھ صحن میں نظر دوڑائی تو وہ اُس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ رابعہ کو ایک دم خیال آیا کہ شکر اللہ نے کہیں اُس کی بات تو نہیں سُن لی؟

"کب سے کھڑے ہو یہاں؟" رابعہ نے سختی سے پوچھا۔ عام طور پر وہ شکر اللہ کے ساتھ نرم اور میٹھے لہجے میں ہی بات کیا کرتی تھی۔

"اماں! تم اکیلی ہوتی تھیں اور رائے صاحب جنگوں پر گئے ہوتے۔" اور شکر اللہ نے فرضی تلوار کے ساتھ بیک وقت تین دشمنوں کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ "میں بڑا ہو کر کیا جنگوں پر نہیں جا سکتا؟" شکر اللہ نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" رابعہ نے سختی سے جواب دیا۔ "ہر کوئی جنگوں پر نہیں جاتا۔"

"رائے صاحب تو گئے تھے۔" اُس نے ضد کی۔

"تب لوگ جاتے تھے، اب نہیں جاتے۔" رابعہ کی آوز میں ابھی تک سختی تھی۔

"اب کیوں نہیں جاتے؟" شکر اللہ تھوڑا متزلزل ہو گیا تھا۔

"اب کھیتی باڑی کرتے ہیں۔"

شکر اللہ نے بائیں ہاتھ میں ہتھی پکڑ لی اور دائیں میں پرائن جس سے وہ "تتا تا مریں

تو....'' کہتے ہوئے ہل چلانے لگا۔

''شیطان! تو نکیا! چل اُدھر بیٹھ میں آتی ہوں۔'' رابعہ نے جھلانی میں رکھی دو پیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شکراللہ تا تا کرتا ہوا ایک پیڑھی پر جا کر بیٹھ گیا۔

رابعہ کے ہونٹوں پر پھر سے پُراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مرنی! تم نے بتایا نہیں؟''

''کیا بی بی جی؟'' مہندرو شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''کہ دو خاوند کیسے بھگتاتی ہو؟'' رابعہ کا پورا جسم ایک گہرا تجسس بنا ہوا تھا۔

''بی بی جی! غربت۔ اُس کے چھوٹے بھائی کی کہاں شادی کریں، بیوی کے لانے کے علاوہ دوسرے اخراجات بھی ہیں۔ ایک دن میرے خاوند نے کہا کہ وہ چھوٹے بھائی کی شادی کے اخراجات نہیں اُٹھا سکتا اور میں اُس کے ساتھ تعاون کروں اور اُس کے چھوٹے بھائی کو بھی اپنا خاوند ہی سمجھوں۔ پھر میں اُس کے پاس چلی بھی گئی۔ وہ میرا ہی منتظر تھا، اب تو وہ کھلم کھلا بات کرتے ہیں۔ ہم تینوں کے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔'' شروع میں مہندرو جھجکی تھی لیکن پھر اُس نے سوچا کہ چھپانے کا فائدہ نہیں کیوں کہ بستی کے سب لوگ اس واقعہ سے واقف ہیں اور انکار کرنا بے وقوفی تھی۔

رابعہ کو ایک دم رائے کی بات یاد آ گئی اور وہ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اُن کے درمیان میں کوئی بات نہیں ہوئی، شکراللہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ رابعہ ایک لمبی عورت نہیں تھی لیکن اُسے کسی طرح بھی چھوٹی قد والی عورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شکراللہ اُس کے کولہے تک آ گیا تھا۔ وہ جب بھی شلوار کا آزار بند باندھتی تو اُسے اپنا گھاگھرا یاد آ جاتا جو ڈھیلا ڈھالا ہونے کے ساتھ ساتھ ہوادار بھی تھا۔ وہ شلوار قمیص میں اپنے آپ کو آرام سے محسوس تو کرتی لیکن اُسے ایک تنگی کا احساس رہتا۔ رائے نے بھی چوغا نما قمیص اور تنگ پاجامے کی جگہ کرتا اور تہہ بند اپنا لباس بنا لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لباس علاقے کی تہذیبی روایت کے مطابق ہونا چاہیے۔

ماڑی بوچیاں کی آبادی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہاں ایک اور میو خاندان آ کر آباد ہو گیا جن کا بچوں کا ایک جھول تھا اور جو گھروں کے ارد گرد آوارہ کتوں کی طرح پھرتے رہتے۔ اُن کے آنے سے نیم خوابیدہ سی بستی میں ایک ہلچل ضرور پیدا ہوئی تو وہاں رائے

کے پاس ایک خاندان اور آ گیا جو ارد گرد کی بے آباد زمین کو آباد کرنے میں اُس کے ہاتھ بن گئے۔ وہ مسلسل زمین زیرِ کاشت لانے کے بعد اُسے سرکار کے کاغذوں میں اپنے نام کرواتا جاتا اور کبھی لگان دینے میں دیر نہ کرتا۔

''راجی! تم ساری زمین اپنے ہی نام کیوں کروائے جا رہے ہو؟'' رابعہ نے پوچھا۔ وہ ایک شام جھلانی کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔

''کس کے نام کرواؤں؟ میوؤں یا لبانوں کے!'' اُس نے بختی سے پوچھا۔

''زمین بے آباد ہے اور ہم جتنی چاہیں آباد کر لیں۔ جتنی زمین اپنے نام کر رہے ہو اُتنی ہی شکر اللہ کے نام بھی کرو۔'' رابعہ نے ہر لفظ سوچتے ہوئے بولا۔ اُسے رائے کے مزاج کی اچانک برہمی کا علم تھا۔ بات کرتے ہوئے اُس نے اپنی نظر نیچے ہی رکھی۔

''تمھیں شک ہے کہ میں اور عورت لے آؤں گا!'' رائے بوچہ خاں کی آواز میں نہ ہی تلخی تھی اور نہ کسی قسم کی مصالحت میں ڈوبی ہوئی تھی، ایسی بے زاری لیے ہوئے تھی جس میں ریت پر چمکتے ہوئے سورج کی گرمی تھی۔

''میں نہ یہ چاہتی ہوں اور نہ ہی سوچتی ہوں، صرف ایک تجربے کی زبان بول رہی ہوں۔''

''کون سا تجربہ؟'' رائے نے دل چسپی سے پوچھا۔

''میرے پتا جو بھی جائیداد بناتے اپنے بیٹوں میں بانٹ دیتے تا کہ اُن کے بعد اولاد تلواروں سے فیصلے نہ کرنے لگ جائے۔'' رابعہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اُن کا خاندان بڑا تھا اور ایسا کرنا عقل مندی تھی۔ ہم تو یہاں صرف تین لوگ ہیں۔ ہمارے کوئی رشتے دار بھی نہیں جو کسی طرح دعوے دار بن جائیں۔'' وہ رکا، اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی، ''ہم ہل لے کر مرغوں کی بانگوں سے پہلے ہی نکل جاتے ہیں اور اندھیرا ہونے تک بھوکے اور پیاسے ناہموار زمین جس پر کئی قسم کے درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں، انھیں بھی نکالتے ہیں۔'' رائے بوچہ ملِ دھیمے سے لہجے میں بات کر رہا تھا:

''تم بھی ہل چلاتے ہو؟'' رابعہ کی آواز میں الزام تھا۔

''شانت!'' رائے نے ہنستے ہوئے اُسے روکا، ''میں ہل نہیں چلاتا اور یہ لوگ مجھے چلانے بھی نہیں دیں گے۔ میری موجودگی سے یہ لوگ کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اگر میں وہاں نہ

جاؤں تو یقیناً کام کی رفتار اُتنی نہ ہو جتنی کہ ہے۔ تم نے شکر اللہ کے نام بھی زمین لگوانے کی بات کی تھی،'' رائے بوچہ خاں کی آواز میں پھر بے زاری لوٹ آئی تھی، ''میو اور لبانے جس طرح کام کر رہے ہیں، مجھے اُن کے نام بھی تھوڑی تھوڑی زمین لگوا دینی چاہیے لیکن اگر میں ایک سر سا ہی بھی کسی کے نام لگواؤں تو وہ آج میرے اور کل شکر اللہ کے مقابلے میں آجائے گا۔ میں ہر چیز اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہوں تا کہ کسی دوسرے کو ملکیت کا خیال ہی نہ آئے۔ تم شکر اللہ کو پیار کیا کرو ضرور لیکن جتایا نہ کرو۔ بچہ غیر ضروری لاڈ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ میرا باپ کسی قصور کے بغیر ہی مجھے چابکوں سے مارتا اور یا ہاتھ کس کر گھوڑے کے پیچھے باندھ کر اُسے چابک مار دیتا۔ مجھے چیخنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ جھلانی کے باہر کا ماحول ایک نیا رُخ لے گیا تھا۔ ''میں یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد بھی اُس کے خوف میں زندہ تھا اور یہ خوف تب نکلا جب میں ایک لشکر میں شامل ہوا۔ یہ لودھی بادشاہوں کے خلاف جنگوں کا آغاز تھا جو بابر کو لے آئیں۔''

اُسی وقت شکر اللہ ایک طوطا پکڑے ہوئے آیا، اُس نے طوطے کو دم اور پروں سے پکڑا ہوا تھا جب کہ طوطا اپنی آزادی کے لیے شور کرتے ہوئے پنجے مارے جا رہا تھا۔

''ادھر آؤ۔'' بوچا خاں کی آواز کسی بھی تاثر سے خالی تھی۔ ''طوطے کو ایسے نہیں پکڑتے۔ اِس کی چونچ تلوار کی طرح تیز ہوتی ہے، یہ اُنگلی کو ہاتھ سے الگ بھی کر سکتا ہے۔ ادھر لاؤ، میں طوطا پکڑنا سکھاتا ہوں۔'' شکر اللہ نے دل چسپی کے ساتھ طوطا اپنے باپ کی طرف بڑھایا، ''دیکھو، سب سے پہلے اِس کی گردن قابو کرتے ہیں تا کہ یہ اپنی چونچ کو استعمال میں نہ لا سکے۔ چونچ کو ناکارہ کرنے کے بعد اِس کے پروں کی طاقت کو ختم کرتے ہیں اور وہ ایسے،'' اُس نے اُنگلی اور انگوٹھے سے گردن کے گرد زنجیر کا دائرہ بنا کر چھوٹی انگلی سے پنجے پکڑے باقی انگلیوں کے ساتھ طوطے کو ہتھیلی میں قابو کر لیا۔ ''تمھاری عمر میں مَیں نے طوطے پالے بھی ہوتے تھے۔ پرانے درختوں کے اندر تقریباً غار ہی بنے ہوتے تھے جن میں طوطے لشکروں کی طرح رہا کرتے تھے۔ آج بھی ایسے ہی ہوگا؟''

''ہاں! آج بھی یہ بوڑھے درختوں میں رہتے ہیں۔ چاچے بخشو کا بیٹا طوطا ماہر ہے۔''

''میرا تو خیال تھا کہ وہ صرف مچھلی ماہر ہیں۔'' رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''غور سے سنو!'' رائے کی آواز میں غصہ تھا، ''اُسے صرف بخشو کہا کرو۔ اُس کی عزت ضرور کرو لیکن رشتہ مت بناؤ۔ رشتہ اپنائیت دیتا ہے۔ اُسے تم سے ڈرنا چاہیے۔''

''جی رائے صاحب!'' شکر اللہ نے طوطے پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

''کبھی زمین کا چکر لگایا ہے؟''

''نہیں!''

''روز جایا کرو اور تمھیں فصل کے ایک ایک پودے کا پتا ہونا چاہیے۔''

''زمین فاصلے پر ہے اور فصل بھی دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ روز چکر لگانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔'' شکر اللہ نے جواب دیا۔ اُس کے اندر فصل کا چکر لگانے کی خواہش ایک دم جاگ اُٹھی، ''اگر میں دو دن میں چکر مکمل کر لوں۔''

''نہیں! تمھاری ہر جگہ حاضری ضروری ہے۔ تم دن میں جتنی مرتبہ ممکن ہو حویلی کا چکر لگا کر جانوروں کو دیکھا کرو۔ دودھ اپنے سامنے نکلوایا اور نگرانی میں گھر پہنچوایا۔ اور ہاں.... میں دو گھوڑیاں خرید رہا ہوں۔ تمھارے لیے مقامی دیسی گھوڑی اور اپنے لیے سندھی۔'' گھر میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ''رابعہ! جیسے سورج ڈوبے، ابھی اندھیرا نہ ہوا ہو، صحن میں دیا جلا لیا کرو۔''

رابعہ اُٹھ کر دیا جلانے چلی گئی۔

''صبح میرے ساتھ چلنا اور جب گھوڑیاں آ جائیں تو میرے ساتھ مال خانے بھی جایا کرنا۔ میں نے تمھیں سرکاری عہدے داروں سے ملایا کرنا ہے۔'' رائے نے فیصلہ سنایا، ''اور اب جا کر سو جاؤ۔''

رابعہ جب صحن کے سامنے والے کمرے کی دیوار میں رکھنے کے لیے دیا رکھ کر آئی تو رائے بوچہل اونگھ رہا تھا۔

ابھی گہرا اندھیرا تھا جب بوچہ خاں، شکراللہ کو جگانے گیا تو وہ اُس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اُسے باپ کے ساتھ جانے کی خوشی اور تجسس نے سونے نہیں دیا تھا۔ اُس نے تمام رات کروٹیں بدلتے اور آسمان کو دیکھتے گزاری کہ اچانک غیر متوقع بادل نہ آ جائیں۔ جیسے ہی بوچہ خاں اُس کی چارپائی کے پاس گیا تو شکراللہ ایک جست کے ساتھ چارپائی سے نیچے آ گیا۔

''یہ ایک کامیاب ہونے والے آدمی کا چارپائی سے اُترنا تھا جو بے ہوش ہو کر سونے سے کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔'' بوچال نے اندھیرے کو نظروں سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''میں گہری نیند سوتا ہوں لیکن اُس کے ساتھ ہلکی سی آہٹ پر جاگ جاتا ہوں اور میرا دماغ اُتنا ہی چوکس ہوتا ہے جتنا سونے سے پہلے تھا۔''

''میں بھی ایسے ہی سویا کروں گا۔'' شکراللہ نے اپنے باپ سے متاثر ہو کر سعادت مندی سے کہا اور اُس کے پیچھے گھر سے باہر کی طرف چل پڑا۔

''تم حویلی کے سامنے ٹھہرو میں عزیز اور رام کو بلا کر لاتا ہوں۔''

''وہ خود نہیں آتے کیا؟''

''وہ دن کے تھکے ہوتے ہیں اور اگر اُنھیں جگائیں نہ تو دوپہر تک سوئے رہیں۔ وہ ملازم تو ہیں لیکن کام میں اُن کی دل چسپی ہماری طرح نہیں ہو سکتی۔'' رائے نے اُسے سمجھایا۔

''آپ حویلی کا چکر لگائیں، میں دونوں کو لے کے آتا ہوں۔''

رائے بوچہ خاں کو لگا کہ شکراللہ ایک رات میں ہی طوطے پکڑنے والے بچے سے ذمے داری سنبھالنے والا آدمی بن گیا ہے۔ وہ اپنی تمام تر کامیابی کے باوجود اپنے آپ کو ایسا اکیلا آدمی محسوس کیا کرتا تھا جس کی کشتی کو بیگانے کھے رہے تھے۔ اُس نے اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کی کہ اُسے لگا وہ آسمان کو چھو رہا ہے۔ اُس نے ردِعمل کے طور پر آسمان کو دیکھا جو تاروں سے تو بھرا ہوا تھا لیکن تاروں نے جھلملانا بند کر دیا تھا۔

اُس نے حویلی کا چکر لگایا۔ رام لبانے کے بھائی چندر کی چارپائی، جو حویلی میں سوتا تھا، خالی تھی۔ وہ لوگوں کے جاگنے سے پہلے ہی ضروریات کے سلسلے میں باہر نکل گیا تھا اور یا پھر یہاں سوتا ہی نہیں تھا؛ اُسے اچانک دونوں بھائیوں کا ایک ہی عورت کے ساتھ رہنا یاد آ گیا۔

رائے نے کھرلیوں کا چکر لگایا، مویشی کھرلیاں خالی کر کے مطمئن سی جگالی میں مصروف تھے۔ اُس نے چاروں بیلوں کو باری باری پاؤں کی ٹھوکر سے اُٹھایا، اُن کی کوکھ بھری ہوئی تھیں اور اُسے وہ سارا دن کام کرنے کے لیے تیار لگے۔ اُسے چکر لگاتے دیکھ کر دودھ دینے والی بھینسوں میں سے دو بھینسیں اُٹھ گئیں اور دودھ نکلوانے کی سکون بخش لذت کے انتظار میں اپنے کلوں کے گرد چکر لگانے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُن کے حوانے اور کوکھ بالترتیب دودھ اور چارے سے بھرے ہوئے تھے۔ رائے نے سوچا کہ ایک زمین دار کے لیے اِس سے زیادہ اور سکون بخش چیز کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کی بھینسیں اور بیل رجے ہونے کی وجہ سے دودھ دینے اور ہل چلانے کے لیے بے چین ہوں۔

شکر اللہ جب آیا تو رائے مطمئن سا حویلی کے درمیان میں اُس کی واپسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔

''چلو ہم چلتے ہیں، وہ ہمیں وہاں مِل جائیں گے۔'' رائے نے حویلی سے نکلتے ہوئے کہا۔

''رام کو مشکل سے جگایا۔''

''تھک جاتا ہے۔ عزیز کو جگاتے ہوئے تو اتنا مسئلہ نہیں ہوا ہوگا۔'' رائے نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ پہلی آواز پر ہی اُٹھ بیٹھا تھا۔ مجھے لگا کہ اُس کی تو نیند پوری ہو گئی ہے۔'' شکر اللہ کی آواز میں استعجاب تھا۔

''لبانے ایک طرح کے کمی ہیں۔ کھیتی باڑی کا اتنا شوق نہیں رکھتے، بس صبح آرام سے اُٹھے، ڈاڑھی اور کیسوں میں کنگھا کر کے کہیں باہر نکلتے ہیں۔ اور عزیز.....'' رائے تھوڑا سا ہنسا، ''میو تو مچھلی پکڑنے اُس وقت نکل جاتے ہیں جب وہ جاگی بھی نہیں ہوتیں۔''

رائے آگے چلے جا رہا تھا اور شکر اللہ اُس کے پیچھے چلتے ہوئے بار بار آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ نیچے اُسی طرح اندھیرا تھا، ستارے ابھی کم ہونا شروع نہیں ہوئے تھے لیکن آسمان پر اُجالے کی ہلکی سی چادر پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔

''ابھی تک میری زمین داری موسم کے آسرے پر ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ قدرت پر مکمل انحصار چھوڑ کر ایک کنواں کھودوں اور پانی کا اپنا ہی ذریعہ بنالیا جائے۔''

''کہاں کھودیں گے؟'' شکراللہ نے شوق سے پوچھا۔ اُس کا دل فوراً کنواں کھودا جانے کو کرنے لگا۔

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جہاں ہم آج جا رہے ہیں وہاں ہی کھودوں گا۔ کل وہیں کام کرتے رہے تھے اور تھوڑی کھدائی کے بعد ہی گیلی مٹی نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ تجربے کے طور پر میں نے کل انھیں تھوڑا گہرا کھودنے کو کہا تو لگا کہ کیچڑ نکل رہا ہے۔ اس کا مطلب کہ پانی دور نہیں ہے۔ لیکن کئی مرتبہ یہ بھی ہو جاتا ہے کہ گیلی مٹی آنے کے بعد زمین کی خشک تہہ آ جاتی ہے جو چلتے ہی چلی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی اور جگہ ڈھونڈنا پڑتی ہے۔'' رائے نے رُک کر آسمان کو دیکھا اور ارد گرد نظر دوڑائی، ''وہ لوگ بھی حویلی سے نکل پڑے ہیں۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' شکراللہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''جب ہم نے کچھ سننا ہو تو آوازوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں؛ ایک نزدیک اور ایک دور۔ جب رُک کر میں نے نزدیک کی آوازیں سننے کی کوشش کی تو کچھ بھی سُنائی نہیں دیا اور جب دور سننے کے لیے کان لگائے تو ماحول میں ایک لرزش سی تھی اور جب اُس لرزش پر توجہ دی تو بیلوں کے گھنگھرو سنائی دیے۔ اب سنو!'' وہ رُک گئے۔ شکراللہ نے سانس روک لی اور تھوڑی دیر کے بعد سانس خارج کرتے ہوئے مسکرا کر رائے کی طرف دیکھا:

''ہاں! سنائی دی۔ گھنگھرو میں نے بھی سن لیے۔'' شکراللہ کی آواز میں خوشی تھی۔

''میں جب فوجی تھا تو ہم گھوڑوں کی ٹاپیں سنا کرتے تھے۔ بعض اوقات ٹاپوں کی دھمک سننے کے لیے ہم زمین پر کان لگاتے۔''

''وہ کیوں؟''

''آواز تو آ رہی ہوتی تھی لیکن تعداد کا بھی پتا لگانا ہوتا تھا۔ زمین پر کان لگاتے ہی ہر چیز واضح ہو جاتی۔ ہمیں گھوڑوں اور بیل گاڑیوں میں زیادہ دل چسپی ہوتی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں کانوں پر دور بجتے ڈھول کی طرح لگتیں جب کہ بیل گاڑیاں کانوں کے پردوں پر عجب طرح کی گدگدی کرتیں۔''

روشنی ہونا شروع ہو گئی تھی اور بیلوں کی آوازیں واضح ہو گئی تھیں؛ کبھی کبھی باتوں کی

آواز بھی آ جاتی۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہاں زمین صاف کر کے ہموار کر دی گئی تھی اور دور تک آدمی کی کمر تک کی گھنی جھاڑیاں، چھوٹے چھوٹے کیکر اور کریر پھیلے ہوئے تھے۔ شکر اللہ منظر کے سحر میں گم ہر تفصیل کو اپنے اندر جذب کیے جا رہا تھا۔ اُسے اپنے باپ پر رشک بھی آ رہا تھا کہ اُس نے کس طرح جنگوں اور معرکوں میں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار زندگی گزاری تھی۔ وہ ہواؤں، خاموشی، زمین کے اندر اور باہر کی زبان سمجھتا تھا۔ اُسے یک دم ایک خیال آیا:

''جس طرح تم لوگ زمین پر کان لگا کر ٹاپوں کی آواز کی زبان سمجھ جاتے تھے تو لوٹ مار کے لیے جاتے ہوئے تم لوگوں کی ٹاپوں کی آوازوں کی زبان بھی کوئی سمجھ لیتا ہوگا۔''

بوچاال، شکر اللہ کی طرف دیکھ کر پیار سے مسکرایا:

''مجھے اِس سوال کی توقع نہیں تھی۔ ہم نے لوٹ مار کے لیے مخصوص گھوڑے اور آدمی رکھے ہوئے تھے،'' رائے نے شکر اللہ کے متوقع سوال کے پیشِ نظر تیزی سے کہا، ''میں بھی اُن چند لوگوں میں شامل تھا۔ ہمارے گھوڑے مسلسل کارروائیوں سے تربیت یافتہ تو ہو ہی چکے تھے اور ہم نے سموں کے لیے خاص تھیلیاں بھی بنائی ہوتی تھیں جو چلنے سے پہلے چڑھا دی جاتیں۔ ہم نے کان لگا کر وہ آوازیں سنیں تو ایسے لگتا تھا جیسے کوئی شے گھسیٹی جا رہی ہو۔ عموماً گھوڑے قدم ملا کے بھاگتے ہیں لیکن یہ گھوڑے قدم نہیں ملاتے تھے اِسی لیے گھسیٹے جانے کا تاثر ملتا تھا۔''

بیلوں کی جوڑیاں اب نظر آنے لگی تھیں اور رائے، شکر اللہ کو وہیں چھوڑ کر کیکر کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی قطار کے پاس جا کر اُنھیں غور سے دیکھنے لگا۔

''کریر کے کانٹوں سے بچنا'' رائے نے وہاں سے آواز لگا کر شکر اللہ کو تنبیہ کی، ''اگر یہ کانٹا چبھ جائے تو تاپ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اُن دونوں نے تو وہاں کام کرنا ہے۔'' شکر اللہ نے جواب دیا۔

''اُن کو کانٹا چبھنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔'' رائے نے ہنستے ہوئے کہا۔

عزیز اور رام نے ہل اُتار کے جُولے اُتارے اور بیل باندھ کر اپنی کسیاں سنبھال کر رائے کے پاس چلے گئے۔

''ہمیں تیسرا مہینہ ہو گیا ہے اِس بہن چود زمین کو پدرا کرتے ہوئے، یہاں جھاڑیاں بہت زیادہ ہیں، ابھی تک ہمیں اتنی جھاڑیوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا'' رائے نے کام شروع کرنے سے پہلے ہلکی پھلکی بات چیت سے اُن کی حوصلہ افزائی کی۔

''راجی! تین مہینے تو کچھ بھی نہیں۔'' پھر اُس نے رائے کو آنکھ ماری، ''تین مہینوں میں تو رام اور چندرو، مہندری کو گھس بھی نہیں کر سکے۔''

''کیوں رام!'' رائے نے اپنی آواز میں دلچسپی اور مزاح نہیں آنے دیے۔

''یہ ماں کا خصم ایسے ہی بھونکتا ہے سارا دن۔ ہم کون سی مچھلی کھاتے ہیں۔'' رام کی آواز میں مایوسی تھی۔

رائے نے بات کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ ''اب جھاڑیاں نکالنا شروع کرو۔ میں بیلوں کے پاس بیٹھا ہوں۔ جھاڑیاں ضائع نہ ہوں، ان کا بالن بنانا ہے۔'' رائے نے خشک لہجے میں کہا۔

جھاڑیوں کی جڑیں مناسب سی گہرائی تک تھیں اور انھیں نکالنے کے لیے ایک گڑھا کھودنا پڑ رہا تھا۔ رائے کے طنزیہ سے خشک مذاق نے دونوں کے بیچ ایک مقابلہ شروع کروا دیا تھا، اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ جڑیں نکالنے کی کوشش میں تھے۔ شکر اللہ دلچسپی سے انھیں کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جھاڑیوں میں سے چڑیاں اور تیتر اُڈاریاں مار کے اُڑتے جا رہے تھے۔ اُس نے ایک چھڑی ڈھونڈی اور اُسے ہاتھ میں لے کر جھاڑیوں کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ اب جھاڑیوں میں سے پرندوں کے علاوہ سانپ بھی نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ وہاں سے مختلف قسم کے سانپ نکل رہے تھے؛ کچھ خاکی تھے اور کچھ کالے، کچھ کوڈیوں والے تھے تو کچھ خاکستری، کچھ اتنے لمبے تھے کہ وہ ڈر جاتا اور کچھ اِتنے چھوٹے کہ انھیں پاؤں تلے بھی مسل سکتا تھا۔ اُس کا جب اِس دلچسپ تلاش سے جی بھر گیا تو واپس آ کر عزیز اور چندرو کے پاس بیٹھ گیا اور جھاڑیوں کے گرد کھودے گئے گڑھوں سے نکلنے والی گیلی مٹی کو دیکھنے لگا۔ وہ اُس مٹی کو مٹھی میں بھر کر اُس کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا اور پھر گولہ بنا کر دور پھینک دیتا۔ اب وہ اُکتاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا اور اُسے بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

انھیں وہاں آئے ہوئے ایک پہر کے قریب ہوا تھا کہ دو عورتیں اُن کے لیے شاویلا لے آئیں۔ عزیز کی بیوی سیدھی رائے کے پاس آ گئی۔ اُس کے چھابے میں پراٹھے، مکھن، انڈے، اچار، پیاز اور کٹی ہوئی مرچیں تھیں۔ رائے ہر کھانے کے ساتھ پیاز اور مرچ ضرور کھاتا۔ دوہنا لسی سے بھرا ہوا تھا اور اوپر رکھی کولی میں نمک کی ڈلی تھی۔

دوسرے چھابے میں چپڑی ہوئی تنور کی روٹیاں، سالن، اچار اور مکھن کا چھوٹا سا پیڑا

تھا۔ لسی کے بھرے ہوئے دو ہنے کے اوپر بھی نمک کی ڈلی رکھی تھی۔ رام کی بیوی عزیز کے لیے حقہ بھی لے کر آئی تھی۔ رائے نے عزیز کو وہاں حقہ رکھنے کی اجازت نہیں دی ہوئی تھی، حقہ صرف کھانے کے وقت پر ہی آتا جسے عورتیں جاتے ہوئے واپس لے جاتیں۔

رائے اُنھیں انسانوں اور جانوروں کے درمیان میں کہیں رکھ کر ہانکتے ہوئے کام لینے کے بجائے کام لیتے ہوئے ہانکتا۔ رائے نے اُن کی محنت کا صلہ یا حصہ کبھی نہیں رکھا تھا لیکن اُن کے ساتھ کبھی ہمدردی نہیں کی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد عزیز حقہ لے کر بیٹھ گیا اور اُس کی بیوی سامنے بیٹھ کر باتوں میں مشغول ہو گئی جب کہ رام نے بیلوں کا چکر لگایا جو بیزار سے بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔

''شام سے پہلے ہم نے پدری کی ہوئی زمین پر ہل چلانا ہے، چندرو کو کہنا کہ تھوڑا سا چارا لے آئے۔ کام شروع کرنے سے پہلے یہ کچھ پیٹ میں ڈال مار لیں۔'' رائے نے مہندرو سے کہا۔

''کہہ دوں گی راجی۔'' مہندرو نے بغیر وجہ کے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

عورتیں چلی گئیں اور رائے اُٹھ کر صاف کی گئی جگہ پر چلا گیا جو کام کے شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ وہ زمین کے اِس ٹکڑے کو اپنے نام کروانے کے بعد اِس میں گندم لگانا چاہتا تھا اِس لیے اُس کی کوشش تھی کہ اِسے جلد از جلد پدرا کروا لے۔

''شکر اللہ! بات سنو۔''

شکر اللہ نے اپنے آپ کو اہم محسوس کیا۔

''میں جا رہا ہوں۔''

''کہاں؟'' شکر اللہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''میں نے یہاں کنواں کھدوانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کھودنے والوں اور دیواروں کے ساتھ لگانے کے لیے اینٹوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ تم یہاں خیال رکھنا۔ کام میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔''

''نہیں ہو گی۔'' شکر اللہ نے ایک شان کے ساتھ کہا۔

''اور اُن کو پتا نہ چلے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔''

''نہیں پتا چلے گا۔'' شکر اللہ نے اکڑ کر جواب دیا!

اُس سال رائے نے قدرت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے کنویں کے پانی سے گندم بیجی۔ اُس نے کنویں کی دیواروں کے ساتھ باریک اینٹیں لگوائیں جو دیکھنے کے لیے آنے والوں کے لیے عجب نظارہ تھیں۔ جب کنواں لگ رہا تھا تو اردگرد یہی بات ہو رہی تھی کہ بوچہ کے زوال کا آغاز ہو گیا ہے۔ کنواں لگانا ایک مہنگی سرمایہ کاری تھی کیوں کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کنویں سے پانی بھی نکلے گا کہ نہیں! اگر کنویں سے پانی نہ نکلے تو وہ اپنے ساتھ پیسوں کی بوریاں بھی لے ڈوبتا ہے۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ اِس ریتلے اور خشک علاقے سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں نکلنی لیکن بوچہ خاں لاتعلقی سے ایک برتر سی مسکراہٹ بکھیرتا رہتا۔

ایک رات رابعہ نے بھی اِس خدشے کا اظہار کیا۔

''دیکھو رابعہ! یہاں نہ صرف پانی ہے بلکہ بہت زیادہ ہے۔ ہم نے یہ نہیں دیکھنا کہ اردگرد کا علاقہ خشک نظر آ رہا ہے، جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے سے نکلنے والی گیلی مٹی کہہ رہی ہے کہ نیچے پانی کا دریا بہہ رہا ہے۔ تم بالکل فکر نہ کرو، پانی نکلے گا۔'' رابعہ مطمئن نہیں ہوئی، صرف ایک لمبی سانس لے کر بے یقینی کے ساتھ خاموش ہو گئی۔

جب کنواں چلا تو دور دور سے لوگ پانی نکلتا دیکھنے آئے، پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ گاؤں کی عورتیں وہاں نہانے اور کپڑے دھونے آتیں اور بوچہ خاں کو دعائیں دیتیں۔ کنواں چالو ہوتے ہی بوچہ خاں نے وہاں بوڑھ کی ایک بڑی ساری شاخ کو کنویں کے شمال میں ایسے زاویے سے لگایا کہ جب جڑیں پکڑ کر درخت بنے تو گرمیوں میں دوپہر سے لے کر شام تک کنویں پر سایہ رہے اور اُس کی پرورش بوچہ خاں نے اپنے ذمے لے لی۔

پہلے سال جب زمین کنواری تھی اور کنویں کا پانی اُسے نم پہنچا تا رہا تو گندم کے بوٹے بہت گھنے اور قد آور تھے، فصل کی دور دور تک دھوم تھی اور لوگ اِسے دیکھنے آتے۔ بوچہ خاں کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اِس گھنی اور قد آور گندم کا سٹا بہت چھوٹا اور کمزور تھا جس کے نتیجے میں

دانا ہلکا، چھوٹا اور سکڑا ہوا تھا۔ اِسے کاٹنے اور گاہنے کے لیے بوچہ خاں نے مانگی ڈلوائی۔ لوگ گندم کاٹنے آئے تو ڈھول بجا کر اُن کا سواگت کیا گیا، مانگیوں کے لیے دیگیں چڑھائی گئیں اور لسی کی چاٹیاں واڈوں کی قطاروں کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوتیں۔ اِسی طرح جب گاہنے والے اپنی جوڑیاں لے کر آئے تو اُن کا بھی ڈھول بجا کر خیر مقدم کیا گیا۔ گندم کے مایوس کُن جھاڑ کے ساتھ بھوسے کی درجنوں بڑی بڑی دھڑیں بن گئیں جو بوچہ خان کی ضرورت سے کافی زیادہ تھیں۔ بھوسے کی یہ دھڑیں کسی کام تو لانی چاہئیں؟ بوچا خاں ہر وقت یہی سوچتا رہتا۔ ایک دن اُس نے گھوڑی کَسی اور بھوسے کے حل کے لیے نکل پڑا۔ وہ کلانور تک گیا اور وہاں ایک بیوپاری سے سودا کر آیا جو سرکار کے اصطبلوں کو راتب مہیا کرتا تھا۔ اُن کے بیچ سودا پندرہ سو میں طے پایا۔ یہ کبھی ہوا نہیں تھا کہ کسی نے بھوسا بیچا ہو۔ لوگ پہلے تو اُسے احمق سمجھے اور جب اُن پر اِس سودے کی اہمیت واضح ہوئی تو اُس کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ کسی نے کبھی اتنا بڑا سودا نہیں کیا تھا۔ دور دور کے دیہات کے سربراہ بوچہ خاں سے سودے اور کنواں لگانے کی تفصیل جاننے اور پانی کی زیرِ زمین موجودگی کا پتا چلانے کے طریقوں کا معلوم کرنے آتے۔

رائے بوچہ خاں اب مشہور آدمی تھا اور اُس سے ملاقات کے لیے روزانہ کوئی نہ کوئی آیا ہوتا۔ سرکاری اہل کار اب اُس سے ملنے اور اردگرد کے زمین داروں سے لگان وصولی کے لیے ماڑی بوچیاں آتے اور علاقے کے حالات پر تبادلہء خیال کرتے۔ وہ اُسے دہلی جا کر دربار میں حاضری کا مشورہ بھی دیتے جس کا بوچہ مل خاموش سی مسکراہٹ سے جواب دیتا۔

بوڑھ نے جڑیں پکڑ لی تھیں اور اُس کی شاخوں پر پرندے بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ ماڑی بوچیاں کے گرد دور دور تک کوئی درخت نہیں تھا اور یہ بوڑھ بچہ راہیوں اور مسافروں کو اپنی طرف بلانے لگا تھا۔ وہ اپنی پوٹلیوں سے پتے دیلا نکالتے اور کنویں کے ٹھنڈے پانی کے گھونٹوں کے ساتھ کھاتے اور تمبا کو پینے اور ستانے کے بعد بوچہ خاں کو دعائیں دیتے اپنی منزلوں کی طرف چل پڑتے۔ کنویں کو اب بوڑھ والا کھو کہا جانے لگا۔

بوچا مل کنویں پر دن گزارتا۔ اُس نے بوڑھ کے جوانی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے دیکھ کر اُس کے سائے میں بیٹھنا شروع کر دیا اور جو راہی وہاں رکتا، اُس کے ساتھ علاقے کے معاملات اور حالات پر تبادلہء خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو باخبر رکھتا۔ اُسے پتا بھی نہ چلا اور وہ

تمبا کو پینے لگا۔ شام ہونے سے پہلے وہ کنویں سے اُٹھ کر دریا کی طرف نکل جاتا جب کہ اُس کی چارپائی اور حقہ میوں کا کوئی لڑکا گھر پہنچا دیتا۔ وہ گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر جا کر گاؤں کو دیکھتا رہتا اور وہاں سے آنے والی آوازوں کو سنتا رہتا۔ بوڑھ والا کھو بھی وہاں سے دھندلا سا نظر آتا اور وہ سوچتا کہ چند سال اور، اور بوڑھ مزید پھیلنے کے بعد واضح ہو جائے گا۔

زمین داری اور سرکار کے ساتھ معاملات اب شکر اللہ ہی نبھاتا۔

''وہ شکر اللہ کی شادی کا بھی سوچو۔'' رابعہ اُسے اکثر کہتی۔

''بات تو سوچنے والی ہی ہے لیکن ہمیں پتا بھی نہیں چلنا اور رشتہ ہو جانا ہے۔ بہر حال میں ادھر اُدھر پتا کرتا رہوں گا۔'' بوچا خاں نے کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

ایک راہی جو تیسری مرتبہ بوچہ خاں کے پاس دوپہر گزارنے کے لیے رکا تھا اور دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ اُس نے بوچہ خاں کو مخاطب کیا:

''راجی! آپ نے چھوٹے را کا رشتہ طے کر دیا؟'' بوچا خاں کے کان کھڑے ہوئے لیکن اُس نے راہی کی طرف سے لاتعلق سا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

''ہم رائے نہیں ہیں۔ وہ تو جوانی کے دنوں میں میرے ساتھیوں نے مجھے یہ خطاب دیا ہوا تھا۔'' بوچا خاں نے اپنی طرف سے بظاہر بات کا رُخ بدلا۔

راہی بھی ہوشیار آدمی تھا، وہ خاموش رہا اور بوچہ خاں اُس کی چال کو سمجھ گیا۔

''ہم بھٹی راجپوت ہیں اور شکر اللہ رائے نہیں۔ وہ چودھری شکر اللہ ہے۔'' بوچا خاں کی آواز میں ایک طرح کی گرج تھی۔

''آپ تو رائے ہی ہیں!'' راہی نے بوچہ خاں کو تنگ کرنے کے لہجے میں ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

بوچا خاں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا!

''رائے جی سیدھی بات کرتا ہوں۔''

بوچا خاں متوجہ ہو گیا۔

''ایک رشتہ ہے۔ وہ بھی آپ کی طرح خاندانی لوگ ہیں اور آپ نے اُن کے متعلق سنا بھی ہوا ہو گا۔''

بوچہ ل خاموش رہا۔

''تلونڈی کے چودھری محمد بخش کا اپنے علاقے میں نام ہے۔''

''میں نے سنا ہوا ہے۔'' رائے نے پہلی مرتبہ جواب دیا

''اُن کا رشتہ ہے۔''

''تم رات یہاں رہو۔''

اُس شام بوچہ مل دریا کی طرف جانے کے بجائے سیدھا گھر گیا۔ رابعہ اب بھاری ہوگئی تھی اور وہ سارا دن جھلانی کے سامنے بیٹھی رہتی، اُس کی نظر بھی کمزور ہوگئی تھی۔ گھر کا کام میو عورتیں کر جاتیں اور اُن کی ایک لڑکی سورج غروب ہونے تک رابعہ کے پاس ہوتی اور پھر کوئی عورت آجاتی جو لڑکی کے گھر جانے کا وقت ہوتا تھا، یہی وقت بوچہ مل کے گھر آنے کا بھی تھا۔ ابھی لڑکی گھر ہی تھی۔

''پتری! تم جاؤ اور اپنی چاچی کو بھیجو۔'' بوچا خاں نے لڑکی سے کہا۔

''جلدی آگئے! خیریت ہے؟'' رابعہ نے پریشانی سے پوچھا کیوں کہ بوچہ مل اپنے معمول کو توڑنے میں یقین نہیں رکھتا تھا۔

''تلونڈی کے چودھری محمد بخش کے گھر سے رشتہ آیا ہے۔''

''نام سنا ہوا ہے؟''

''ہاں! لیکن ہم سے چھوٹا چودھری ہے۔'' بوچا مل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی پہلے دن سے کوشش تھی کہ علاقے میں اُس سے بڑا کوئی چودھری نہ ہو۔

''سوچو مت۔'' رابعہ نے رائے دی۔

''میں نے ساری عمر اپنی مرضی کی ہے۔ دانائی یہی ہے کہ یہاں تمھاری مرضی کے مطابق چلوں۔ ہاں کر دوں؟''

رابعہ تھوڑا جھجکی۔ ''کر دو!'' پھر وہ اعتماد سے کہہ گئی۔

''جو آدمی رشتہ لایا ہے اُسے کچھ دینا بھی ہے۔''

''ایک گٹی دے دینا۔''

پھر دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔

''ہمیں یہ رشتہ آیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمارا دھرم آج تبدیل ہوا ہے۔''

بوچا مل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تحصیل دار نے اگلے دورے میں ماڑی بوچیاں میں اپنی چھاؤنی لگائی۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار سیدھا محمد مالک کے دیوان خانے پہنچا۔ اُس نے برجس اور لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھے اور سر پر سولا ہیٹ تھا۔ اُس کا قد چھوٹا، مونچھیں گھنی اور اوپر کی طرف مُڑی ہوئی تھیں۔ محمد مالک کو ایک دن پہلے اُس کے آنے کی اطلاع ہوگئی تھی اور وہ تحصیل دار کے انتظار میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تحصیل دار لمبے سفر کی وجہ سے تھک گیا ہوگا۔ محمد مالک نے اُس کے آرام کے لیے کمرے میں بستر لگایا ہوا تھا۔ دیوان خانے میں صرف تحصیل دار نے ہی ٹھہرنا تھا، محمد مالک نے عملے کو مختلف بیٹھکوں میں ٹھہرایا ہوا تھا اور اُن کا کھانا بھی وہاں پہنچتا تھا۔ تحصیل دار کے قیام کے دنوں میں گاؤں اپنی رونق کی انتہا پر ہوتا۔ تحصیل کی چھاؤنی کے وہاں لگنے کی خبر ارد گرد کے دیہات میں سرکاری ذرائع سے کردی جاتی جس میں منادی بھی شامل تھی۔ بوڑھے مرد اور عورتیں، بیوائیں، وہ لوگ جن کے سربراہ حال ہی میں فوت ہوئے تھے، لگان کے نادہندگان اور تحصیل دار کو سلام کرنے کے لیے آنے والے معززین ماڑی بوچیاں پہنچے ہوتے۔ دیوان خانہ اور چوک لوگوں سے کھچا کھچ بھر جاتے۔ اُس دن گاؤں کی اکثریت اپنا اپنا دودھ محمد مالک کے گھر پہنچا دیتی تاکہ مہمانوں کی خاطر میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ محمد مالک یقین کرتا کہ تحصیل دار کے سامنے پیش ہونے والے یا اُسے ملنے والے کھانے کے بغیر نہ جائیں۔ ماسی سارا دن لسی کے ڈوہنے باہر بھیجتی رہتی جسے لوگ مذہب کی تفریق کیے بغیر پیتے جاتے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد مالک عمر میں بڑھوتی کے باوجود گندم کے اُس نوزائیدہ پودے کی طرح ہے جسے ابھی سٹہ لگنا ہے اور اُس کا تنا ابھی تک ملائم ہے۔

تحصیل دار کو اتنی بھیڑ کا کسی اور گاؤں میں سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ محمد مالک کے ساتھ اُس کے مراسم کئی سطحوں پر تھے اور اُس نے ہر سطح پر محمد مالک کی کارکردگی کو قابلِ تحسین پایا تھا۔ اُسے خوشی ہوتی جب وہ لوگوں کی اتنی بھیڑ دیکھتا۔ ایک دورے میں اتنے مقدمات کا فیصلہ کردینا اُس کی اپنی اہلیت کو بھی اُجاگر کرتا تھا اور وہ اِس بات کا اعتراف کرتا تھا کہ اِس کا سہرہ

محمد مالک کے سر بھی ہے۔ سارا دن لوگوں کے ساتھ سر کھپائی کے بعد اُس نے کمرے میں اکیلے کھانا کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ شام کو اپنی کھونڈی ہاتھ میں لیے سیر کو نکلا تو شہد کی مکھیوں کی طرح گاؤں کے بچوں کی ڈار اُس کے پیچھے چلتے ہوئے اپنی رائے دیے جا رہی تھی:

''ہوڑ یو..... پایئے دیاں مچھاں!'' ''قد ویکھو تے جوان دی مچھ ویکھو!'' ''قد جری کو ہور ہندا اے تے بابا بچ جاندا!'' ''وڈیں بابا ئیں پائیا آ کھ!'' تحصیل دار یہ سنتے ہوئے دریا کی طرف چلتا گیا۔ بچے اپنے شوق میں کچھ دیر اُس کے پیچھے چلتے رہے اور آہستہ آہستہ اُکتاہٹ کا شکار ہو کر واپس ہوتے گئے۔ تحصیل دار جب دریا پر پہنچا تو تمام بچے گاؤں کو پلٹ چکے تھے۔ اُس نے دریا کے پاس جا کر لمبی لمبی سانسیں لیں اور خاموشی کے ساتھ بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگا۔ اُس کے اپنے گاؤں کے پاس سے دریائے چناب بہتا تھا لیکن اُسے بیاس کے بہاؤ جیسی متانت چناب میں نظر نہیں آئی تھی۔ پانی ایک خواب کی کیفیت میں آگے کی طرف چلے جا رہا تھا اور وہ پانی کے خواب میں گم اُس کے خواب کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی اپنی سارے دن کی تھکاوٹ بھول گیا۔ اُسے ایک چھوٹے سے گھاٹ پر کشتی کھڑی ہوئی نظر آئی جو پانی کی سطح پر ہلکے ہلکے جھوم رہی تھی۔ وہ تجسس کی مہمیز پر کشتی کے پاس پہنچ گیا۔ کشتی کے پاس بیٹھا آدمی بظاہر اُس کو توجہ دیے بغیر اپنی سوچ میں گم تھا۔ تحصیل دار سمجھ گیا کہ وہ آدمی ملاح ہے۔ اُسے ملاح سے ایک ہاتھ کی دوری پر ایک حقہ پڑا نظر آیا۔ اُس کے اندر فوراً چند کش لینے کی خواہش بیدار ہو گئی۔

''جوان! حقہ تازہ ہے؟'' تحصیل دار نے اپنی کھڑک دار آواز میں پوچھا۔

''نہیں! یہ ملاح کا حقہ ہے۔'' اُس آدمی نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ تحصیل دار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر وہ ملاح کے پاس بیٹھ گیا۔

''تمھارا کیا نام ہے؟''

''رحیم بخش!''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''ماڑی بوچیاں کا۔'' رحیم بخش نے جواب دیا۔ اُس نے حقہ تازہ کر کر کے ارد گرد سے لکڑیاں اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ تحصیل دار اُسے دل چسپی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اُسے رحیم بخش کی حرکات میں اعتماد اور کسی حد تک غرور نظر آیا۔ رحیم بخش نے آگ سلگائی اور اپنی ڈب میں سے تمباکو

کی مناسب مقدار نکال کر چلم میں رمی اور لکڑیوں کے کوئلے بننے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ آگ سے مطمئن ہو گیا تو اُس نے اپنی جوتیوں کے تلوں کو جوڑ کر اُن کا چمٹا بنایا اور کوئلے چلم میں رکھے اور ایک محتاط سا کش لے کر حقہ تحصیل دار کی طرف بڑھا دیا۔ تحصیل دار نے حقہ سنبھال لیا۔

''رحیم بخش! یہاں کب سے ہو؟''

رحیم بخش نے حیرت سے تحصیل دار کی طرف دیکھا، اُس کی نظر میں غصہ اور ناپسندیدگی بھی تھے جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی؟

''جب سے یہ گاؤں آباد ہوا ہے۔'' اُس نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

''سمجھا! تم ماہی گیروں کے اُس ٹبر سے ہو جو بوچہ ل یا خاں کے ساتھ یہاں آباد ہوا تھا،'' تحصیل دار کی آواز میں تجسس تھا۔

''آپ نے صحیح کہا ہے۔ ہم میں سے ایک آدمی صبح سے شام تک اِسی گھاٹ پر بیٹھتا ہے۔'' رحیم بخش نے دریا کے پانی کے اوپر اپنی نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کبھی بگلے کو پانی کی سطح کو مسلسل دیکھتے ہوئے دیکھا ہے؟'' رحیم بخش پورے گاؤں میں گفتگو کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔

''کیوں؟'' تحصیل دار بے چین سا ہو گیا تھا۔

''تاکہ پانی کی سطح پر اُٹھنے والی پہلی لہر ہی شکار کی موجودگی کا پتا دے دے۔''

رحیم بخش کی بات سے تحصیل دار قدرے مایوس ہوا۔ اُس نے اپنی مایوسی حقے کا لمبا کش لے کر نکالی۔

''تم چودھری کے وفاداروں میں سے ہو؟'' تحصیل دار نے پوچھا کہ کوئی بات ہوتی رہے۔ اُسے خاموش بیٹھنا پسند نہیں تھا۔

''نہیں چودھری جی! ہم سب سے زیادہ وفادار ہیں۔'' رحیم بخش نے چھاتی پر فخر کے ساتھ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آج کل اردگرد کیا سوچ ہے؟'' تحصیل دار نے پوچھا۔

''اچھی نہیں۔ لوگ کھچاؤ میں ہیں۔''

''کیوں؟'' تحصیل دار نے اپنی آواز میں سے تجسس دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے اپنے ملکوں کی بات ہوتی ہے لیکن چودھری اِس بات کو مانتا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ملک تقسیم کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نہیں جانتے شاید۔ میں تو سارا دِن مچھلیاں بیچتا ہوں، گاؤں گاؤں پھر کر۔ ہندو اور سکھ ہمیں دیکھ کر اتنے خوش نہیں ہوتے۔" رحیم بخش نے جواب دیا۔

"تمھیں کیا لگتا ہے؟" تحصیل دار نے پوچھا۔

"ایک تیلی کا انتظار ہے، بھانبڑ مچ اُٹھے گا۔" رحیم بخش نے فلسفیانہ لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں پر مچ اُٹھے گا؟" تحصیل دار ہلکا سا مسکرایا۔

رحیم بخش پہلی بار لاجواب سا نظر آیا۔ اُس نے گلا صاف کیا، چلم کو ہاتھ لگا کر گرمی محسوس کی، کِلے کے ساتھ بندھی کشتی کو ہلکورے لیتے دیکھا اور دریا پر اُٹھتی لپٹوں پر متجسس سی نظر ڈالی۔

"لوگ یہی کہتے ہیں۔" رحیم بخش کی آواز میں بے بسی تھی۔

"اُس طرف بھی کوئی پہلی تیلی پھینک سکتا ہے۔" تحصیل دار نے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

"کس طرف؟" رحیم بخش نے اپنی کم علمی، حیرانی میں چھپانے کی کوشش کی۔

"اُس طرف جہاں ہندو اور سکھ کم ہیں۔"

رحیم بخش نے کچھ نا سمجھتے ہوئے قہقہہ لگایا اور واپس جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا!

تھڑے پر تحصیل دار اور محمد مالک نے حقے کا ایک ایک کش لیا۔ رات بالکل خاموش تھی اور وہ رات کا حصہ تھے۔ محمد مالک نے بات کرنے سے پہلے گلا صاف کیا اور بلغم کا ایک لیبا دور پھینکا۔

''کیا حالات ہیں؟'' محمد مالک نے اندھیرے میں تحصیل دار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تحصیل دار نے بھی گلا صاف کیا لیکن تھوکا نہیں۔ پھر اُس نے لمبی سانس لی۔

''چودھری جی! ملک تقسیم ہونا ہے اور آپ کو جانا ہوگا۔''

''اگر میں نہ جاؤں تو؟'' محمد مالک کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''آپ اپنے آپ کو ایک بڑے خطرے میں ڈالیں گے۔ یہاں آپ کو تحفظ کون دے گا؟''، تحصیل دار کی آواز میں برہمی تھی۔

''وہی لوگ جن کے ساتھ مسلمان ہونے کے بعد چار سو سالوں سے رہ رہا ہوں۔''

تحصیل دار کے قہقہے میں غصہ اور مایوسی تھے۔ اُس نے اتنا لمبا کش لیا کہ اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ محمد مالک کا ایک کاما جو تحصیل دار کی خدمت پر مامور تھا فوراً کونے میں رکھی جھجری میں سے پانی کا کٹورہ بھر کر لایا اور تحصیل دار کو پینے کے لیے دیا۔ تحصیل دار نے کھسیانا سے ہو کر ایک گھونٹ لے کر ہاتھ کے اشارے سے اُسے چلے جانے کو کہا۔

''چار سو سال ساتھ دینے والے لوگ اب آپ کے دشمن ہیں۔ شاید لبانے آپ کے وفادار ہوں، اور کوئی نہیں۔ شاید گنگو آپ کا ساتھ دے کیوں کہ اُسے آپ نے پالا نہیں بنایا ہے۔''

''کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا ڈاکو بن جائے گا۔''، تحصیل دار نے حقہ ایک طرف کر کے سگریٹ سلگا لیا تھا۔

''وہ ڈاکو کب ہے؟ وہ تو ایک سادہ سا کاشتکار ہے جو تمبا کو بیچتا ضرور ہے لیکن سکھ ہونے کی وجہ سے پیتا نہیں.....!''

''یہ ایک کھیل بھی بن سکتا ہے۔''، تحصیل دار نے ہنستے ہوئے بات کاٹی، ''گنگا سنگھ

کا باپ.....اُس کا نام یاد ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''تیجا سنگھ۔ یہ خاندان بیچو چک کا رہنے والا ہے۔ یہ محنتی اور اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک شریف خاندان ہے۔ تیجا سنگھ نے اپنے دو ایکڑ قطع زمین پر تمبا کو کاشت کیا۔ فصل بہت اچھی تھی۔ فصل نے اچھے ہونا ہی تھا کیوں کہ تیجا سنگھ ایک محنتی آدمی تھا۔ وہ ہر وقت اُن دو ایکڑوں میں موجود کام کر رہا ہوتا۔'' محمد مالک بات کرتے ہوئے رکا اور تحصیل دار کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''بولتے رہو۔ اِس کہانی میں ابھی سرکار داخل نہیں ہوئی۔'' تحصیل دار نے ہنستے ہوئے محمد مالک کی حوصلہ افزائی کی۔

''تمبا کو کی فصل کو پالنے کے تین سنہری اصول ہیں؛ پہلا گوڈی، دوسرا پانی دینا اور تیسرا اگل توڑنا......'' تحصیل دار نے ہاتھ اوپر اُٹھا کر اُس کی بات کاٹی،

''چودھری صاحب! پانی کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اگر پانی زیادہ دیا جائے تو تمبا کو کڑوا نہیں ہوگا۔''

''اور اگر پانی کم لگایا جائے تو تمبا کو میں وہ خوشبو نہیں ہوگی جو آپ ابھی محسوس کر رہے ہیں۔ ایک بوری کل آپ کو دے دی جائے گی۔'' محمد مالک نے کسی حد تک جھجکتے ہوئے کہا۔

تحصیل دار نے احتیاطاً ایک ہلکی سی ہنسی ہنسی۔ ''آپ اپنی بات جاری رکھیں۔''

''تمبا کو کے پودے اتنے صحت مند تھے کہ کھڑے دیکھتے چلے جانے کو جی کرتا تھا۔ تو جی! تیجا سنگھ ہر وقت وہاں کام کرتا۔ ایک دن کچھ پولیس والے وہاں سے گزرے اور اُنھیں وہ تمبا کو بہت پسند آئے۔ تیجا سنگھ حسبِ معمول وہاں کام کر رہا تھا۔ اُنھوں نے اُسے بلایا اور تمبا کو دینے کا کہا۔ تیجا سنگھ نے منت کی کہ ابھی تمبا کو کچا ہے اور ویسے بھی وہ ایک غریب آدمی ہے اِس لیے کسی بڑے زمین دار سے لے لیں۔ پولیس والوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا اور کسی نے گنگو کو اطلاع کر دی۔ وہ ایک ڈانگ اُٹھائے ہوئے وہاں آن پہنچا۔'' محمد مالک نے حقے کا کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے تھوڑا ہنسا اور پھر اپنی بات جاری رکھی، ''اب کیا تھا چودھری صاحب! اُس کی ڈانگ چلتی رہی اور پولیس والے بچ کے نکل جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ تیجا سنگھ نے اُسے روکا ورنہ وہ شاید اُنھیں مار ہی دیتا۔ اگلی صبح پولیس اُسے پکڑنے آئی تو وہ بھاگ چکا تھا۔ میں اُس کے گھر والوں کو آٹا دانا وغیرہ پہنچا تا رہا جو گنگو نے یاد رکھا۔''

''جب آپ یہاں سے جائیں گے تو وہ آپ کو نکلنے میں مدد دے گا۔''تحصیل دار نے محمد مالک کی بات کاٹی۔

''کیا میرا جانا ضروری ہے؟''

''ہاں جی!''تحصیل دار نے تھوڑا اونچی آواز میں جواب دیا۔

''کیوں؟''

''اِس لیے کہ ہمارے خیال کے مطابق گو یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن جو یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیں اُن کا زندہ بچ رہنا محال ہے۔''تحصیل دار نے اپنی منطق پیش کی۔

محمد مالک، نے ہاتھ میں لیے خاموش ہوگیا۔وہ اندھیرے میں تحصیل دار کے چہرے کے تاثرات تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''لیکن میں اِن لوگوں کا خیال رکھتا آیا ہوں۔''محمد مالک نے کمزور سی دلیل پیش کی۔

''کتا جب ہلکا ہوجائے تو سب سے پہلے مالک کو ہی کاٹتا ہے۔''

محمد مالک نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا،دونوں خاموش تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرا بات کرے۔آخرکار محمد مالک نے خاموشی ختم کی۔

''میں سب سے پہلے نہیں جاؤں گا لیکن جاؤں گا ضرور۔''محمد مالک نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟''تحصیل دار کی آواز میں حیرت تھی۔

''میں تب جاؤں گا جب سب چلے گئے۔''

''گفتگو سے تعلق ختم نہیں کرنا۔''تحصیل دار نے رازداری میں بات کی۔

''خیریت؟''

''ہاں!جب اردگرد کے لوگ تمھارے دشمن ہوں گے تو وہ آپ کا محافظ ہوگا۔''

''چودھری صاحب!اگر ہوئی تو یہ تقسیم کب تک ہوگی؟''محمد مالک نے پریشانی سے پوچھا۔پھر وہ ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسا،''سچ تو یہ ہے کہ میں جانا نہیں چاہتا۔''

''لیکن آپ کو جانا ہوگا۔''تحصیل دار نے ایسے کہا جیسے حکم دے رہا ہو۔''آزادی کی تحریک کو زور پکڑتے ایک سال لگے گا۔''اُس نے محمد مالک کے سوال کا جواب دیا۔

''میں گاؤں کے سارے لوگوں کو ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔'' چودھری نے گویا التجا کی ہو۔ وہ بات کر کے نظر نیچی کر کے بیٹھ گیا۔

''تا کہ کوئی بھی نہ جا سکے۔'' تحصیل دار نے طنز کیا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق اردگرد کے لوگ ماڑی بچیاں پر حملہ کی مکمل تیاری کیے بیٹھے ہیں۔ اُن کے خیال میں تم نے گھروں کے اندر اسلحے کے ڈھیر لگا رکھے ہیں.....''

''ایسی تو کوئی بات نہیں،'' محمد مالک نے جلدی کے ساتھ دفاعی انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! آپ اِس افواہ کی تردید کریں اور نہ ہی تصدیق، بس لوگوں کو ایسی افواہوں پر قیاس آرائیاں کرنے دیں۔ اور گنگو کو بتائیں کہ وہ آپ کے لیے بندوقیں اور کارتوس اکٹھے کرتا رہے۔'' تحصیل دار نے کش لیا، '' آپ پر حملے کی راہ میں رکاوٹ آپ کے گاؤں کا بلندی پر واقع ہونا بھی ہے۔ ایک تو حملہ آور جس طرف سے بھی آئیں وہ گاؤں کی چھتوں سے آنے والی گولیوں سے خود کو بچا نہیں سکتے اور دوسرے اُن کے خیال میں اوپر جاتے ہوئے وہ اپنے حملے کی شدت کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے اور گولیوں کی بوچھاڑ اُنھیں تنظیم نو کا موقع نہیں دے گی۔'' تحصیلدار رُکا تو محمد مالک نے پریشانی سے بھاری آواز میں سرگوشی سے ذرا بلند لیکن خائف آواز میں کہا:

''ہم نے تو یہ سب سوچا ہی نہیں لیکن ہمارے ہاں نسل در نسل میوؤں کی معرفت یہ بات چلی آرہی ہے کہ بوچہ مل نے یہ سب سوچ کر گاؤں کے لیے جگہ چنی تھی۔''

''اُس کی چنی ہوئی جگہ نے گاؤں کو ایک کھلے قلعہ کی شکل دی ہوئی ہے۔ اردگرد کے جتھے اِس پر حملہ کر کے شکست در شکست نہیں کھانا چاہتے اِس لیے چند سردار یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مہاراجہ کشمیر کا ایک ڈوگرا یونٹ یہاں آجائے اور وہ اُس کے سائے میں ماڑی بوچیاں پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ کریں۔ وہ یہاں پر قبضے کو علاقے میں اپنی طاقت کی علامت کے طور پر دکھانا چاہتے ہیں۔''

محمد مالک کے ذہن سے اچانک خوف اِس طرح جاتا رہا جیسے وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے وارداتیں ہی کرتا رہا ہو۔ اُس کے ذہن میں منصوبوں کا ایک سلسلہ وجود پانے لگا۔ تحصیل دار اگلی دوپہر اپنے معمول کے مطابق چلا گیا لیکن محمد مالک حملہ آوروں کو شکست دینے، اپنے خاندان اور چند وفاداروں کے ساتھ چپکے سے نکل جانے کے منصوبے بنانے لگا۔ سب سے پہلے اُس نے گنگو کو بلوایا۔ گنگو ابھی تک مفرور تھا اور انگریز سرکار نے اُس کے سر کی بھاری قیمت رکھی

ہوئی تھی۔ محمد مالک اُسے دیوان خانے میں نہیں ملنا چاہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ گنگو نے کسی کے گھر بھی نہیں جانا۔ اگر اُس نے گنگو کو کسی کے گھر بلا کر ملنا ہے تو اُسے گنگو کو زبان دینا ہوگی کہ کسی کو اُس کے وہاں آنے کا علم نہیں۔ جوں ہی گنگو کو اُس کی زبان کا پیغام ملا اُس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر ملنے کو چلے آ جانا ہے اِس لیے ایلچی اور ملاقات کی جگہ کے انتخاب میں انتہائی احتیاط کی ضرورت تھی۔ کسی قسم کی مخبری کی صورت میں جہاں گنگو کے پکڑے جانے کا خدشہ تھا وہاں اُس کی اپنی اور صدیوں سے بنی خاندان کی ساکھ بھی خطرے میں تھی۔

گنگو سے کہاں ملے؟ یہ سوچ ہر وقت اُس کے ذہن میں رہتی۔ گنگو کے ساتھ ملاقات کے بعد ہی اُس نے اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ تحصیل دار کے ساتھ گفتگو کے بعد اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ حملہ کرنے والوں کا اُسی طرح مقابلہ کرے گا جس طرح وہ سوچ رہے تھے، وہ شاید ڈوگرہ بٹالین کا مقابلہ نہ کر سکے چناں چہ فوجی دستے جب جتھوں کی مدد کے لیے آئیں تو اُس وقت وہ اپنے جنگجوؤں کے ساتھ امرتسر کی لکیر پار کر چکا ہو۔ اُس کے ساتھ کون ہوں گے؟ اُس سے بھی پہلے اُسے ماسی، ہاجرہ اور عبدالرشید کو یہاں سے ایسے نکالنا ہوگا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

پچھلی ساڑھے تین صدیوں میں ماڑی بوچیاں چار یا پانچ گھروں پر مشتمل آبادی نہیں رہی تھی، اب گاؤں میں تین پتواریں تھیں۔ محمد مالک گاؤں کے علاوہ علاقے کا بھی سربراہ تھا اور ہر کسی کو اُس سے سربراہی کی توقع تھی۔ گاؤں میں سکھ نہیں تھے اور ہندوؤں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی لیکن اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلمان اپنے گاؤں میں غیر محفوظ تھے؛ اُنھیں گاؤں کے اندر سے نہیں باہر کا خوف تھا۔ اُنھیں خبر ملتی رہتی کہ سکھوں کے عزائم ٹھیک نہیں، گاؤں والے محمد مالک کو غیروں عزائم کے بارے میں بتاتے تو رہتے تھے لیکن وہ اِسے اہمیت نہ دیتا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ ہر افواہ کے پیچھے اُس سے بھی بڑی ایک افواہ تھی اور خبر لانے والا صرف اپنی اہمیت چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خبر لانے والا اگر مکمل طور پر غلط نہیں تھا تو درست بھی نہیں تھا۔

گنگو سے ملنا اُس کے لیے اتنا ہی ضروری تھا جتنا اپنے خاندان کو حفاظت کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان میں بننے والی لکیر کے پار پہنچانا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گنگو کو ملنے کا پیغام بھیجنے کے لیے مسلمان کے بجائے کسی لبانے کو بھیجے گا؛ لبانے سکھوں کی ہی ایک قسم تھے اور اُنھیں ماڑی بوچیاں میں صدیوں سے رہنے کے باوجود یقیناً گنگو سے زیادہ ہمدردی ہوگی۔ وہ اتنا ہی پیغام بھیجے گا کہ اُسے گنگو سے ملنا ہے؛ جگہ اور وقت کا تعین وہ ہی کرے گا۔

گنگو کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بیاس کے کنارے پر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ عام آدمی، مذہبی وابستگی کے قطعہ ءنظر، گنگو کی بہتری، کامیابی اور لمبی عمر چاہتا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا سا سنجیدہ آدمی تھا۔ اُسے بہت کم ہنستے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اُس کے متعلق یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ جب تک جاگتا، شراب پیتا اور اُن لوگوں کی روحوں سے معافی مانگتا رہتا جو اُس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ ہر وقت کہتا رہتا کہ اُس کی اُن کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اُن میں سے اکثریت امیروں کی تھی جن کے ساتھ اُسے نظریاتی اختلاف تھا اور کچھ سرکار کے مخبر تھے۔

گنگو غریب آدمی کے لیے ایک سورما تھا۔ اُس نے کبھی غریب کے ہاں ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ اُس کا ہدف ہمیشہ امیر ہوتے جن سے لوٹا ہوا مال وہ غریبوں کی بھلائی کے لیے استعمال کرتا خاص کر اُن غریبوں پر جو مہاجن یا زمین دار کے وار سہہ رہے ہوں۔ اُسے جب بھی خبر ملتی کہ کسی غریب کی بیٹی کی شادی سے پہلے مہاجن یا زمین دار اُس کے گرد مالی شکنجہ ڈال کر اُسے بے بس کر رہے ہیں تو وہ فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے گھروں میں پہنچ جاتا اور اگر ضرورت ہوتی تو جان سے بھی مار دیتا۔

محمد مالک اُس کے چند گنے چنے زمین دار خیر خواہوں میں سے تھا۔ اُن میں سے باقی زمین دار جہاں اُس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اُس کی معرفت اپنے حساب بے باک کرتے وہاں مالک اُسے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنے کا کہتا۔ اُس کی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ وہ گنگو کو قانونی راستہ اختیار کرنے پر قائل کرے جس کے جواب میں گنگو کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل جاتی:

''اتنے قتل مجھے کون معاف کرے گا، پاپا!'' وہ تکلیف کے ساتھ کہتا۔

''دیکھ گنگا!'' محمد مالک نے اُسے کبھی گنگو نہیں کہا تھا اور نہ ہی اُس نے کبھی گنگو کی شراب نوشی کو قابل اعتراض سمجھا۔ ''تم نے ان میں سے کوئی بھی قتل اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ ہاں! تم ڈاکہ ڈالنے ضرور گئے تھے اور ایک ڈاکے کی زیادہ سے زیادہ تمھیں دس سال کی سزا مل جائے گی، سو جتنے

ڈاکوؤں میں تمھیں سزا ملے وہ پہلے ڈاکے کے ساتھ ہی چلنی اور اُس کے ساتھ ہی ختم ہونی ہیں۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اگر میں پکڑا گیا تو تمھارے خیال میں وہ مجھے زندہ چھوڑیں گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر چہ میرے نصیب میں گروؤں نے موت لکھ دی ہے لیکن میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" گنگو کے چہرے کے نقش پر پریشانی لکھی ہوئی تھی۔

اُس نے مہندرو کے بیٹے کی نسل میں سے، جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ رام کا بیٹا ہے یا چندرو کا، ایک سنجیدہ اور قابل اعتماد آدمی کو گنگو کی تلاش میں بھیجا۔ اس کام کے لیے سب سے بہتر تو کسی مسلمان کو بھیجنا تھا لیکن اُسے ایک بے نام سا خوف تھا کہ مسلمان کہیں دھوکہ نہ دے دے کیوں کہ سکھ اُن کے لیے مشکوک ہو گئے تھے۔ لبانے سکھوں کی ایک ادنیٰ سی ذات تھی اور گنگو سکھوں کے لیے عظمت کی علامت تھا اس لیے لبانے کا بھیجنا ہی محفوظ تھا۔

تین دنوں کے بعد اُس کا ایلچی واپس آ گیا۔ بھجن تھکا تو ہوا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں چندھیا دینے والی چمک تھی۔

"اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہو؟" محمد مالک نے حیرت اور دل چسپی سے پوچھا۔

"چپنچ جی! گنگو سے میری جو ملاقات ہوئی، اس لیے۔" بھجن نے خوشی اور فخر سے کہا۔ محمد مالک کو ایک لمحے کے لیے عدم تحفظ کا احساس ہوا، اُسے بھجن اپنے دشمنوں میں سے لگا لیکن پھر وہ اپنے آپ پر قابو پا گیا۔ محمد مالک پوچھنا چاہتا تھا کہ گنگو اُسے کہاں ملا لیکن پھر اُس نے یہ نا جاننا ہی بہتر سمجھا۔

"کیا جواب دیا گنگو نے؟"

"آپ کے چرن چھونے کا کہا اور کہا کہ آپ کو اُس کا پیغام مل جائے گا۔"

محمد مالک کو یقین تھا کہ گنگو کا پیغام جلد ہی آ جاتا ہے چناں چہ وہ اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تھوڑا پریشان سا بھی تھا کہ گنگو کہیں اپنی کسی مجبوری کا پابند نہ ہو۔ انتظار کے دنوں میں وہ کسی حد تک اُلجھا ہوا بھی تھا اور اُسے ایک طرح کا تجسس اور خوشی بھی تھی کہ گنگو سے اُس کی ملاقات ہونے والی ہے۔ گنگو کو ملے ہوئے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا اور اُسے گنگو سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔

تیسرے دن ایک تھکا اور اُلجھا ہوا سا آدمی بمشکل دیوان خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شام کا وقت تھا اور اُس وقت عموماً محمد مالک اکیلا ہوتا تھا کیوں کہ

اُس وقت لوگ دودھ نکالنے، ڈھور سنبھالنے اور رات ہونے سے پہلے اپنے دیگر معاملات سمیٹنے کے لیے اُٹھ جاتے تھے۔ مسافر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر چاروں طرف ڈالی اور چارپائی تبدیل کر کے محمد مالک کے پاس بیٹھ گیا۔ محمد مالک اُس کی حرکات کو دلچسپی کے ساتھ دیکھے جا رہا تھا۔

''مجھے گنگا نے بھیجا ہے۔'' آدمی نے سرگوشی سے تھوڑی بلند، پُراسرار اور سازشی سی آواز میں کہا۔

محمد مالک نے خاموش، سوالیہ نظر سے مسافر کی طرف دیکھا۔

''اُس نے آپ کے چرن چھونے کا کہا ہے اور وہ تین دن کے بعد دِن چڑھنے سے پہلے گھاٹ پر آپ کا انتظار کرے گا۔'' محمد مالک گنگو کو سلام دعا بھیجنا چاہتا تھا اور گھاٹ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ آدمی سانپ کی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اُتر گیا۔ محمد مالک کو شک تھا کہ کوئی آدمی اُسے ملنے آیا بھی تھا یا نہیں!

محمد مالک بے چینی کی حالت میں اُٹھ کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھا۔ وہ خود کو ناکارہ اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ گنگو نے اُسے نامکمل پیغام بھیج کر اُلجھن میں ڈال دیا تھا؛ وہ کون سے گھاٹ پر جائے؟ بہتر یہی تھا کہ وہ وہیں جائے جہاں وہ عموماً جاتا ہے لیکن وہاں گاؤں کے میو تو کشتی چلاتے ہیں۔ گنگو نے اپنے ایلچی کو بھی مکمل پیغام نہیں دیا تھا کہ وہ کہیں مخبر ہی نا ہو؟ آہستہ آہستہ اُسے گنگو کے نامکمل پیغام میں دانش کا پہلو نظر آنے لگا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ گنگو اُسی گھاٹ پر آئے گا جس پر سے رائے بوچہ مل اُترا تھا!

دریا کے اوپر ہلکی سی دھند تیرتی تھی جسے اوڑھے ہوئے پانی خراماں خراماں بہتا تھا۔ یہ دھند دھوئیں کی طرح کناروں سے باہر نکل کر اردگرد کو ایک دھندلکا سا دیے ہوئے تھی۔ محمد مالک بٹالہ جانے کا کہہ کر صبح کے تارے کے نکلنے سے سے پہلے ہی گھر سے نکل کر اُس دھند میں اپنے آپ کو چھپا کر بیٹھ گیا۔ اُسے تھوڑا تھوڑا ٹھنڈ کا بھی احساس ہو رہا تھا، شاید اُس میں خوف کو بھی دخل تھا۔ اب وہ کچھ پریشان سا بھی تھا اور کسی حد تک مطمئن بھی کہ ایک اہم مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اُسی وقت سامنے سے ایک سایہ اپنی طرف آتے ہوئے محسوس ہوا؛ اُس نے غور سے دیکھا تو ایک منحنی سا آدمی اعتماد کے ساتھ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ محمد مالک سمجھ گیا کہ یہ گنگو ہی ہے۔ محمد مالک نے اُس کے قریب آنے کا انتظار کیا۔ آنے والے کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی جس سے محمد مالک سمجھ گیا کہ اُس کا ملاقاتی جہاں سے بھی آیا ہے، پی کے آیا ہے۔ کیا پینا اُس کی عادت بننے کے بعد مجبوری بن گئی تھی یا کسی قسم کا خوف تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ ہر وقت پیے رہتا تھا۔

گنگو خاموشی سے اُس کے سامنے بیٹھ گیا، وہ فوری پہچان سے بچنے کے لیے اپنے چہرے پر مڑاسا کیے ہوئے تھا۔

محمد مالک نے جھجکتے ہوئے اردگرد نظر دوڑائی، دھند کے اور گہرا ہو جانے کی وجہ سے چند قدموں کے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

''بھائیا! میرے آدمیوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے، کوئی یہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تم جلدی بات کرو! سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں! سب خیریت ہے۔ ایک ضروری مشورہ اور مدد چاہیے۔'' محمد مالک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ محمد مالک نے گنگو کے مڑاسے کے پیچھے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

''پائیا! حکم کر۔'' گنگو کی آواز میں خلوص تھا۔

''گنگا! بات یہ ہے کہ یہاں ماحول بدل رہا ہے۔ لوگ اپنے مذہب کے لیے ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ماڑی بوچیاں پر ایک بڑے حملے کا سوچا جا رہا ہے۔ میرے پاس تو ڈانگ بھی نہیں جس کو پکڑ کر میں مقابلہ کروں۔ مجھے تمھاری مدد چاہیے، میں مقابلہ کروں گا چاہے ڈوگرا فوج ہی نہ آ جائے۔'' محمد مالک نے اپنی بات ختم کر کے پھر مڑ اسے کے پیچھے گنگو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی، اُسے گنگو کی آنکھوں میں ارتکاز کی شدت نظر آئی۔ وہ تھوڑا سا خائف بھی ہوا۔

''ہاں بھائیا، سننے میں تو یہی آ رہا ہے کہ وہ ماڑی کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ اب جو کرے کرتار۔''

گنگو کی بات میں اُسے ایک لاتعلقی سی نظر آئی، وہ کچھ پریشان بھی ہوا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' گنگو نے اُسی لاتعلقی سے پوچھا۔

محمد مالک سوچ میں پڑ گیا کہ گنگو سے مدد مانگے کہ نہیں!

''بول پائیا؟'' گنگو کی آواز میں اُسے شدت محسوس ہوئی۔ محمد مالک کو اچانک اپنی پریشانی ختم ہوتے ہوئے لگی۔

''میرے کافی کام تم نے کرنے ہیں۔'' محمد مالک نے بات شروع کی۔

''جان حاضر ہے، پائیا!'' گنگو کی آواز پیار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ محمد مالک نے جلدی سے اُس کی طرف دیکھا، گنگو گھاس چرتے ہوئے ہرن کی طرح چاروں طرف نظر بھی رکھے ہوئے تھا۔

''گنگا! بات ایسے ہے کہ ایک تو مجھے اسلحہ چاہیے؛ بندوقیں اور کارتوس، دو تین پکی بھی چاہئیں اور اُن کی گولیاں۔ برچھیاں، چھوئیاں، کلہاڑے، داتیں اور ڈانگیں، سب کچھ۔ یہ آہستہ آہستہ بھجواتے رہو۔ جلدی کی ضرورت نہیں۔ مخبر بھی چاہیے جو ہمیں مسلسل اُن کے متعلق ہمیں خبر دیتا رہے۔ ایسا طریقہ بھی سوچو کہ ہم نہ صرف اپنی بات چھپا جائیں بلکہ ایسی باتیں آگے پہنچائیں جو دوسری پارٹی کو غلط فہمی میں ڈال دیں۔'' اب دھند کم ہونا شروع ہو گئی تھی اور تھوڑے فاصلے تک حرکت ہوتے دیکھی جا سکتی تھی۔ دھند اب صرف دریا کے اوپر تھی، ایسے لگ رہا تھا کہ پانی میں سے دھواں اُٹھ رہا ہو۔ گنگو، محمد مالک کو بے چین نظر آیا اور وہ خود بھی چاہتا تھا کہ ملاقات ختم ہو جائے؛ وہ

نہیں پائی تھی اور نالی کٹی رائفل کے ساتھ انگریز سرکار کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ محمد مالک خود سرکار برطانیہ کا وفادار تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ گنگو پکڑا نہ جائے۔ اُسے اچانک اپنے بجائے گنگو علاقے کی شناخت لگا اور اُس نے سوچا کہ اب جب اُس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو وہ بھی جاتے جاتے اپنے پیچھے ایک داستان چھوڑ جائے گا جو گنگو کی طرح اُس کی نئی شناخت ہوگی۔ وہ سکھوں کے جتھوں کو بوڑھ والے کھوہ سے ہی آگے نہیں آنے دے گا۔ اگر سکھ بوڑھ والے کھوہ کی سیدھ سے آگے نکل گئے تو شاید گاؤں کا بلندی پر ہونا بھی اُنھیں روک نہ سکے۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُنھیں رکاوٹیں دیتے ہوئے گاؤں سے باہر روڑھیوں تک لا کے ایک بھرپور جوابی حملے سے اُنھیں اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہوگا؟

وہ دیر تک بیرل کٹی رائفل کو دیکھتا رہا۔

اُس نے سوچا کہ یہ تبھی ممکن ہوگا جب گنگو اُسے اسلحہ پہنچائے گا۔ پھر اچانک محمد مالک کو گاؤں کے ایک نوجوان لوہار کا خیال آیا جسے وہ اُس کے کردار کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اُس کی پیشہ ورانہ مہارت کا بھی قائل تھا۔ علم دین ایک آوارہ اور عورتوں کا شوقین نوجوان تھا جس کے قصے گاؤں میں مشہور تھے اور یہ بھی مشہور تھا کہ اُسے موٹر کار دکھا دو اور وہ اُس کی بہتر نقل تیار کر دے گا۔

محمد مالک کو اسلحے کے حصول میں گنگو کے علاوہ ایک اور ذریعہ نظر آیا تو وہ مطمئن سا گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اُس نے رائفل پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اُسے ڈب میں اُڑس لیا۔ گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اُس کی چال میں اُمید کی لچک تھی اور اُسے رائفل کو چھپانے کی فکر نے بھی گھیرا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح بھی رائفل کو ڈب میں اُڑسے ہوئے پھرتے نہیں دیکھا جانا چاہتا تھا۔ گاؤں پہنچ کر اُس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور راستے میں کسی کے ہاتھ علم دین کو فوراً آ کر ملنے کا پیغام بھجوایا۔

علم دین کی گاؤں میں تیسری نسل تھی۔ اُس کے دادے کو کسی جھگڑے کی وجہ سے میانی بدر کر دیا گیا تھا اور ماڑی بوچیاں میں کوئی کاریگر لوہار نہیں تھا اس لیے عبدالرحمان نے اُسے رہنے کے لیے جگہ دے کر آباد ہونے میں بھی مدد کی۔ محمد مالک کے گھر پہنچنے کے جلد بعد علم دین آ گیا۔

''تائی جی! سلام!'' اُس نے جھک کر ہاجرہ سے پیار لیا اور جھکتے ہوئے گھر میں کام

کرنے والی لڑکی پر بھرپور نظر ڈالی۔

وہ پیڑھی اُٹھا رہا تھا کہ محمد مالک نے اُسے روکا:

''پہلے اُس طرف چارپائی رکھ آؤ۔'' محمد مالک کی آواز کی سنجیدگی نے اُسے چونکا کر دیا۔

علم دین، محمد مالک کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ وہ حقے کی نے کو اپنی طرف موڑنے سے بھی گھبرا رہا تھا، محمد مالک کے بات شروع کرنے کے انتظار میں وہ خاموش بیٹھا رہا۔ محمد مالک نے دو لمبے کش لے کر حقہ علم دین کی طرف موڑا تو بھی علم دین نے کش نہ لیا۔ محمد مالک نے آہستہ سے اپنی ڈب سے رائفل نکال کر علم دین کی طرف بڑھائی جس نے طفلانہ تجسس کے ساتھ تیزی سے جھپٹ کر اُسے اوپر نیچے کر کے دیکھنے لگا، اُس کی آنکھوں میں پاگلوں والی چمک تھی۔

''چاچا جی! یہ کسی اناڑی کی کاٹی ہوئی ہے۔ نالی کے اندر دائرے ہوتے ہیں جن میں چکر کاٹتے ہوئے گولی باہر نکلتی ہے۔ نالی جب بھی کاٹی جائے سیدھی رکھ کر کاٹنی چاہیے تاکہ باہر نکلنے سے پہلے گولی اپنا چکر پورا کر لے۔'' اُس نے بیرل کا رُخ محمد مالک کی طرف کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''اِسے ترچھا کر کے کاٹا گیا جس میں سے گولی ایسے ہی نکلتی ہے جیسے کم تا والی ربڑ کی غلیل میں سے غلیلہ نکلتا ہے۔'' پھر اُس نے محمد مالک کی طرف دلچسپی سے دیکھا، ''چاچا جی! یہ مجھ سے کٹوا لیتے.....''

''ماں کے خصم، تیری گڑی کو.....'' علم دین ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ محمد مالک پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''اب میری بات غور سے سُن۔''

علم دین فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ محمد مالک نے اُس سے رائفل لے کر چارپائی پر اپنے پاس رکھ لی۔

''میری بات کو لڑکوں کی لاپروائی کے بجائے بزرگوں کی توجہ سے سنو۔''

''جی چاچا جی۔''

''تم ایسی بندوق بنا سکتے ہو؟''

''چاچا جی یہ تو ولایت کے بڑے بڑے کارخانوں میں بنتی ہے اور اِسے بنانے کے لیے خاص قسم کا لوہا استعمال ہوتا ہے۔'' علم دین نے اپنے علم سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ محمد مالک نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے ایک نظر دیکھا جیسے اُس کے لیے ولایت کے کارخانے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

''لیکن ہمیں ایسی بندوقوں کی ضرورت ہے۔'' محمد مالک نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''چاچا جی! تمہیں بندوقوں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ تم نے تو کبھی ڈانگ تک نہ رکھی اور نہ ہی اُٹھائی۔'' علم دین کو واقعی حیرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ محمد مالک نے اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ جائیداد، سرکاری تعلقات اور توڑ جوڑ کا استعمال کیا تھا، بندوقوں کا کارخانہ لگانے کا سوچنے سے اُسے حیرت ہوئی اور تجسس بھی۔ اُس نے بغیر کچھ پوچھے، جاننے کا فیصلہ کیا۔

''حالات ٹھیک نہیں.....'' محمد مالک نے بات شروع کی تو علم دین نے حیرت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا کہ بڑا چودھری کن حالات کی بات کر رہا تھا۔ حالات تو ویسے ہی تھے جیسے وہ ایک عرصے سے دیکھتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

''چاچا جی! کون سے حالات؟'' علم دین کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''ماں کے خصم! کہاں رہتے ہو؟ تمہیں اپنے معاشقوں سے فرصت ملے تو دنیا کی ہوش ہو!'' محمد مالک نے غصے سے کہا۔

''چھوڑ چاچا جی! دنیا کو کیا ہوا جا رہا ہے، سب کچھ تو ویسے ہی ہے۔'' علم دین نے محمد دین کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''ویسے نہیں ہے مستری بچے۔ سکھ اور ہندو ہمارے دشمن بن گئے ہیں اور ماڑی بوچیاں پر حملہ کر کے اِسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔''

''چاچا جی! جہاں باقی، وہاں ہم۔ ہم کوئی علیحدہ مخلوق تو ہے نہیں۔'' علم دین نے بجھے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

''علیحدہ ہیں تو وہ ہم پر حملہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''یہ،'' علم دین نے رائفل کی طرف اشارہ کیا، ''اُس کے لیے لی ہے۔'' علم دین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''ایک سے کیا ہوگا؟''

''باقی تم بناؤ گے۔''

''کیسے؟''

''کیسے؟'' محمد مالک نے دہرایا۔ ''یہ تم جانو۔''

''کاربین بنانا آسان ہوگا، یہ،'' اُس نے رائفل کی طرف اشارہ کیا، ''نہیں بن سکتی۔''

''کہاں بناؤ گے؟'' اب محمد مالک متجسس ہوگیا تھا۔

''اڈے پر اپنے۔''

'موچیوں، ترکھانوں، لوہاروں، خراسوں کے اڈے اور تیلیوں کے کوہلو تو فارغ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے، وہاں ہوتا کام سب کی نظر میں ہوتا ہے۔'' محمد مالک نے کش لے کر حقہ ایک طرف کیا، ''اِس کام کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، میں رات کو کرلیا کروں گا یا بھٹی گھر لے جاؤں گا۔'' علم دین اب اُتنا ہی سنجیدہ تھا جتنا کہ محمد مالک۔

''اڈے پر لوگ رات کو بھی آجایا کرتے ہیں، واری لینے والوں کو ایک اور ٹھکانا مل جاتا ہے۔ بھٹی گھر پر ہی لگاؤ۔''

''مجھے بھٹی نئی لگانی پڑنی ہے۔ گھر ایک پہیہ تو پڑا ہوا ہے پکی نہیں ہے، وہ سری گو بند پور سے لانی ہوگی۔''

''ابھی جا کے لے آ، ناواں لیتے جانا اور جو بچے اُس میں ہمیشہ کی طرح بے ایمانی نہ کرنا۔''

''چاچا جی کیا باتیں لے بیٹھے ہو؟ آج تک دھیلے کی بے ایمانی نہیں کی میں نے، مولا جانتا ہے۔'' علم دین کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی لیکن اُس کا چہرہ سنجیدہ ہی رہا۔ محمد مالک اُٹھ کر اندر گیا اور ہاتھ میں کچھ نوٹ لیے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں، کتنے؟''

''دس بارہ دے دو۔''

''اتنے زیادہ؟'' محمد مالک کی آواز میں برہمی تھی

''رسی، ہتھی اور کچھ ایسا ہی تک سک بھی چاہیے ہوگا۔'' علم دین نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' محمد مالک اضافی دو روپے دینے سے گھبرا رہا تھا۔

''چاچا جی! نالی بنانے کے لیے خاص لوہا چاہیے ہوگا۔ یہ عام لوہے سے نہیں بنتیں۔''

''کیسا خاص لوہا؟'' محمد مالک گھبرا سا گیا تھا۔

''جو پکا اور مضبوط ہو اور کارتوس کے پٹاخے سے پھٹے نا۔''

''ایسا لوہا کہاں سے ملے گا؟'' محمد مالک نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ اُسے ایک دم اِس خوف نے گھیر لیا کہ لوہے کی عدم دستیابی اُس کے منصوبے کو ناکام نہ بنا دے۔ وہ پریشانی کے عالم میں بار بار علم دین کی طرف سہارے کے لیے دیکھ رہا تھا۔ علم دین کے جوان ماتھے پر بھی سوچ سے شکنیں بن گئی تھیں اور وہ محمد مالک سے نظر بچا رہا تھا۔

''وہ اتنا اچھا تو نہیں ہوگا لیکن ۳ سے ۴ فائر نکل ہی جائیں گے۔'' علم دین نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ اب محمد مالک کی تمام توجہ بھی اُس پر تھی۔ کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''کون سا لوہا ہے یہ؟'' محمد مالک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اُسے لگا کہ وہ ایسی چھت پر چل رہا ہے جس پر ابھی سرکی ہی پڑی ہے۔

''بیل گاڑیوں اور تانگوں کے دھروں والا۔''

علم دین نے اپنے گھر میں بھٹی لگالی جس کی شروع میں اُس کے باپ نے مخالفت کی کیوں کہ اُسے شک تھا کہ وہ کسی شرارت کا حصہ بننے والا ہے اِس لیے کہ لوہڑی مانگتے ہوئے علم دین کوئی ایسی حرکت کر جاتا تھا جو کئی دنوں تک گاؤں میں موضوع بنا رہتا۔ وہ کسی کو پتا چلے بغیر اپنی ٹولی سے الگ ہو کر کسی تعلق والی لڑکی کے بستر میں گھس کر رات گزار دیتا۔ وہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ یہی بتاتا: میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، صرف میرے ماتھے پر حرام لکھا ہوا ہے، لڑکیاں خود ہی مجھے پھنسا لیتی ہیں۔

علم دین کا باپ گھر میں اڈا کھولنے کو اُس کی عشق بازی کی ایک تدبیر سمجھا اور باپ بیٹے میں محمد مالک کی دخل اندازی تک تکرار جاری رہی۔

''دیکھو نانک! علم دین کو میں نے ایک ذاتی ذمے داری سونپی ہے۔'' محمد مالک نے اُسے یہ بات تب سمجھائی جب نانک تنگ آ کر علم دین کو گاؤں بدر کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ''تم ایک تو اُس کے گھر میں کام کرنے کو متنازع بات نہ بناؤ اور دوسرے اُس کے کام کے بارے میں ٹوہ نہ رکھو۔'' نانک متجسس سا علم دین کے اِس معاملے سے لاتعلق ہو گیا۔

علم دین ایک جنونانہ شدت کے ساتھ بھٹی کو گرم رکھنے اور لوہے کو بار بار گرم کرنے کے بعد اُس کو کاربین میں ڈھالتا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ جو لوہا بھی ملے وہ اُس میں سے کاربین ڈھالتا جائے گا قطع نظر کہ اُس میں سے چاہے ایک ہی فائر کیا جا سکے یا وہ فائر کرنے والے کے ہاتھ میں ہی پھٹ جائے۔ اُس نے سوچا کہ فائر کی آواز اور شعلہ ضروری ہیں جو حملہ کرنے والوں کو آگے بڑھنے سے پہلے سوچنے پر مجبور کرے گا۔ وہ آدھی رات گزر جانے کے بعد اپنا کام شروع کرتا اور صبح کے تارے کے ساتھ ختم کر دیتا۔ گنگو کا آدمی کبھی کبھار رائفل، دونالی بندوق، گولیاں، کارتوس اور تلواریں دے جاتا۔ محمد مالک دیوان خانے میں ڈانگوں، برچھیوں اور چھویوں کا ڈھیر لگائے جا رہا تھا، وہ سوچتا کہ استعمال کرنے والے چاہے کم ہی ہوں اُس کے پاس اسلحہ اتنی مقدار میں ہونا

چاہیے کہ اُسے ختم ہونے کا دھڑکا نہ رہے۔ گنگو کے آدمی اُسے اطلاع بھی دیتے رہتے، ماڑی بوچیاں پر حملے کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہر سردار اپنی مرضی چاہتا تھا اور کسی کی ماتحتی میں آ کر کارروائی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ محمد مالک واپس اُن کے لیے افواہ بھجواتا کہ ماڑی بوچیاں والے متوقع حملے سے اتنا خائف ہیں کہ گاؤں سے نکل جانے کے لیے اُن سے محفوظ راستہ مانگنے کا سوچ رہے ہیں اور کبھی یہ کہ اُنھوں نے آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے یہاں تک کہ صحنوں میں شہیدوں کو دفن کرنے کے لیے قبریں کھود دی گئی ہیں۔

محمد مالک اِس نفسیاتی جنگ سے لطف اندوز ہو رہا تھا، وہ ہر وقت کچھ کر رہا ہوتا اور سوچ رہا ہوتا کہ اِس کے بعد کیا کرے۔ بوڑھ والے کھوہ کو اُس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کا فیصلہ کر کے ارد گرد مورچے کھودنے کی مناسب جگہوں کا انتخاب شروع کر دیا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ حملہ آور کسی بھی حالت میں دریا کی سمت سے نہیں آئیں گے اور نہ شکر گڑھ کی طرف سے جہاں سکھوں کی آبادی کم تھی، اُس طرف گو مسلمان زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود غیر محفوظ تھے۔ اُس کی طرح وہ بھی یہاں سے ہجرت کرنے کے متعلق سوچ رہے تھے، اُنھوں نے یہ نقلِ مکانی اپنا مقدر مان لیا تھا۔ محمد مالک نے سوچا کہ وہ بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر اندھیرے میں چھلانگ لگانے والا تھا لیکن وہ اپنی جگہ لینے والوں کو ایک سبق دے کر جائے گا کیوں کہ اِس زمین پر اُس کا بھی اُتنا ہی حق تھا جتنا اُن کا۔

محمد مالک نے بوڑھ والے کھوہ پر ایک چوبارہ بنانے کا فیصلہ کیا تا کہ وہاں سے دور تک دیکھا جا سکے اور کچھ اسلحہ بھی اُدھر رکھنے کا طے کیا کہ سب کھانے ایک تھالی میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اُس نے مورچے برادریوں کے ذمے لگانے کا ارادہ کر کے رحیم بخش اور کیسر سنگھ کو بلا بھیجا کیوں کہ خاندان کے سب سے زیادہ وفادار میو تھے اور اُن کے بعد لبانے، چناں چہ حملے کا سب سے ممکنہ علاقہ اِن دونوں برادریوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر کے اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے۔ اُسے شمال کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا جس کی تصدیق گنگو اپنے ایلچیوں کے ذریعے کرتا رہا۔ محمد مالک کے مطابق بوڑھ والے کھوہ کے سامنے شمال میں دور تک جاتا ہموار علاقہ میدانِ جنگ بنتا تھا۔ یہ وہ کھلا میدان تھا جسے بوچہ مل نے میوؤں اور لبانوں کے ساتھ مل کر آباد کر کے کنواں لگوایا تھا اور اب اُسی علاقے میں اُس کے خاندان کی بقا کی آخری جنگ ہونا تھی۔ اگر وہ مارا گیا تو؟ تب تک وہ اپنے بیٹے کی شادی کر کے اُسے یہاں سے دور بھیج چکا ہو گا۔

رحیم بخش اور کیسر سنگھ جب آئے تو وہ اُن کا انتظار کرتے کرتے اُکتا چکا تھا:

''چودھری جی! پٹھا دتھا کرتے دیر ہوگئی۔'' رحیم بخش نے آتے ہی کہا۔

''بھائیا! یہ شکاری ہے، موقع پر ہی جھوٹ بول سکتا ہے۔ یہ تاش سے فارغ ہوتا تو آتا۔ میں تو اِس کے بازی ختم کرنے کے انتظار میں تھا۔''

''چودھری! تم نے مجھے اِس بے غیرت کے ساتھ کیوں بلایا؟'' رحیم بخش کا رنگ غصے کی وجہ سے تانبے جیسا ہوگیا تھا۔ ''اِن کی ایک عورت اپنے خاوند اور دیور کے ساتھ سوتی رہی ہے۔ اب سوچو یہ خالص حرامی ہے کہ نہیں؟ کسی کو نہیں پتا کہ اِس کے باپ دادا کس کا تخم تھے۔''
محمد مالک ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہوگیا؛ لوگ چار سو سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں بھولے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ واقعہ کہیں لکھا تو نہیں گیا تھا لیکن سینہ بہ سینہ چلتا آرہا ہے۔ رحیم بخش کے اِس طعنے کا کیسر نے بُرا نہیں منایا۔

''بھائیا! وہ عورت اِس کی نگڑ دادی کی بہن تھی۔ اب کیا بتاؤں، جھگڑے کا آٹھ بیس بھی سو ہوتا ہے۔ یہ مانے نہ مانے ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی نکلتے ہیں۔''

''تمھاری عورتوں پر چوبے چھوڑوں، تم یہ تو پوچھو کہ میں نے تمھیں بلایا کیوں ہے؟''

محمد مالک اُن کی اِس نوک جھونک کا مطلب سمجھتا تھا، اُن کے خیال میں اُس نے اُنھیں اِسی قسم کے ٹھٹھے مخول کے لیے بلایا تھا۔ رحیم بخش شرمندہ سا اپنی ڈاڑھی کھجانے لگا اور کیسر نے زمین پر بیٹھ کر تنکے سے لکیریں لگانا شروع کردیں۔

''اردگرد کے لوگ گاؤں پر حملہ کر کے ہمیں شکست دینا چاہتے ہیں۔ میرے خاندان نے کئی سو سالوں سے یہاں حکومت کی ہے۔ ہم نے وہ حکومت شریفوں کے طریقے سے کی، کبھی کسی کے ساتھ ناجائز نہیں کیا۔ تمھارے خاندانوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا اور ہم بھی تمھارے علاوہ کسی کے نہیں تھے۔ اب لوگ ہمارے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں تو ہم اُس کے لیے بھی تیار ہیں۔'' محمد مالک خاموش ہوا تو اُن دونوں نے پہلے اُسے، پھر ایک دوسرے کو اور پھر محمد مالک کو دیکھا۔ وہ وہاں ایک طرح سے خوف اور کسی حد تک اُمید کو اُبھرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اُسے لگا کہ دونوں آپس کے نقطہ نظر کو پہچان گئے ہیں۔

''ہم لڑیں گے کیسے؟ ہمارے پاس تو ڈانگ سوٹا بھی نہیں۔'' رحیم نے ہمیشہ کی طرح

شکایت کے لہجے میں بات کی۔

"جو تمبیاں پہنتے ہیں اُنھوں نے موتر نے کا راستہ بھی رکھا ہوتا ہے۔" محمد مالک نے طنزیہ غصے سے کہا۔ "میں نے تم لوگوں کو خالی ہاتھ تو نہیں لڑانا۔" وہ رکا، اُس نے دونوں کے چہرے پڑھے جہاں اُسے توجہ کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا۔ "تمھیں بندوقیں دوں گا، تلواریں دوں گا، برچھیاں اور چھویاں دوں گا۔" وہ پھر رکا تا کہ اُس کی بات دونوں کی سوچ میں داخل ہو جائے۔

"اُنھیں چلائے گا کون؟" رحیم بخش نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ۔"

"ہم لوگ؟" رحیم بخش نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں! تم لوگ!"

"ہم لوگ....." اُس نے اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کیا، "شکاری ضرور ہیں لیکن ہمارا ہتھیار تو جال ہے۔ ہم جال سے مچھلی، بٹیر، جنگلی کبوتر وغیرہ پکڑتے ہیں، ہمارا اسلحے کے ساتھ کبھی لینا دینا نہیں رہا ہے۔"

"تمھیں بندوق چلانا سکھایا جائے گا۔" محمد مالک نے رحیم بخش کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "یہاں سے جاتے ہوئے ایک دفعہ ہم نے پھر بتانا ہے کہ ہم سے بہتر کوئی نہیں۔" وہ رکا، "ایسر سنگھ! تم نے اگرچہ یہاں ہی رہ جانا ہے لیکن تمھاری وفاداری میرے اور گاؤں کے ساتھ ہونی چاہیے۔ کئی نسلوں سے ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور اب آخری بار تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" محمد مالک کو اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے خاموش ہونا پڑا۔ تینوں خاموشی میں ڈوبے ہوئے ایک دوسرے سے نظر بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اُنھیں ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کئی صدیاں پیچھے چلے گئے ہیں اور سامنے میدان کو پدرا کرتے ہوئے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے رکے ہیں۔

"بھائیا! تمھیں ہماری وفاداری پر شک ہونا ہی نہیں چاہیے۔ ہمارا رشتہ کسی ملک کے ساتھ نہیں، ہم تو صرف اِس گاؤں کے رہنے والے ہیں۔" ایسر نے دونوں کو دیکھتے ہوئے اپنے کنبے کی نمائندگی کی۔

محمد مالک نے ایک لمبی سانس لے کر دونوں کو دیکھا۔

''ہم پر حملہ اس طرف سے ہونا ہے۔'' محمد مالک نے شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ کرنے والے تھوڑا مغرب کی طرف سے آئیں لیکن گاؤں میں داخل ہونے کے لیے اُنھوں نے یہاں سے ہی آنا ہے۔ اس لیے میو اور لبانے اس علاقے میں مورچے کھود کر مقابلہ کریں گے۔ چوہڑے بھی ہمارے ساتھ کئی نسلوں سے آباد ہیں لیکن لڑائی لڑنا اُن کے وس ویں نہیں ہے۔ وہ صرف جہاں ضرورت ہوگی سامان پہنچائیں گے۔ ایک دستہ گاؤں کے اندر گلیوں میں چکر کاٹتا رہے گا تاکہ اگر حملہ کرنے والے کسی طرف سے گاؤں میں داخل ہو جائیں تو وہ بچ کر واپس نہ جا سکیں۔'' محمد مالک رُکا، اُس نے دونوں کے چہروں کے تاثرات کو غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کر بات جاری رکھی،'' گاؤں میں گلیوں میں پھرنے والے آوارہ قسم کے لڑکے یہ کام کریں گے۔ ہم بھی گاؤں کی گلیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن اُن کی طرح نہیں۔ اُن کے پاس کاربین اور درانتیں ہوں گی۔''

''ہم نے کیا کرنا ہوگا؟'' رحیم بخش نے بے یقینی سے پوچھا۔ محمد مالک اُس کی جھجک کو سمجھتا تھا، یہ امن پسند لوگ تھے، انھوں نے ساری زندگی محنت کرنے میں گزاری تھی اور سوائے اپنی بیویوں کے کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا اور آج وہ اُنھیں بندوقوں، تلواروں، برچھیوں، چھویوں اور ڈانگوں سے لڑنے کا کہہ رہا تھا۔

''نشانہ لے کر گولی چلانا ہوگی۔''

''اگر کسی کو گولی لگ گئی؟'' رحیم بخش کی آواز میں خوف کی کپکپی تھی۔

''وہ مر جائے گا۔'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر وہ مر گیا تو سرکار درمیان میں آجائے گی۔ سننے میں آیا ہے کہ ہمارے تھانے کا نیا بڑا تھانے دار بڑا سخت سکھ ہے۔'' رحیم بخش نے معصومیت کے ساتھ کہا۔

''اِس مرنے مارنے میں سرکار درمیان میں نہیں آئے گی۔''

''تحصیل دار بھی کچھ ایسی ہی بات کر رہا تھا۔'' محمد بخش نے سوچتے ہوئے کہا۔'' وہ ایک دفعہ شام کو بیٹھک کے پاس آیا تھا۔'' رحیم بخش نے ایسر کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر اہمیت کے ساتھ کہا۔

کھو دیا بوڑھ کو ہم ایک سیدھ مان کر چڑھدے کی طرف میو مورچہ بنائیں گے اور
لمبانے ہوں گے۔"
ایک لمبا مورچہ ہو گا کھالی کی طرح یا....." کیسر نے فقرہ آدھا چھوڑ دیا۔ محمد مالک نے
پر سوچا نہیں تھا۔ اُسے ایک دم خیال آیا کہ لمبی کھائی ہی بہتر ڈیفنس ہے کیوں کہ یہ حملہ کرنے
ایک رکاوٹ بھی ہو گی۔ گھڑسواروں کو شاید اپنی سواریوں پر سے اُترنا پڑے۔
لمبی گہری کھالی کی طرح۔ بس یہی سوچ لو کہ ایک چھوٹی سی نہر کھودنی ہے۔"
کب سے شروع کریں؟" رحیم بخش نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
ذہن میں رکھو۔ جلد ہی شروع کریں گے۔" محمد مالک نے سوچتے ہوئے کہا۔"اور
بھی نہیں چلنا چاہیے۔"
پتا نہیں چلے گا۔" کیسر نے جواب دیا۔"جب ہم نے کھدائی شروع کی تو یہی
ٹوئیں یا بنیں فصلوں کو پانی کے لیے نالیاں، کھالیاں اور راستے تو بنانا ہی پڑتے
کہیں گے کہ ہاڑی کے لیے کنویں سے پانی اُس طرف،" اُس نے مغرب کی طرف
لے کے جا رہے ہیں۔" اُس طرف زمینی سطح اتنی بلند تھی کہ پچھلے چار سو سالوں سے پانی
چایا نہیں جا سکا تھا۔ محمد مالک کو کیسر کی منطق پسند آئی۔ اُس نے تعریفی نظر سے کیسر کو
ر نے شرارت بھری نظر سے رحیم بخش کی طرف دیکھا۔
"پتا لگ جائے گا کہ مورچہ کون گہرا کھودتا ہے!" رحیم بخش نے غصے کے ساتھ کہا۔
"مجھے پتا ہے۔" کیسر نے میٹھے لہجے میں آہستہ سے کہا۔
"بتاؤ؟" رحیم بخش نے غصے کے ساتھ کہا۔
"تم اور تمھارا کنبہ۔"
رحیم بخش کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا، وہ کیسر پر جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔
"جب تک کام شروع نہ ہو کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔" محمد مالک نے سنجیدگی کے
ساتھ ہی تھوڑی دیر پہلے والا ہلکا پھلکا ماحول بھک سے اُڑ گیا۔

محمد مالک نے عبدالرشید کی شادی پہلی بیساکھ کو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے ذہن میں شادی کی تاریخ کا تو طے کر لیا لیکن اُس نے لڑکی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اُس کی شادی گاؤں میں ہی کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ کسی حد تک غریب گھر اور مقامی لڑکی زندگی کے سفر میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اُس کے لیے چودھری محمد مالک کی بہو بن جانا ہی کافی تھا خواہ اُسے تمام عمر بجو کا ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ وہ ہاجرہ کے ساتھ بات کرنے سے پہلے خود اطلاعات اکٹھی کر لینا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی لمبی بحث میں نہ پڑے رہیں کیوں کہ ماسی کے فوت ہو جانے کے بعد سے اُس کے رویے میں تبدیلی آ گئی تھی؛ اُس نے سوال پوچھنا شروع کر دیے تھے۔ اُسے شروع میں تو یہ کسی حد تک نامناسب لگا تھا لیکن پھر وہ سمجھ گیا کہ ہاجرہ گھر میں ماسی کی کمی کو بھی خود پورا کر رہی تھی، اُس کی بحثیں دراصل اُس کی تنہائی کو ظاہر کرتی تھیں؛ عبدالرشید کی شادی کے بعد شاید وہ ماسی بن جائے۔

ماڑی بوچیاں چند جھگیوں کے کلسٹر کے بجائے اب ایک بڑا گاؤں تھا جس کی اپنی پٹواریں تھیں اور وہاں کئی راجپوت خاندان آباد تھے جن میں سے چند کو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ اُس نے ایک دن کیسر کے چھوٹے بھائی لہنگے کو بلا بھیجا، وہ خود دیوان خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"لہنگیا!"

"جی بھائیا!"

"تمھارے ذمے ایک کام لگانا ہے۔"

"حکم کر بھائیا۔"

"تم لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو، عبدالرشید کا رشتہ کہیں دیکھو۔"

"پابیا! میں تو ایک غریب سا آدمی ہوں، میں تو اپنے جیسا ہی رشتہ دیکھوں گا۔"

"مجھے بھی ایسا ہی رشتہ چاہیے۔"

لہنگے نے حیرانی کے ساتھ محمد مالک کی طرف دیکھا۔

''چھوٹے گھر سے آنے والی لڑکی خدمت گزار ہوتی ہے جب کہ بڑے گھر والی پہلے
ں چودھرائن ہوتی ہے۔ گھر میں ایک ہی چودھرائن وارا کھاتی ہے۔'' پھر وہ آہستہ سے
یسے ہی بھانڈے کھڑکتے رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے، پاپیا! نظر مارتا ہوں۔''

''جب بات چلاؤ تو میرا بعد میں بتانا، رشتے سے لوگ تھوڑا گھبرا جائیں گے۔'' محمد
احتیاط سے کہا۔

''ٹھیک بھائیا!''

''پہلی بیساکھ کو میں نے نوں لے آنی ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا۔''

''ٹھیک بھائیا!''

''حقہ پیو گے؟'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بھائیا! تمھاری وہی باتیں...... جی تو کرتا ہے لیکن گروؤں نے منع کر رکھا ہے۔'' لہنگے
ی طرح ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''تم ایک کش لو، گرو میرے ذمے رہے۔'' دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ لہنگے کے
، بعد محمد مالک دیوان خانے میں دیر تک اکیلا بیٹھا رہا۔ اُن دنوں میں دیوان خانے میں
آتے تھے، ہر طرف ایک بے یقینی سی پھیلی ہوئی تھی اور لوگ ایک عجیب طرح کی بے چینی
، کی کیفیت میں زندگی گزار رہے تھے۔ گھروں کو چھوڑنے کا دکھ، عدمِ تحفظ اور نئے ملک
آباد ہونے کا جوش انھیں کبھی کم ہمتی کی طرف دھکیل دیتا اور کبھی سرما کے بادل کی طرح
ی اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ وہ نا جانے کی خواہش اور نئے ملک میں جا آباد ہونے کی
پھنسے گہری نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار تھے۔ وہ خود بھی اکیلے بیٹھنے کو ترجیح دیتا تھا، اُس کے
ی کی معمول کی بات چیت اور اُن کے اہم سے انتہائی غیر اہم معاملات سننے اور اُن سے
لاف بھگتانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ اکیلے بیٹھ کے اپنی پریشانیوں اور سوچوں کے سمندر
ہو کے پار اُترنے کے لیے کشتیاں بنانے کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ جانے سے پہلے ایک آخری
۔نا چاہتا تھا۔ اُسے پتا تھا کہ رائے بوچہل پانی پت کی شکست کے بعد اُن کے اندر آخری
ے جانے تک زندہ تھا۔ رانا سانگھا کے خاندان کے متعلق اُنھیں کوئی خبر نہیں تھی، لیکن بوچہ

مل اُن کے اندر ایک خاموش آگ روشن کر گیا تھا جو بھڑکی کبھی نہیں لیکن سلگتی ضرور رہی۔ محمد مالک اکثر سوچتا: کیا بوچہ مل کو علم تھا کہ اُس کی نسلوں میں سے ایک کو آخری جنگ لڑنا پڑنی ہے؟ کیا اُس کے اندر کا سپاہی اُسے یہاں اس لیے لے کر آیا تھا کہ آخری معرکہ میں حملہ آوروں کے پاس حملے کا ایک ہی راستہ ہو اور اس کی نسل جارحانہ دفاع کرتے ہوئے کامیاب ہو جائے۔ کیا بوچہ مل کے اندر کا سپاہی مہارانا کے رد کیے جانے کی وجہ سے اُن کے اندر آج تک زندہ تھا؟ وہ اُس جنگ میں کامیابی کے بعد یہاں سے نکلے گا کیسے؟ اُس کے دشمن تو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور دریا تک جانا بھی شاید ممکن نہ ہو اور اگر وہ دریا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو امرتسر تک بھی پہنچ جائے گا۔ وہ گاؤں کو کس وقت خالی کرے؟ عورتوں اور بچوں کو بیڑیوں تک کیسے لے کر جائے؟ کیا رحیم بخش اور اُس کا خاندان اتنی کشتیاں اکٹھی کر سکیں گے؟ اگر ایسے موسم میں جانا پڑا جب دریا طغیانی میں ہو تو کشتیاں پار کروا سکیں گی؟ ایسا تو نہیں ہوگا کہ لوگ لمحوں کے ٹوٹنے کے انتظار میں ہوں اور سکھ حملہ کر کے اُنھیں گاجر مولیوں کی طرح کاٹ کر رکھ دیں۔ اُس نے بیٹے کی شادی میں اپنے مخالفوں کو بھی بلانا ہے۔ کیا اُنھیں بلانا ضروری تھا؟ یقیناً ضروری تھا، وہ اُنھیں بلا کر اپنی برتری کا پیغام دینا چاہتا تھا۔ وہ اُن سے ایسے ملے گا جیسے وہ صدیوں سے ایک دوسرے سے ملتے آئے تھے۔ اُس نے سوچا کہ اُسے یہاں سے جانے کا اتنا دکھ کیوں ہے؟ لوگ تو اِسے نوشتہ، تقدیر یا ایک فرض سمجھتے ہوئے یہاں سے جا رہے تھے، وہاں کون سا مقدر اُن کے انتظار میں تھا، وہ اِس سے لاپروا تھے۔ وہ اپنے نظریے کی تکمیل کے لیے وہاں جا رہے تھے؛ اُس کا بھی کوئی نظریہ تھا؟ اُن کا نظریہ صرف علاقے پر اپنی برتری قائم رکھنا رہا ہے۔ اِس کا آغاز تو بوچہ مل نے یہاں آباد ہو کر ہی کر لیا تھا۔ اُس نے اِس بے آباد اور ناقابلِ کاشت زمین کو آباد کر کے دو لوگوں اور ایک جھونپڑی سے یہاں زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ کیا وہ دونوں اُن کے لیے آدم اور حوا تھے؟ وہ کون سے آسمان سے اُترے تھے؟ وہ نئے ملک میں جانے کے بعد کیا لوگوں پر اپنی برتری قائم رکھ سکے گا؟

محمد مالک اپنے خیالوں سے ایک دم خوف زدہ ہو گیا؛ وہ گھبرا کر تھڑے پر ٹہلنے لگا۔ وہ اپنی بے چینی کی مہمیز سے ٹہل رہا تھا، اُسے اچانک خود سے خوف آنے لگا۔ کیا وہ پاگل ہو رہا تھا؟ اُس کے اندر نفرت بھر گئی تھی یا ایک ضد نے اُسے کسی بہکاوے میں لے لیا تھا؟ وہ سیڑھیاں اُتر کر حویلی میں چلا گیا۔ وہ وقت جانوروں کے آرام کا تھا؛ کچھ بیٹھے جگالی کر رہے تھے اور کچھ آ

نہیں بند کیے کوؤں اور شارکوں کے آنکھوں کی گیڈ اور کانوں کی میل نکالنے کا مزہ لیتے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔ گھوڑیوں نے اُسے پھاٹک میں سے داخل ہونے پر کنوتیاں کس کر دیکھا اور پھر کان ڈھیلے چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اُس نے اچانک دریا تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گنگو نے اُسے بتایا ہوا تھا کہ وہ کہیں اکیلا نہ جایا کرے، اُس نے سوچا کہ وہ ایسی گھوڑی پر جائے گا جس کے سرپٹ بھاگنے کو ہوا ابھی نہیں چھو سکے گی۔

محمد مالک کے ہونٹوں پر ایک دل چسپ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ نوکر مال کے لیے چارہ کاٹنے گئے ہوئے تھے اور اُس نے گھوڑی پر کبھی زین نہیں کسی تھی؛ یہ بھی نہیں کہ اُسے زین کسنی نہیں آتی تھی، اُسے ایسا کرنا کبھی شایانِ شان نہیں لگا تھا۔ اُسے تو صرف لگام دینا ہی آتا تھا۔ اُس کا ڈالا ہوا تارو کبھی سیدھا نہیں ہوتا تھا، اُس میں ہمیشہ کان ہوتی اور اِسی طرح کاٹھی رکھنے کے بعد وہ کمر بند کبھی صحیح طرح سے کس نہیں سکا تھا۔ آج کیا وہ کاٹھی ڈالنے کی کوشش کرے یا یہ تجربہ ہوگا۔ اُسی وقت عبدالرشید حویلی میں داخل ہوا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اُس نے حیران ہو کر محمد مالک سے پوچھا۔

"دیوان خانے میں دِل گھبرا رہا تھا تو یہاں چکر لگانے چلا آیا۔ اب سوچ رہا ہوں گھوڑی پر ایک چکر لگا آؤں۔"

"کہاں جائیں گے؟" اب عبدالرشید کے لہجے میں حیرانی کے بجائے تجسس تھا۔

"کام ہے کوئی؟" عبدالرشید کا اشارہ دریا کی طرف تھا۔

"نہیں، کام تو کوئی نہیں بس ایسے ہی صبح سے ایک کھچاؤ ہے، کچھ دیر پانی کو بہتے ہوئے دیکھوں گا، کچھ سکون ملے گا۔"

عبدالرشید نے حیرت کے ساتھ اپنے باپ کی طرف دیکھا، جیسے اُس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو پہلے کبھی نہ کہی گئی ہو۔

"آپ پہلے تو کبھی نہیں گئے؟"

محمد مالک کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اُسے ایک طرح کی یہ جرح پسند نہیں آئی لیکن اُسے خوشی بھی ہوئی کہ عبدالرشید اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ سوال کرنے لگا ہے، اُس نے لنگے کو ذمے داری دے کر صحیح ہی کیا کیوں کہ اب بچھیرے کو لادو نکالنے کا وقت آ گیا تھا۔ بچھیرے کے گردن اُٹھا

کہ ہوا کو سونگھتے ہی اُس کی پیٹھ پر جھپٹ رکھ دینی چاہیے۔

''پہلے نہیں گیا تو کبھی جانا ہی نہیں چاہیے؟'' اُس نے ملی جلی مصنوعی اور اصلی ناراضی کے ساتھ کہا۔ ''تمھیں کاٹھی ڈالنی آتی ہے؟'' محمد مالک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی کام ہے۔ ہر زمین دار کو آتی ہے۔''

''میں بھول گیا ہوں۔ میں تو تارو بھی سیدھا نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی....''

''میں ڈال دوں؟'' عبدالرشید نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، ڈال دو۔'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے کہا۔

محمد مالک گھوڑی پر بیٹھ کر حویلی سے باہر نکل آیا۔

محمد مالک ایک اچھا سوار تھا، وہ اب بھی ایال پکڑے بغیر گھوڑی پر پلاکی لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ اُسے اِس طرح نکل آنے پر حیرت ہوئی، وہ آہستہ آہستہ دریا کی طرف چل پڑا۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت میں دریا کی طرف کھچا چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اُس نے اچانک لگام کے ہلکے سے اشارے سے گھوڑی کو روک دیا۔ اُس نے سوچا کہ ایسے تو نہیں کہ کوئی انہونی ہو رہی ہے اور تقدیر اُسے اُس جگہ کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہو جہاں اُس کی موت لکھی ہے؟ اُس نے ایک لمبی سانس لی، چاروں طرف نظر دوڑائی، اُسے کچھ بھی معمول سے ہٹا ہوا نظر نہیں آیا۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے درخت اور گھنی جھاڑیوں کی قطاریں تھیں اور ایک اُداس سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کیا وہ واپس مڑ جائے؟ کیا وہ مڑ جانے سے خائف تھا یا آگے جانے سے؟ اُسی وقت گھوڑی نے نتھنے پھیلائے، سر اوپر اُٹھا کر کنوتیاں کسیں اور سامنے دیکھنا شروع کر دیا؛ اُس کے بدن میں ایک کھچاؤ تھا جیسے وہ سرپٹ بھاگنے کے لیے تیار ہو۔ محمد مالک نے ارد گرد دیکھتے ہوئے خاموشی میں دیگر آوازیں سننے کے لیے کان لگاتے ہوئے گھوڑی کی گردن پر پیار سے تھپکی دی۔ محمد مالک کی پیار بھری تھپکی سے گھوڑی کے کھچاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اُسی وقت محمد مالک کو سامنے سے ایک سوار آتا نظر آیا۔ اِس طرح جاتے ہوئے کسی گھڑ سوار کا نظر آ جانا کسی طرح بھی معمول سے ہٹا ہوا واقعہ نہیں تھا۔ اب اُسے سوار کے رُکنے یا پاس سے گزر جانے کا انتظار تھا۔ سوار پاس آ کر تھوڑا سا جھجکا اور پھر لگام کھینچ کر رُک گیا۔ وہ ایک خوش شکل خوب صورت نوجوان تھا۔ اُس کی ڈاڑھی بکھری ہوئی تھی اور لباس بھی میلا تھا۔ محمد مالک نے دائیں ہاتھ کی طرف لٹکتی ہوئی کرپان بھی دیکھی۔

''ست سری اکال بھائیا!'' نوجوان کی آواز میں تھکاوٹ کا بھاری پن تھا۔

''سلام، ست سری اکال!'' محمد مالک نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے اپنی آواز میں خوش مزاجی لاتے ہوئے کہا۔

''بھائیا! ایک ضروری سُنیہا ہے۔''

محمد مالک کو اپنے جسم میں گھوڑی والا تناؤ محسوس ہوا۔

''بسم اللہ!'' محمد مالک نے سنجیدگی سے کہا۔

''گنگو کے گرد سرِکار گھیرا تنگ کر رہی ہے۔ وہ کچھ دیر آپ کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔'' سوار نے محمد مالک کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے تھکے سے لہجے میں کہا۔ محمد مالک اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر سوار کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ گنگو کی مدد کرنا چاہتا تھا، اُسے خود بھی گنگو کی مدد کی ضرورت تھی لیکن وہ سرکار کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر بڑے تھانے دار کو پتا چل گیا تو وہ کیا سوچے گا؟ اُس نے سوچا کہ اُسے گنگو اور سرکار کے درمیان میں ایک کو چننا ہوگا۔ اگر وہ گنگو کو پناہ نہ دے تو وہ اُس کی مجبوری کو سمجھ جائے گا لیکن پھر اُس میں اور دوسرے لوگوں میں فرق کہاں ہوا؟

''اُس کا اپنا گھر ہے۔ اُسے بغیر جھجک کے آجانا چاہیے تھا۔'' محمد مالک نے مبالغہ آمیز لاپرواہی سے کہا۔

''وہ کل شام سورج غروب ہوتے ہی آجائے گا۔''

محمد مالک کے جواب دینے سے پہلے ہی گھڑسوار نے گھوڑی کو ایڑی لگادی!

محمد مالک کے لیے گنگو کو دیوان خانے میں رکھنا ممکن نہیں تھا، گنگو اُس کے پاس رہنے کے بجائے چھپنے کے لیے آرہا تھا اور اُس نے اُسے رکھنا نہیں چھپانا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُسے کسی گھر میں رکھے گا لیکن کس گھر میں؟ پہلے اُس کے ذہن میں میو آئے اور اُس نے فوراً اس سوچ کو رد کر دیا۔ میو گاؤں گاؤں مچھلی بیچتے تھے اور انھیں اپنی زبان پر قابو نہیں تھا، انھوں نے اپنی بڑائی اور اہمیت ثابت کرنے کے لیے گنگو کے موجود ہونے کے پردے کو اُٹھا دینا تھا۔ اگر اُسے لبانوں کے گھر میں رکھے تو لبانے ہم مذہب ہونے کے ناتے سے شاید راز نہ رکھ سکیں اور خبر پولیس تک پہنچ جائے۔ محمد مالک کو چوہڑے سب سے محفوظ لگے۔ اُس نے گنگو کو اُن کے کسی گھر میں رکھنے کا فیصلہ کر کے واپس گاؤں کا رُخ کیا۔ دیوان خانے میں پہنچنے کا بعد اُس نے منگو اور سردارے کا بلا بھیجا؛ دونوں اپنی قوم کے سربراہ ہونے کی وجہ سے اُن کے چھوٹے موٹے جھگڑے چکاتے اور محمد مالک کے پاس وہی معاملہ آتا جہاں کوئی فریق چوہڑوں کے چودھریوں کی بات ماننے سے انکار کر گیا ہوتا یا جہاں اہم آدمی آپس میں تقسیم ہوئے ہوتے۔

سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے وہ دونوں دیوان خانے میں پہنچ گئے۔ محمد مالک دیوان خانے میں نہیں تھا۔ وہ اُس کے انتظار میں، اپنی جوتیاں اُتار کر، اُن کے اوپر بیٹھ گئے۔ سردارے نے اپنی چلم اُتار کے حقے پر محمد مالک کے حقہ کی ٹوپی رکھی اور آنکھ مارتے ہوئے لمبا کش لیا۔

''چودھری کی ٹوپی سے کش لیتے ہوئے مزہ ہی علیحدہ آتا ہے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے حقہ منگو کی طرف موڑا۔ منگو نے بھی ایک لمبا کش لیا۔

''کسی نے پٹھوں کی چوری تو نہیں کی؟'' اُس نے دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''جب چودھری نے اجازت دے رکھی ہے کہ چوری کاٹنے کے بجائے مانگ کر لے لیا کرو تو یہ کنجر چوری ہی کرتے ہیں اور کھچائی ہماری ہوتی ہے۔''

''اِس سال بارش نہیں ہوئی، گھاس کم ہے۔ جانوروں کی چرائی کا مسئلہ ہوگا۔''

سردارے نے حقہ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔
''مسئلہ تو دوسرا ہے۔'' منگو نے سردارے کو کش لیتے ہوئے دیکھ کر بات شروع کی، ''سنا ہے ملکوں کی ونڈ ہونے والی ہے اور بہت بڑا اُجارا ہونے والا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ چودھری چلا جائے گا اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ کسی کو بتائے بغیر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔''
سردارے نے کش لے کر حقہ منگو کی طرف موڑا۔ ''چودھری بغیر بتائے نہیں جائے گا۔ اگر اُس نے ہمیں ساتھ جانے کا کہا تو؟'' سردارے نے بات ختم کر کے منگو کی طرف دیکھا۔ منگو کے ماتھے پر لکیریں بن گئی تھیں۔ گھروں سے باہر ہر قسم کے موسموں میں زندہ رہتے ہوئے اُن کے چہروں کی جلد اتنی سخت ہو گئی تھی کہ اُس پر کوئی تاثر یا نشان نظر نہیں آتا تھا لیکن سردارے کی بات پر منگو نے اتنی شدت کے ساتھ غور کیا کہ ماتھے پر لکیریں اُبھر آئیں۔
''ہم اِس کھیل میں آتے نہیں۔ یہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا مسئلہ ہے۔ ہم تو بس خوامخواہ ہی ہیں۔'' سردارے نے ہنستے ہوئے رائے دی۔ منگو کے ماتھے پر سے لکیریں غائب ہو گئیں۔ اُس نے ایک لمبا کش لیا اور حقے پر سے ٹوپی اُتار کر واپس محمد مالک کے بیچواں پر رکھ دی۔
''برتن ڈھکا نہ ہو تو کتے کو شرم چاہیے۔'' منگو نے واپس بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا۔
دونوں خاموش بیٹھ کر محمد مالک کا انتظار کرنے لگے!
''آ گئی میری برادری!'' محمد مالک نے ہمیشہ کی طرح ہنستے ہوئے وار کیا۔
''برادری ہیں تو تیرے پیچھے چوری کاٹ لیتے ہیں۔'' منگو نے ہنستے ہوئے احتیاطاً ایک شوشہ چھوڑا۔
''مجھے بتاتے کیوں نہیں؟'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے اپنی پاٹ دار آواز میں بات شروع کی، ''کہ تم دونوں میں سے چوہڑوں کا بڑا چودھری کون ہے؟''
''چودھری تو تو ہے ہمارا۔'' سردارے نے ہنستے ہوئے جوابی وار کیا۔ محمد مالک نے جواب میں فلک شگاف قہقہہ لگا کے حقے کا چھوٹا سا کش لیا۔
''تم میرا حقہ پیتے رہے ہو؟ پہلے کش سے ہی تمبا کو آ گیا۔''
''ٹوپی رکھی تھی۔''
''پی بھی لو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ قوم بڑی سَین یاوی ہے۔'' محمد مالک نے

بنتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے ایک لمبی سانس لی، ایک کش لے کر ارد گرد دیکھا جیسے کوئی بے ترتیبی دیکھ رہا ہو۔ ''میں نے تمھیں ایک ضروری کام کے لیے بلایا ہے۔'' اُس نے پھر ایک کش لیا۔ سردارے اور منگو نے ایک دوسرے کو اطمینان کے ساتھ دیکھا۔ ''جو میں کہنے لگا ہوں وہ ہم تینوں کے درمیان ہی رہنا چاہیے۔'' محمد مالک کے لہجے میں اپنایت کے ساتھ ایک طرح کی دھمکی بھی تھی۔ وہ دونوں بھی چوکنے ہو گئے۔

''میں اپنے ایک مہمان کو بھٹھی میں ٹھہرانا چاہتا ہوں۔'' محمد مالک نے نظر بچاتے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ پر اعتماد نظر آنا چاہتا تھا۔

''چودھری جی!......'' سردارے نے احتجاجی لہجے میں بات شروع کی مگر منگو نے اُسے

ٹوک دیا،

''چودھری کی بات تو پوری ہونے دو.....'' منگو نے سردارے کو ڈانٹا۔ ''چودھری جی! یہ چوہڑا ہی رہے گا۔ تم اپنی بات کرو۔''

محمد مالک نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا، اُسے دونوں سے ایسے ہی ردِ عمل کی توقع تھی۔ ''میرا ایک تعلق والا ہے اُسے تم دونوں کی نگرانی مین ٹھہرانا ہے۔ ایک تو اُس سے واقفیت نہیں نکالنی، دوسرے اُس کو ہمیشہ نظر میں رکھنا ہے اور اُس کے بارے میں اگر کوئی باہر والا جاننے کی کوشش کرے تو فوراً مجھے بتانا ہے اور اُسے روز ایک بوتل دینی ہے جو پہلے توڑی ہو۔''

''بھٹی تو چودھری جی.....''

''دیکھو! تم یہاں تیسری نسل سے آباد ہو۔ بھٹھی میں بھٹیوں کی تعداد کا مجھے پتا ہے .....'' منگو سر جھکا کر ہنسا اور اپنے بجھے ہوئے حقے کے کش لینے لگا۔

''ٹھیک ہے چودھری جی! تمھارے مہمان کی سیوا اور حفاظت کرنا ہمارا دھرم ہے۔ تم گرم دودھ پی کے سو رہو۔''

''اُسے سردارے اپنے گھر میں رکھو۔ تمھارا کنبہ اتنا بڑا نہیں، بیٹا اور بہو ہیں۔ بہو کو میکے بھیج دو اور بیٹا بھی ساتھ چلا جائے۔ وہ تھوڑے دن رہے گا اور شاید پھر کہیں اور چلا جائے۔'' لگ رہا تھا کہ محمد مالک اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ ''اُس کے بعد وہ جہاں چاہے جائے، میری دعا اُس کے ساتھ ہے۔'' محمد مالک نے اندھیرے میں کہیں دور کھڑے گنگو کو دیکھنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔

سردارے نے تائید کے لیے منگو کی طرف دیکھا جو نظر محمد مالک نے بھی دیکھ لی۔

''ساتھ ہی چوہڑوں کے گھی کی طرح جم گئے ہو!......''

''میری بہو کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔'' سردارے نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''منگے کا کنبہ اتنا بڑا ہے کہ اُنھیں کہیں بھیجا نہیں جا سکتا۔ یہ تم نے ہی کرنا ہے۔ مہمان کو میں اور کسی گھر میں رکھنا نہیں چاہتا۔ تم ایسے کرو،'' محمد مالک نے حقے کا کش لیا، دونوں کی طرف دیکھا، ''میں اپنا گڈا دیتا ہوں، تم اپنی بہو کو اُس میں چھوڑ آؤ۔''

سردارے نے زمین پر بڑی اُنگلی سے لکیریں لگاتے ہوئے سوچنا شروع کر دیا۔

''ٹھیک ہے چودھری جی! جیسے تیری رضا!''

''تم واپس آ کے اپنے گھر میں ہی رہنا اُس کی خدمت کرنے کے لیے۔''

''ٹھیک ہے چودھری!''

وہ دونوں محمد مالک سے اگلی بات سننے کے انتظار میں بے چینی سے بیٹھے تھے۔ محمد مالک حقے کی نے کو اُنگلیوں میں گھما رہا تھا۔

''تمھیں پتا ہونا چاہیے کہ میرا مہمان کون ہے کیوں کہ تم دونوں نے اُسے دیکھ تو لینا ہے۔'' محمد مالک نے ایک کش لے کر دونوں کی طرف دیکھا، ''میرا مہمان بیجو چک کا گنگو ہے۔''

سردارے اور منگو کے چہروں پر خوف، خوشی، تجسس، حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثر پھیلنے اور مٹنے لگے، دونوں بے چین بھی نظر آ رہے تھے۔ ''میرے لیے تو یہ بڑی بات ہو گی کہ گنگو میرے گھر رہے گا۔'' سردارے نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

''چودھری جی! تم نے چوہڑے کو کیا سے کیا بنا دیا۔ سردار گنگا سنگھ تو ہمارے علاقے کی شان ہے اور وہ اِس مادر چود کا مہمان ہو گا۔'' منگو کی آواز میں خوشی اور غرور کی کپکپی تھی، ''کہاں راجہ بھوجا مل اور کہاں بے چارہ چندرا گنگو تیلی۔''

''ہماری جان بھی حاضر ہے۔''

''اب چوہڑوں والے بھاشن دینا بند کرو۔'' محمد مالک نے دونوں کو ڈانٹا، ''اب گھر جاؤ اپنے اپنے اور سردارے تم جانے کی تیاری کرو۔ کل خفتہ سے پہلے آ جانا تا کہ اگر گنگا آئے تو تم

یہاں ہو۔ جاتے ہوئے کنجی منگے کو دے جانا۔"

دونوں نے اُٹھ کر اپنی جوتیاں جھاڑیں اور پہن کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اگر مخبری ہوئی تو گنگو کی گولیاں تمھاری تشریفوں کے پار ہوں گی۔" محمد مالک نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

"ہم بے غیرت چوہڑے نہیں۔"

"ٹھیک ہے، بس یاد رکھنا۔"

وہ دونوں اُٹھ کر دیوان خانے کی سیڑھیاں اُتر گئے۔

محمد مالک دیوان خانے میں بیٹھا اندھیرا پھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ جس جنگ میں داخل ہونے والا تھا کیا اُسے انجام تک پہنچا سکے گا؟ یہاں اُسے اپنے بھائیوں کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر اُس کا ایک بھائی بھی اور ہوتا تو ایک جنگ میں شامل ہوتا اور دوسرا لوگوں کو لے کر لکیر پار کر جاتا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ دونوں محاذوں پر کیسے پورا اُتر سکے گا؟ لیکن اُس نے دونوں محاذوں پر پورا آنا تھا۔ وہ گنگو کو یہاں رکھنے کا خطرہ بھی اِسی لیے مول لے رہا تھا۔ اگر گنگو کی مخبری ہوگئی تو وہ اُسے کیسے نکال پائے گا؟ اُسے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اب ایک بیٹے کی روایت ختم ہونی چاہیے اور اُس کے بیٹے کے کم از کم سات بیٹے ہونے چاہییں۔ اگر ایسا ہو گیا تو اُس کے گھر میں ہر وقت رونق رہے گی۔ کیا وہ اتنا عرصہ زندہ رہے گا؟ وہ تب تک زندہ ہے جب تک اُس کی نسل چل رہی ہے اور اُس کی نسل ہمیشہ چلتی رہے گی۔

عبدالرشید کی شادی یہاں ہونی چاہیے۔ دوسرے ملک میں جا کر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا حالات ہوں؟ کیا اُسے سب چھوڑ چھاڑ کر زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اُسے عبدالرشید کو یہ سمجھانا ہوگا کہ مستقبل تعلیم میں ہے اور اُسے اپنی اولاد کو تعلیم کے میدان میں آگے کے سفر کا آغاز کرانا چاہیے۔ اگر دور دراز کے کسی گاؤں کا رہنے والا تحصیل دار بن سکتا ہے تو اُس کا بیٹا کیوں نہیں؟ صرف اِس لیے کہ وہ تعلیم کی اہمیت کو جان گئے تھے! اب وہ بھی جان گیا ہے۔ ایک چودھری ہونا زندگی کا خواب نہیں ہونا چاہیے، اب وقت بدل رہا ہے۔ لوگ کسی انقلاب کی بھی بات کرتے ہیں جس میں زمین پر سب کا حق ہوگا۔ اگر ایسا ہو گیا تو اُس کی زمین کس کام آئے گی؟ اُسے انقلاب کا مقابلہ کرنا ہوگا؟ وہ کس کس کے ساتھ مقابلہ کرے؟ سکھ گاؤں پر حملہ

کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور اب انقلابی بھی اُس کے مدِمقابل آ گئے! اُسے اپنے آپ اور اپنے ناکارہ پن پر ترس آنے لگا۔ تعلیم کے بغیر کیا اُس کے سمیت پہلی تمام نسلیں جہالت کی دلدل میں ہی دھنسی رہیں؟ اُس کے پُرکھ علاقے کے نظام پر اپنا قبضہ رکھنے میں اتنے مصروف رہے کہ اُن کے نزدیک تعلیم صرف منشیوں تک ہی محدود تھی۔ لیکن اُس کے ایک پُرکھ کو ان پڑھ ہونے کے باوجود انگریز نے اُس کو علاقے کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اُسے آج انگریز کی چال سمجھ میں آئی تھی؛ اُسے علاقے کا سربراہ اِس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں سرکار برطانیہ کا زیادہ وفادار تھا۔

عبدالرشید سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آیا تو اپنے باپ کو اندھیرے میں بیٹھے دیکھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔

''میاں جی! لالٹین نہیں جلائی؟'' اُس نے اپنے باپ کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

''اوہ ہاں! لالٹین! کدھر گیا؟'' محمد مالک نے چونک کر پیل پائے کی طرف دیکھا جہاں نوکر روشن لالٹین لٹکاتا تھا۔ ''آج وہ آیا ہی نہیں ابھی تک۔'' محمد مالک نے خواب کے انداز سے ہی بات کی۔

''میں جلاتا ہوں۔''

محمد مالک نے دیکھا کہ عبدالرشید نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی تو محمد مالک جان گیا کہ وہ حقہ اور سگریٹ پیتا ہے۔ پھر اُس نے زہرخند سے سوچا کہ معلوم نہیں کہ اور کیا کیا پیتا ہوگا۔ اِس خیال سے اُس کے شادی کے فیصلے کو تقویت پہنچی۔

جب عبدالرشید لالٹین جلا کر لٹکا چکا تو محمد مالک نے اُسے سامنے والی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی!'' عبدالرشید نے بیٹھ کر بےزاری سے پوچھا۔

''دیکھو! تم اب بڑے ہو گئے ہو۔'' محمد مالک خاموش ہوا اور جواب نہ پا کر اپنی بات جاری رکھی، ''جب باپ اور بیٹے کے جوتے کا میچ ایک ہو جائے تو بیٹے کو ذمے دار ہو جانا چاہیے اور باپ کو اُسے اپنے ساتھ چلانا چاہیے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمھاری شادی کر دی جائے۔ وساکھی پر میرا ارادہ تمھاری شادی کر دینے کا ہے۔ ہم سب کی شادیاں وساکھی پر ہی ہوئی ہیں۔'' وہ جواب کے لیے رکا

اور نہ پا کر بات آگے چلائی، ''شادی کے بعد بچے پیدا ہوتے ہیں اور تمھارے بھی ہوں گے۔''

''جی!'' عبدالرشید کی آواز میں خاموش بیٹھنے کا جالا پھنسا ہوا تھا۔

محمد مالک نے حقے کا کش لیا اور دھواں نہ پا کر ناگواری کے ساتھ ارد گرد دیکھا کہ کوئی ٹوپی بھر لائے۔ عبدالرشید اُٹھنے لگا تو اُس نے اُسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

''میاں جی، آج کل لوگ گھابرے گھابرے سے پھرتے ہیں جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ دو یا تین آدمی جب کھڑے ہوں اور اُن کے پاس جا کھڑے ہوں تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں، ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی کھڑے تھے۔ وہ سہمے سہمے شکلیں دیکھتے ہیں جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں۔''

''ملک کی ونڈ ہونے والی ہے۔ لوگ جانا نہیں چاہتے لیکن انھیں جانا ہوگا اور جانا بھی چاہتے ہیں لیکن جانے سے ڈرتے ہیں کہ وہاں کس کے پاس جائیں! وہ اِس دھرتی کا حصہ ہیں اور نئی مٹی اُنھیں بے یقینی کی فصل کا بیج محسوس ہوتی ہے۔'' محمد مالک نے اپنی منطق دی۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں؟'' عبدالرشید نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں جانا نہیں چاہتا۔ جانے سے پہلے آخری جنگ کی تیاری بھی کر رہا ہوں، وہ جنگ جیت بھی لینی ہے کہ شکست کے ساتھ تعارف ہی نہیں لیکن اگر کوئی ذمے دار آدمیوں کا گروہ ضمانت دے تو نہیں جاؤں گا۔''

''کس بات کی ضمانت؟'' دل چسپی سے پوچھا گیا۔

''سلامتی کی۔''

''پورے گاؤں کی؟''

''ہاں!''

''اگر کوئی خاندان جانا چاہے تو؟''

''اُسے حفاظت کے ساتھ لکیر پار دھکیل دیا جائے گا۔''

''کسی سے آپ نے بات کی؟''

''نہیں!''

''آپ کریں گے؟''

''نہیں!'' پھر اُس نے کچھ سوچا،
''اگر اِس کے اُلٹ ہوا ہوتا تو میں روک لیتا۔''
''آپ کیوں روک لیتے؟''
محمد مالک کے ہلکے سے قہقہے میں گہرا طنز تھا۔
''کیوں کہ اُن میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی باتیں ختم ہو گئی ہیں یا وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔ عبدالرشید کو لگا کہ اُس کے باپ نے شام کے لیے جو کہنا تھا، کہہ چکا۔
''ہم دوسرے مسلوں کی طرف نکل گئے۔'' محمد مالک نے اچانک بول کر اپنے بیٹے کے خیالات کا تسلسل توڑا تو اُس نے چونک کر اپنے باپ کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ''تمھاری شادی آتی وساکھی کو کر دینی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم سب کی شادیاں وساکھی میں ہی ہوئی تھیں......''
''بو چالی کی بھی؟'' اُس نے نوجوانی کے تجسس اور اپنے باپ کو خوش کرنے کے لیے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے بڑھوں کے متعلق پوچھے گئے سوالات اُس کے باپ کو ہمیشہ خوش کرتے تھے۔
''میں وہاں موجود نہیں تھا۔'' محمد مالک نے قدرے برہمی سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک تلخ سی ہنسی ہنسا، ''کسی موسم میں ہو گئی ہو گی۔ ہاں تو.... میں تمھاری شادی کی بات کر رہا تھا۔ وساکھی میں کر دینی ہے۔ تمھاری شادی یہاں ہماری آخری شادی ہونی ہے اِس لیے میں اُسے میلے کا رنگ دینا چاہتا ہوں۔ تحصیل دار بھی آئے گا اور تھانیدار بھی۔ تمام سکھ، ہندو اور مسلمان معتبر آئیں گے۔ ہم نے یہ بھی ایک یادگار چھوڑ کر جانی ہے۔ لوگ سو سال تک کہا کریں گے چودھری محمد مالک کے بیٹے کی شادی مہاراجہ پٹیالہ کے ولی عہد کی شادی سے بھی زیادہ شان سے ہوئی تھی اور اِسی طرح جانے والے بھی ایسی ہی یاد لے کر جائیں گے کہ ہم نے اُجاڑے سے پہلے وہ دیکھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو ہماری جگہ آئیں گے اُن کے لیے یہ جادو کا ایک قصہ ہو گا جسے ہر سنانے والا ہمیشہ نئے موڑ دے گا۔'' وہ رکا، اندھیرے میں اپنے بیٹے کا تاثر دیکھنے کی کوشش کی اور بات جاری رکھی، ''تم بھی ایک بات یاد رکھنا۔'' پھر رکا، پھر بیٹے کا تاثر دیکھنے کی کوشش کی، دل چسپی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا، ''جب شادی ہوتی ہے تو اولاد بھی پیدا ہوتی ہے۔'' وہ پھر ہنسا، ''تمھارے بھی ہو گی

اور تم نے اُنھیں تعلیم دلوانی ہے۔ وہ ہماری طرح کم تعلیم یافتہ یا ان پڑھ نہ رہیں۔ تحصیل دار یا تھانے دار بنیں۔ لوگ اُنھیں اور طرح سے جانیں، نا کہ چودھری ولد چودھری ولد چودھری..... '' وہ رکا، '' گڑی یا واحقہ..... '' عبدالرشید جلدی ٹوپی لینے کے لیے اُٹھنے لگا تو محمد مالک نے اُسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ لالٹین کی زرد روشنی نے اندھیرے پر مقامی طور پر برتری حاصل کرنا شروع کر دی تھی، '' نئے ملک جا کر ہم اپنے خاندان کو ایک نئی شکل دیں گے۔ میں اِس ماں یاوی جھوٹی ٹور سے تنگ آ گیا ہوں۔ ''

عبدالرشید کو اُسی وقت شادی کے لیے بے چینی ہونے لگی!

ایک دن لہنگا دیوان خانے میں آیا تو محمد مالک کے پاس گاؤں کے چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے نظروں کے تبادلے کے ذریعے ایک خاموش مکالمہ کیا اور لہنگا حقّے سے تھوڑا دور زمین پر بیٹھ گیا۔ وہاں نئے ملک کو ہجرت کرنے کے فوائد اور نقصانات پر بات ہو رہی تھی،

''یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں۔'' ایک آدمی نے اپنی رائے دی۔

''کیوں؟'' ایک نے حقہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''انگریز کی حکومت سانجھی تھی، کسی ایک مذہب کی نہیں تھی۔ اُن کے جانے کے بعد سانجھ پن نہیں رہے گا۔ یہاں غیر مسلم حکومت ہوگی اور ہمیں ہمیشہ،'' اُس نے چوہڑوں کی بھٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو وہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی، کہا، ''اُن جیسا ہی سمجھا جائے گا۔''

''ہم اُن جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟'' کسی نے غصے سے پوچھا۔

''تم میں کیا خوبی ہے؟'' جواب میں بھی اُتنا ہی غصہ تھا۔

''وہ بھی ہماری طرح محروم اور بے بس لوگ ہیں۔'' ایک نوجوان نے رائے دی۔

''ہم کیسے محروم ہوئے، ہم جو حاکم رہے ہیں۔''

''حاکم وہ ہوتا ہے جو سوچ کے اندر تک چلا جائے۔ کیا تمہارے حاکم گئے؟ صرف خاندان تبدیل ہوتے رہے، ڈھنگ تو ایک ہی تھا۔ اور انگریز کا بھی ویسا ہی تھا صرف طریقہ کار مختلف تھا۔'' اُسی ناراض نوجوان نے الزام لگایا۔

''مسلمان تہذیب کو یہاں سے مٹتے ہوئے دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ لگتا ہے کوئی مٹانے کی جتنی بھی کوشش کر لے۔'' وہاں بیٹھے ایک سکول ماسٹر نے نوجوان کو جواب دیا۔

''ہلا منشی جی! وہ کیسے؟'' محمد مالک کا تجسس ایک جوش لیے ہوئے تھا۔

''چودھری جی! آپ کے خاندان کا اثر یہاں چار سو سال سے زیادہ عرصہ رہا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد کیا یہ ختم ہو جائے گا؟ کیا آپ کے خاندان کو لوگ بھول جائیں

گے؟ کبھی نہیں! یہاں جو بھی آئے گا وہ ہمیشہ تم ایسا بننے کی کوشش کرے گا جو اُس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ وہ اُس وقت تک تمھارے سائے تلے جیے گا جب تک ماڑی بوچیاں کا نام تبدیل نہیں کروالیتا۔ آج جو تمھارے مخالف ہیں کل اُس کے بھی مخالف ہوں گے اور وہ اپنا پچھلا وطن یاد کرے گا۔" ماسٹر نے اپنی گفتگو کا اثر دیکھنے کے لیے وہاں تمام چہروں کے تاثرات دیکھے۔ سب لوگ چہروں پر خول چڑھائے لاتعلقی سے ماسٹر کی بات سن رہے تھے۔ ماسٹر کو مایوسی تو ہوئی لیکن وہ جس نظریے کا آغاز کر چکا تھا اُسے سب تک پہنچانا بھی چاہتا تھا۔ "جو یہاں ٹھہریں گے اُن کی قدر نہیں ہوگی کیوں کہ وہ ایسی اقلیت ہوں گے جو کئی صدیاں اقلیت ہوتے اکثریت رہی اور جب وہاں چلے جائیں گے تو شاید ہمیشہ کے لیے منطق سے دور ہو جائیں کیوں کہ نئے ملک کے حامی منطق کے بجائے جذباتی خطبوں اور کھوکھلے نعروں کو اپنی زبان بنائے ہوئے ہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو؟ وہاں جایا جائے؟" کسی نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ تو جانے والوں کو خود کرنا ہوگا۔ میں یہ کہوں گا کہ جایا جائے۔" ماسٹر نے کچھ سوچتے جواب دیا۔

"کیوں؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہاں جانا منطق سے دور ہونا ہے۔" نوجوان نے وار کیا۔

"ہاں اب بھی یہی کہتا ہوں اِس کے باوجود وہاں جانا منطق ہے اس لیے کہ یہاں بے قدرے ہونے سے وہاں جا کر بے وقعت ہونا کہیں بہتر ہے۔ نیا ملک ہے اور وہاں زندگی از سر نو شروع کرنی ہوگی جیسے بوچہ مل بھٹی نے یہاں آباد ہو کر کی تھی۔"

"سُن منشی! ابھی تم نے کہا تھا کہ یہاں آنے والا اپنا پچھلا وطن یاد کرے گا۔ کیا میں وہاں جا کر اِس گاؤں کو یاد کروں گا؟" محمد مالک نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

"چودھری جی!" ماسٹر نے طنز سے بھرپور ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ "اپنا وطن نہیں بھلایا جا سکتا۔ ہم لوگ نئے ملک کے شہری بن جائیں گے لیکن راتوں کو خواب یہاں کے دیکھیں گے۔ ہمارے جسم وہاں آباد ہونے کی جدوجہد کر رہے ہوں گے لیکن سوچ یہاں ہوگی۔"

"ماسٹر! تم نے ابھی کہا کہ جو یہاں آئے گا میرے دشمن اُس کے بھی دشمن ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے وہ میرے دوست ہوئے!" محمد مالک نے معصومیت سے پوچھا۔

"چودھری جی! ہر کسی نے اپنی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔ نیا آنے والا اُن کے لیے خطرہ

ہوگا اِسی طرح آپ وہاں جا کر وہاں رہنے والوں کے لیے ایک خطرہ ہوں گے۔ اُنھوں نے تمھارے پر کاٹ کر رکھے ہیں تاکہ اُڈاری نہ لے سکو۔"

محمد مالک کو اچانک گنگو کا خیال آ گیا۔ اُس نے گنگو کو نہایت رازداری سے رکھنا ہے۔ اُسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ محمد مالک کو اچانک گنگو کے بارے میں بے چینی ہونے لگی۔ اُسے ماسٹر کی دل چسپ باتیں اچانک غیر دل چسپ لگنے لگیں۔ وہ آج کی محفل سے اُکتا گیا اور پھر اُسے لہنگا بیٹھا نظر آیا۔ اُس نے سب لوگوں کو اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

"لہنگے! کوئی خبر ہے؟" اُس نے ظاہر کیا کہ وہاں لہنگے اور اُس کے سوا کوئی وہاں موجود نہیں۔

"ہاں چودھری ہے تو سہی۔" لہنگے نے ایک طرح کی برتری سے کہا جو سب نے محسوس کی۔

"لو چودھری جی! مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اپنی بھینس کے لیے ابھی تک پٹھا دتھا ہی نہیں کیا۔" یہ کہہ کر ماسٹر سب پر نظر ڈال کر اُٹھ گیا۔ باقی سب لوگ کچھ شرمندہ سے، کچھ بے چین سے اور کچھ مطمئن سے اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف چل پڑے۔

"ہاں لہنگے؟" محمد مالک نے اُنھیں جاتے ہوئے دیکھتے پوچھا۔

لہنگا قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

"بھائیا! ابھی بات کچی سمجھو!" لہنگے نے آہستہ سے کہا۔

"کر بات۔" محمد مالک نے بے چین سی برہمی سے پوچھا۔

"دکھن والی پتی میں ایک ڈاکٹر ہے۔"

"ہاں ہے جو دسوئے سے آیا ہوا ہے۔"

"اُس کی ایک بیٹی ہے۔"

"ایک ہی بیٹی ہے۔" محمد مالک نے مسکراتے ہوئے لہنگے کے علم میں اضافہ کیا۔

"تم جانتے ہو بھائیا؟" لہنگا کچھ کھسیانہ تھا۔

"جانتا تو نہیں لیکن خبر ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔"

"بات چلاؤں؟"

"ہاں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

''وہ اُنھیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' لبنگے نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تم اُنھیں ٹوہ چکے ہو۔'' محمد مالک نے شرارتی سے لہجے میں کہا۔
''ہاں بھائیا۔ سچی کہوں گا۔''
''آؤ بوڑھ والے کھوہ پر چلیں۔'' محمد مالک نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلے دو دنوں سے ایک بوجھ تلے دبا ہوا جی رہا تھا جیسے اُسے درلٹ کے ساتھ گوٹا جا رہا ہو۔ اُسے یہاں سے چلے جانے کا دکھ تھا تو اُس لڑائی کی بھی سوچ تھی جو اُس نے علاقے کے زمین داروں کے ساتھ لڑنی تھی، عبدالرشید کی شادی کی بھی اُسے فکر تھی اور گنگو کی طرف سے خاموشی پریشان کیے ہوئے تھی۔ سردارا اپنی بہو اور بیٹے کو چھوڑ آیا تھا اور وہ روزانہ اشاروں سے گنگو کے متعلق خبر لینے کی کوشش کرتا۔ لبنگے کے ساتھ ملاقات نے اُسے ایک دم مکتی دلا دی۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوا کی طرح ہلکا محسوس کیا۔ وہ کسی نوجوان کی لچک بھری چال کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ لبنگا اُس کے پیچھے چلا آ رہا تھا اور محمد مالک اپنے خیالوں میں گم ایسے چلتا تھا جیسے دریا کے پانیوں پر بغیر سائے کے چلتا جا رہا ہو۔

بوڑھ والے کھوہ پر لبانے خندق نما گہری نالی کھود رہے تھے۔ میوا اپنا کام تقریباً ختم کر گئے تھے، صرف اندر گری ہوئی مٹی نکالنا تھی۔ اُسے دیکھ کر لبانے کام چھوڑ کر اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ محمد مالک جانتا تھا کہ اُنھوں نے اتنی گہری نالی کھودنے کی وجہ جاننے کی کوشش کرنی ہے۔

''اندر مٹی نہ پڑی رہے۔ دریا سے پانی اُس طرف لے کر جانا ہے۔ او لڑکو! دیکھو ہم ایک نہر کھود رہے ہیں۔ سرکار نے تو شش ماہی کھودی ہے لیکن یہ نہر سارا سال چلے گی۔ جب تک اِس میں پانی نہ آ جائے کسی کو بتانا نہیں۔'' اُس نے کھودنے والوں کو سوال پوچھنے سے پہلے ہی حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اُن شیر خوار بچوں کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے جو اپنی ماں کے بجائے کسی اور کا پستان دیکھ رہے ہوں۔

اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور پھیلے ہوئے کیکر کے درختوں پر رات کو بسیرا کرنے کے لیے آتی چڑیوں کی چہچہاہٹ کے شور میں اردگرد کی آوازیں ایک طرح سے ڈوب گئی تھیں۔ چڑیوں کے اِس مترنم شور میں کسی کوے کی بے سری سی کائیں کائیں ایک عجیب طرح کی ناگواری کو جنم دیتی۔ محمد مالک نوجوان لبانوں کو نظر انداز کر کے چڑیوں کے شور میں ایسا گم ہوا کہ

اُسے ایک گھڑ سوار کے بوڑھ کے نیچے آ کر کھڑے ہونے کا پتا ہی نہ چل سکا۔ جب چڑیاں شاخوں پر اپنے ٹھکانے بنا چکیں اور کوے اپنی شرارتیں ختم کر کے گھونسلوں میں جا چکے تو محمد مالک کو گھوڑے کے سموں کی رگڑ کا احساس ہوا۔ اُس نے کسی قدر حیرت اور قدرے خوف کے ساتھ بوڑھ کی طرف دیکھا تو اُسے وہاں ایک مانوس سے جسم کا مانوس سا زاویہ نظر آیا۔ لمحے بھر کے لیے اُسے ایک پریشانی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن پھر وہ فوراً اپنے حواس پر قابو پا گیا۔

''تم لوگ اب اپنے گھروں کو جاؤ۔ اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ہوشیار رہیں کہ کسی کو نہر کے بارے میں پتا نہ چلے۔'' محمد مالک دبی آواز میں ایک بے معنی سی بات کر کے گھڑ سوار کی طرف چلا گیا۔

''ست سری اکال، بھائیا!'' تھوڑی اکتاہٹ اور تھوڑی بے زاری کے ساتھ کہا گیا۔

''جیتے رہو اور ہمیشہ اُس کی حفاظت میں رہو۔'' محمد مالک نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''گھوڑی میں چھوڑنے لگا ہوں۔ کاٹھی کہیں چھپائی جا سکتی ہے؟'' گنگو نے پوچھا۔
محمد مالک جانتا تھا کہ گنگو نے گھوڑی چھوڑ دینی ہے۔ گھوڑی نے گاؤں کی جوہ میں پھرتے رہنا ہے اور گنگو نے جب سیٹی بجائی، بھاگتے ہوئے اُس کے پاس پہنچ جانا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا کہ گھوڑی نے کسی کے ہاتھ نہیں آنا۔ محمد مالک سر کھجاتے ہوئے تھوڑا پرے ہوا اور ایک لاتعلق سی آواز دی: ''لہنگا سنگھا او لہنگا سیوں!''

''جی بھائیا!'' اُس نے گاؤں کو جاتے ہوئے رک کر جواب دیا۔

''سردارے چوہڑے کو تو بھیجنا۔''

محمد مالک اُس کا جواب سنے بغیر واپس گنگو کے پاس آ گیا جس نے تنگ کھول دیا تھا اور زین کو پیٹھ پر سے اُتارنے والا تھا۔ محمد مالک مدد کے لیے آگے بڑھنے لگا تو گنگو نے اُسے روک دیا:

''بھائیا کنجریا چکی نہیں پٹیتیں۔ میں اُتار لوں گا۔'' محمد مالک نے خوش مزاجی سے قہقہہ لگایا۔ گنگو نے زین اُتار کر نیچے رکھی اور تارو بھی کھینچ لیا۔ اب گھوڑی پر صرف لگام تھی اور وہ بے چینی کے ساتھ دہانہ چبا رہی تھی کہ اُسے آزاد کر دیا جائے۔

''بھائیا! چھوڑ دوں اِسے؟''

"ہاں! اگر تمھیں ضرورت نہیں تو!"

گنگو نے لگام اُتاری تو گھوڑی نے آزادی کی ایک جھرجھری سی لی اور پھر ایک چھلانگ لگا کر تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے زمین کو سونگھا، ٹانگیں چوڑی کیں اور دم اُٹھا کر کافی عرصے سے روکا ہوا پیشاب کیا اور ایک اور زقند بھر کے، دم اور گردن اُٹھا کے گنگو کی طرف دیکھا۔ وہ گنگو کو سلام کر رہی تھی یا اُس سے غیر معینہ مدت کی غیر حاضری کی اجازت چاہ رہی تھی، گنگو نے ایک ڈھیلا اُٹھا کر اُسے مارنے کے لیے پھینکا تو وہ ڈھیلے کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی دریا کی سمت بھاگ گئی۔

"بوڑھ کے نیچے چلتے ہیں۔" گنگو نے زین اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، چلو! وہاں تھوڑا اندھیرا ہے۔"

"کیا خبر ہے؟" محمد مالک نے بوڑھ کے نیچے جاتے ہوئے پوچھا۔

"سرکار مجھے گرفتار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔" گنگو نے اعتماد کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ سرکار تمھاری وجہ سے جنگ ہار گئی۔" محمد مالک نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اچانک سرکار کو لگا کہ اگر سردار گنگا سنگھ کو گرفتار کرلیا جائے تو ہندوستان غلام رہ جائے گا۔" گنگو نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمھاری گرفتاری اور ملک کی تقسیم کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

"کوئی تعلق نہیں لیکن سرکار نے ایک طرح سے بنایا ہوا ہے۔ وہ تمام مجرموں کو گرفتار کر کے واپس اپنے دیس کو جانا چاہتی ہے۔ ڈی سی نے حکم دیا ہے کہ تمام اشتہاری ڈاکوؤں کو گرفتار کرلیا جائے۔ مجھے اِس کی وقت پر اطلاع مل گئی اور شمال میں بیاس کے اِس کنارے پر بیلوں میں چھپ گیا۔ سرکار کو وہاں کی بھی مخبری ہوگئی اور پولیس نے بیلوں میں گشت شروع کردی۔ میں اب کہاں جاتا؟ گشت پر حملہ کر دیتا؟ اس سے بڑی بے وقوفی بھلا کیا تھی! گرفتاری دے دیتا؟ پھانسی! اور جگہ بدل کر کہیں چھپ جاتا؟ بھائیا! تو تیرے پاس آ گیا۔ اب تو بتا؟" گنگو کی نظر ہر طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"میں تو جنگ کی تیاری کر رہا ہوں۔ جب بھی وقت آیا لڑتے لڑتے یہاں سے نکل جاؤں گا۔" محمد مالک نے مختصر جواب دیا۔

"میری بھی یہی خبر ہے۔" گنگو نے اور بھی مختصر جواب دیا۔

''میں نے تمھیں بھتنی میں ٹھہرایا ہے۔'' محمد مالک نے نیم سنجیدگی سے کہا۔
''سرہانہ اور منجی تو ملیں گے نا؟ زمین یا گھوڑی کی پیٹھ پر سوتے سوتے تنگ آ گیا تھا۔اب جی کرر ہا تھا کہ کسی دن منجی پر لیٹ کر اگلے دِن تک سویا رہوں۔'' گنگو نے نیند میں ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح بات کی اور ہنس پڑا۔
''منجی اور بستر ملے گا،تم اُس سے بھی اگلے دن تک سوئے رہنا۔'' اور دونوں کے قہقہے کو سردارے کے کھنکارے نے دبا دیا۔
''سردار جی! تم چلو اور جا کر آرام کرو۔'' محمد مالک نے گنگو سے کہا اور پھر سردارے سے مخاطب ہوا،'' زین اُٹھاؤ اور آ گے چلو۔''
گنگو اور سردارا آگے پیچھے بھتنی کی طرف چل پڑے۔

سردارا ہر صبح محمد مالک کو گنگو کے متعلق اطلاع دیتا۔

سردارے کا دڑبہ مرغیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر رات ایک مرغی کا جھٹکا کر کے گنگو کے لیے پکائی جاتی اور اُسے ایک بوتل بھی دی جاتی جس میں سے وہ اُٹھتے بیٹھتے گھونٹ لیتا رہتا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند پڑا سوتا یا سوتے میں جاگتا اور تمام رات جاگتا یا جاگتے میں سوتا۔ وہ اکثر رات کے تیسرے پہر بھٹھی سے نکل جاتا اور ایک لمبی سیٹی بجاتا اور کہیں سے گھوڑی ایک آسیب کی طرح سامنے آ جاتی اور گنگو کے ہاتھ کو چاٹنا شروع کر دیتی۔ گنگو بھی بے خیالی میں اُس کی گردن کو سہلاتے ہوئے پیار کے ساتھ کچھ بُڑبڑاتا رہتا، گھوڑی آنکھیں بند کیے مست سی کھڑی رہتی۔ پھر اچانک گنگو جاگ جاتا اور گھوڑی کی پیٹھ پر ایک تھپڑ مارتا اور پلک جھپکتے ہی گھوڑی اندھیرے میں کہیں غائب ہو جاتی۔ محمد مالک کی ہدایت کے مطابق سردارا سائے کی طرح گنگو کے پیچھے ہوتا۔ سردارا اکثر سوچتا کہ گنگو جیسے مشہور آدمی کو اُس جیسے غریب اور گمنام آدمی کے گھر کیوں ٹھہرایا ہے جب کہ دیوان خانہ کہیں محفوظ جگہ تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چودھری نے اُسے قربانی کا بکرا بنا دیا ہو۔ ساتھ ہی اُسے دوسرا خیال آیا کہ چودھری ایسا ہرگز نہیں کرے گا؛ شاید گنگا سنگھ یہاں زیادہ محفوظ ہو! روز کی ایک مرغی کا مطلب ہے کہ چند دنوں کے بعد مرغیاں ختم ہو جانے کے بعد صرف چوزے رہ جائیں گے۔ چودھری نے اُس کے خرچے کے عوض دو من گندم اور دو من چھونا دینے کا وعدہ تو کیا ہے لیکن جب مرغیاں ختم ہو گئیں تو کیا وہ ہمسایوں کی چوری کرنا شروع کر دے؟ اُس کا پڑوسی تو منگو ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اُس کے گھر کون ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا وہ منگو سے مرغیاں مانگنا شروع کر دے؟ اگر اُس نے منگو سے مرغی مانگنا شروع کی تو اُس کی بیوی نے لازماً پوچھنا ہے کہ روز کی مرغی کس کے لیے کی جا رہی ہے؟ وہ کیا جواب دے گا؟ اگر اُس نے گنگو کا بتایا اور گنگو نے سن لیا تو وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ لیکن اُس کے پاس تو ہتھیار نہیں، نہتے گنگو سے وہ طاقت ور ہے۔ لیکن وہ ایک نامی گرامی ڈاکو ہے، جس طرح اُس کی ایک سیٹی پر گھوڑی جن کی طرح

حاضر ہو جاتی ہے اُسی طرح دو سیٹیوں پر شاید ڈاکوؤں کی فوج آ جائے جن کا مقابلہ کرنا اُس کے بس میں نہیں۔ کل وہ مرغیوں کے بارے میں مشورہ کرنے چودھری کے پاس جائے گا، ویسے بھی اُس نے چودھری سے ملنا تو ہوتا ہی ہے۔ اُسے گنگو کے مزاج اور اطوار پر حیرت ہوتی، وہ جو ایک مشہور ڈاکو تھا، جس سے دنیا ڈرتی تھی اور سرکار جس کا مقابلہ کرنے سے کتراتی تھی دراصل ایک معصوم، بے ضرر اور ڈرپوک سا آدمی تھا۔ وہ سوچتا کہ اگر وہ ڈاکو ہوتا تو گنگو جیسے دس ڈاکو اُس کے کارندے ہوتے۔ پھر اُس شوشک جیسے آدمی میں کیا بات تھی کہ اُس کے بارے میں ڈھولے بن گئے تھے، اور اچانک اُس کے جسم میں خوف کی جھرجھری دوڑ گئی۔ اُسے اپنے اور گنگو کے درمیان میں فرق محسوس ہو گیا۔ وہ آنکھ نہیں جھپکتا تھا اور بغیر آنکھ جھپکے جب اُس کی طرف دیکھتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ بریتے پر دھوپ میں لیٹے ہوئے سنسار نے اُسے برہمی سے دیکھا ہے۔ اُس کا دیکھنا سانس لیتے انسانوں کا نہیں تھا، اُس کی نظر میں اتنی شدت تھی کہ آنکھ ملتے ہی وہ کانپ جاتا تھا اور شاید اِسی لیے گنگو اپنی نظر نیچی رکھتا تھا۔

سردارا اپنے گھر میں گنگو کی موجودگی کا عادی ہو گیا تھا، اُسے وہ بھولا، ہلکے ہلکے نشے میں رہنے والا بے ضرر آدمی، جس کی آواز دھیمی، میٹھی اور ایک گونج لیے تھی، پسند آنے لگا تھا۔ گنگو اُس کے ساتھ کھیتی باڑی کی باتیں کرتا، مرغی پکانے میں مدد کرتا، کبھی خود پکاتا اور اُس کو کبھی شراب نہیں پینے دیتا تھا؛ مسکراتے ہوئے یہی کہتا کہ گھر میں ایک آدمی مکمل ہوش اور دوسرا نشے میں ہونا چاہیے۔ وہ ہنستا نہیں تھا، صرف ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ سے سردارے کو دیکھتا تھا؛ شاید وہ ہنسنا بھول گیا تھا۔

''سردار یا! میں کئی کئی دن سوتا نہیں، اِس لیے نہیں کہ میں سونا نہیں چاہتا، سونا چاہتا ہوں، نیند نہیں آتی۔ مجھے سرکار تو نہیں مار سکے گی ممکن ہے جگراتا ایک دن مار دے۔'' ایک رات گنگو نے پانی ملائے بغیر آدھے گلاس کو ڈیکتے ہوئے کہا۔ سردارا، جو پوری نیند سونے اور محنت کرنے والا آدمی تھا، گنگو کی بات سے کانپ اُٹھا۔ وہ بغیر سوئے رات گزارنے کا عادی ہی نہیں تھا۔ اُس کے نزدیک رات سونے اور اگر موقع ملے تو ہم بستری کے لیے تھی جب کہ گنگو کو نیند آتی ہی نہیں تھی۔ کیا وہ انسان تھا؟ یا بریتے پر دھوپ میں لیٹا ہوا سنسار جو سونے کی اداکاری کرتا تھا تاکہ شکار پکڑ سکے؟

"سردار جی! تم رات کدھر جاتے ہو؟" ایک شام سردارے نے پوچھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گنگو سچ بولتا ہے کہ نہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گنگو کے لیے اپنے بارے میں سچ بتانا ضروری نہیں تھا، وہ ایک مخبر بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ صاحبِ حیثیت آدمی مصلحت کے بغیر غلط بات نہیں کرتا۔

"میں نے اپنی گھوڑی کھلی چھوڑی ہوئی ہے۔ گھوڑی سیٹی کے بلاوے پر میرے پاس آتی ہے، مجھے پتا ہونا چاہیے کہ گھوڑی موجود ہے کہ نہیں سو میں جا کے سیٹی بجا کے اُسے اپنے پاس بلاتا ہوں۔ ویسے تم مجھے دیکھ رہے ہوتے ہو؟" گنگو کا لہجہ نرم، عام بول چال والا تھا لیکن آواز سردیوں کی رات میں جمے ہوئے پانی کی طرح بے تاثر تھی۔ سردارا گنگو سے ایک دم خوف زدہ ہوگیا۔ اُسے اِس کڑکی سے نکلنے کا راستہ سچی بات کرنے میں نظر آیا۔

"چودھری کا حکم ہے کہ تمھیں ہر وقت اپنی نظر میں رکھوں، میں اصل میں تمھاری چوکیداری کرتا ہوں۔" گنگو نے ایک قہقہہ لگایا،

"پاہیا مالک تو مجھے ہمیشہ بچہ سمجھتا ہے۔" گنگو نے پیار سے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں روز صبح جا کر چودھری سے ملتا بھی ہوں۔" سردارا اب خوف زدہ ہوگیا تھا اور اُسے اچانک اُس بے ضرر، معصوم اور ڈرپوک سے آدمی سے خوف محسوس ہونے لگا، اُس پر اُس کی طاقت آشکار ہوئی۔

"صبح بھائیا کیا پوچھتا ہے؟" گنگو نے اپنی دل چسپی چھپائی نہیں۔

"یہی کہ تمھاری رات کیسی گزری، تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی اور یہ بھی کہ میں کسی کو پتا چلے بغیر تمھاری رکھوالی کرتا رہوں۔ یہ روز کا معمول ہے۔"

گنگو کی بے جھپکتی آنکھوں میں ایک دم نمی نے آ کر اُنھیں جھپکا دیا اور سردارے نے بھی یہ تبدیلی محسوس کی۔

"صبح جب جاؤ تو میرا صاحب سلام کہنا۔" گنگو کی آواز میں کپکپی تھی۔

صبح جب سردارا دیوان خانے گیا تو اپنی گشت کے ہمراہ بڑا تھانے دار آیا ہوا تھا۔ اُن کے گھوڑے حویلی میں بندھے ہوئے تھے اور اُنھیں چنے ڈالے جا رہے تھے جب کہ پولیس والوں کے لیے گھر سے ناشتہ لایا جا رہا تھا۔ محمد مالک اور بڑا تھانے دار ایک طرف بیٹھے سنجیدگی سے بات

کر رہے تھے اور باقی سپاہی دبے دبے لہجے میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے ہلکے ہلکے قہقہے بھی لگا رہے تھے۔ محمد مالک نے سردارے کو دیکھ کر اُسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور تھانے دار کے ساتھ مشغول ہو گیا۔

ناشتہ اندر کمرے میں لگا دیا گیا جس پر پولیس والے ٹوٹ پڑے۔ محمد مالک تھڑے پر ہی رہا اور اُس نے اشارے سے سردارے کو پاس بلایا اور مسکرا کر بات کرتے ہوئے کہا،

"گنگو کا پتا کرنے آئے تھے کہ اُس کے متعلق میں نے یا گاؤں کے کسی آدمی نے کچھ سنا تو نہیں۔ اُسے شام کو بوڑھ والے کھوہ پر لے کے آنا۔"

سردارا کانپتی ٹانگوں اور چکراتے سر کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ پولیس گنگو کے کھرے میں ماڑی تک کیسے پہنچ گئی؟ کیا گاؤں میں کوئی مخبر تھا یا ویسے ہی پولیس چودھری کو آگاہ کرنے آئی تھی کہ وہ ہوشیار رہے۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ چودھری اور گنگو کے تعلق کے متعلق پولیس جانتی تھی لیکن اِس سلسلے میں اُنھوں نے کبھی کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔ وہ سیدھا گھر نہیں گیا۔ یہ گنگو کے سوتے میں جاگنے کا وقت تھا اور وہ اِس وقت گنگو کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ چودھری نے بھی شام کو ملنے کا کہا تھا۔ وہ پریشانی کی حالت میں گاؤں سے نکل کر پیر غازی کی طرف چلا گیا۔ پیر غازی دریا کے کنارے ایک مزار تھا جہاں لوگ منتیں ماننے آتے تھے۔ پیر غازی مسلمان تھے لیکن اُن کے ماننے والوں کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں تھا۔ بیاس جب طغیانی میں ہوتا تو پیر غازی کے اردگرد کا علاقہ گرچہ دریا سے نیچے تھا پھر بھی پیر غازی کی کرامات کی وجہ سے وہاں پانی نہیں آتا تھا۔ سردارے نے بھی وہاں جا کر گنگو کی سلامتی کے لیے دعا مانگنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گنگو اپنے جرائم کے باوجود اُسے ایک معصوم بچے کی طرح نظر آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ گنگو کی معصومیت اُسی طرح برقرار رہے۔ جب وہ واپس آیا تو سائے سمٹ چکے تھے اور گنگو، کچھ برہم سا، اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ سردارے کو اُس کا ایسے روٹھ کر بیٹھنا پسند آیا۔ اس طرح روٹھا ہوا گنگو اُسے اپنا اپنا سا لگا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اُسے کون سا گنگو پسند ہے؟ وہ گنگو جو علاقے میں ایک سورما جانا جاتا ہے یا وہ خاموش، ہر آہٹ پر چونکنے والا سیدھا سادا دیہاتی جو اُسے تمباکو کی نالائی کرنے کے طریقے بتاتا ہے؟

سردارا، گنگو کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر گنگو پریشان ہو گیا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" گنگو نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"پیر غازی سے؟" سردارے نے قدرے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"خیریت؟"

"ہاں! تمھیں چودھری نے شام کو بلایا ہے۔" سردارے نے پولیس کے متعلق بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ گنگو کے اِس عارضی سکون میں ارتعاش پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یک دم گنگو کے چہرے پر پھیلی پریشانی چھٹ گئی۔ سردارے کو محسوس ہوا کہ گنگو مکتی پا گیا ہے۔ اُسے حیرت ہوئی کہ مصیبتوں میں گھرا ہوا یہ آدمی اچانک اتنا ہلکا پھلکا کیوں ہو گیا ہے؟ کیا وہ یہاں بخشی میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا اور چودھری کا بلانا اُس کے لیے ایک تبدیلی ہونا تھی؟ اب گنگو اکیلا بیٹھ گیا، وہ گنگو کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات میں ایک طرح کی بے گانگی تھی جس نے سردارے کو گنگو سے دور ہی رکھا؛ وہ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

"بھائیا کہاں ملنا چاہتا ہے؟" گنگو نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"بوڑھ والے کھوہ پر۔"

"ٹھیک ہے۔" گنگو نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

اندھیرا ہونے کے بعد گنگو سردارے کے پیچھے، جو زین اُٹھائے ہوئے تھا، بوڑھ والے کھوہ کی طرف چل پڑا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو محمد مالک انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے گنگو کی طرف بڑھا اور پھر سردارے کے سر پر زین دیکھ کر رک گیا؛ اُس نے سردارے کو معنی خیز نظر کے ساتھ دیکھا تو اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ کیوں لائے ہو؟" محمد مالک نے گنگو کے صاحب سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔

"بھائیا! تم نے بلایا تو کوئی مسئلہ ہی ہوگا ورنہ......"

"سردارے! تم کاٹھی اُدھر بوڑھ کے نیچے رکھو اور وہیں بیٹھو۔ میں تمھیں بلا لوں گا۔"

محمد مالک، سردارے کو بوڑھ کی طرف جاتے اور پھر ذرا ہٹ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"آج بڑا تھانے دار آیا تھا۔" محمد مالک نے بغیر تمہید کے بات شروع کی۔ اُس کے

خیال میں سردارا گنگو کو پولیس کے آنے کا بتا چکا تھا۔

''کیوں؟'' گنگو کی آواز بیاس کے اُس گہرے پانی کی طرح ہو گئی تھی جو بغیر شور کیے بہے چلا جاتا ہے۔ محمد مالک پر لمحے بھر کے لیے خوف کا ایک سایہ رک کر گزر گیا۔ اُس نے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے سردارے کو دیکھا۔

''تمھاری گھوڑی ارد گرد فصلوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ کسی نے اُسے پکڑ کر پھاٹک میں بھجوانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کسی نے یہ گھوڑی کہیں دیکھی ہوئی تھی اور اُسے شک تھا کہ یہ تمھاری ہے۔ اُڑتے اُڑتے بات اپنی کسی شکل میں پولیس تک پہنچ گئی۔ وہ مجھے بھی اطلاع کرنے آئے تھے اور ساتھ ساتھ کے دیہات میں بھی گئے۔ وہ صرف یہ بتانے آئے تھے کہ میں محتاط رہوں اور چھوٹے سے چھوٹا شک بھی اُن تک پہنچا دیا جائے۔''

''تمھارا چلے جانا ضروری نہیں۔ اُنھیں یہاں سے کوئی خبر نہیں جائے گی۔'' محمد مالک کو تھانے دار کی آمد کا گنگو کو بتانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ گنگو کے ساتھ اُس کا تعلق احترام اور اعتماد پر تعمیر ہوا تھا اور گنگو کا اِس طرح جانا اُسے اِس تعلق کا اختتام لگا۔ ''تم نہیں جاؤ گے۔'' اُس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ گنگو نے اپنے کھچاؤ کے باوجود مسکراتے ہوئے محمد مالک کی طرف دیکھا۔

''حکم ہے!''

''ہاں۔ پہلے درخواست کی تھی اور اب حکم ہے۔'' محمد مالک کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''بھائیا! اب ایک درخواست میری بھی مان لو۔'' گنگو کی آواز میں سختی آ گئی تھی۔

''کہو!'' محمد مالک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''صرف آج کی رات رہوں گا۔ کل اِس وقت چلا جاؤں گا۔ تم مت آنا۔ مجھے پتا ہے کہ تم رات کو گھر سے نہیں نکلتے۔''

محمد مالک سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے گنگو کا کھچاؤ ختم ہونے پر قدرے تسلی ہوئی لیکن وہ کچھ پریشان سا بھی تھا۔ اُسے پولیس کے آنے پر کچھ شک بھی تھا اور یہ اعتماد بھی کہ گاؤں سے مخبری نہیں ہو سکتی۔ اُسے گنگو کو اِس طرح بھیجنے میں ایک سبکی کا احساس ہوا۔

''نہیں! میں آؤں گا۔'' اُس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

گنگو نے سردارے کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"بھائیا! تھوڑا ہٹ کر کھڑے ہوتے ہیں۔" گنگو سرگوشی کرتے ہوئے بوڑھ کے نیچے سے تھوڑا پرے چلا گیا۔ "مجھے اب کچھ دن اور بیلوں سے پرے رہنا ہے۔ سرکار نے نکلنے کے تمام راستے سنبھال لیے ہوں گے۔ وہ وہاں مستقل راہ بندی تو کر نہیں سکتی، چند دن بیٹھ کر چلے جائیں گے۔" گنگو بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ محمد مالک نے گنگو کے مستقبل کے ارادے کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے بارے میں جتنی کم خبر ہو اُتنا ہی اچھا ہے۔

محمد مالک خاموش رہا۔

"بھائیا! کچھ دن میں بھیس بدل کر پھروں گا۔ سب سے پہلے گھوڑی بدلنا ہو گی، بلکہ کل یہاں سے جانے کے فوراً بعد بندوبست کرنا ہو گا۔"

"اِس کا کیا کرو گے۔" محمد مالک نے بغیر کسی مقصد کے پوچھ لیا۔

"اور کیا کرنا ہو گا؟ یہ میری پہچان بن گئی ہے۔ کسی راستے پر گولی مار کر چھوڑ دوں گا تاکہ سرکار خوف زدہ ہو جائے۔ یہ گھوڑی پانچ سال سے مجھے ڈھو رہی ہے اور میرے بچوں کی طرح ہے۔ وہ یقیناً ڈر جائیں گے۔"

محمد مالک کانپ اُٹھا۔

"جیسے ہی میں نے اپنے ساتھی دوبارہ اکٹھے کر لیے تمھیں رقلیں آنا شروع ہو جائیں گی۔"

محمد مالک نے فوری جواب نہیں دیا۔

"گنگا سنگھ! میں نے وساکھی والے دن تیرے بھتیجے کی شادی کر دینی ہے اور تم آؤ گے۔ میں نے نکاح تمھارے آنے پر کرنا ہے۔" محمد مالک کی آواز میں اتنا صدق تھا کہ گنگو نے جھک کر اُس کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ محمد مالک تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"بھائیا! اتنا بوجھ نہ ڈال۔ قسم پیدا کرنے والے کی اگر زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔ تم اپنی رسمیں کرنا۔"

محمد مالک نے خاموش رہنا بہتر سمجھا؛ وہ گنگو کی مشکلیں سمجھتا تھا اور اُسے کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔" محمد مالک نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

''بھائیا! ایک بات مانو گے؟'' گنگو کے لہجے میں جھجک تھی۔

محمد مالک نے جواب نہیں دیا۔

''میں اب چلنا چاہوں گا۔ زین میرے ساتھ ہے! اسے واپس لے کے جانا بدشگونی ہو گی۔ یہ میرا اپنا گھر ہے، اگر پھر ضرورت پڑی تو آؤں گا۔''

محمد مالک خاموش رہا۔

گنگو نے دو انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کے سیٹی بجائی اور مختصر وقفے کے بعد ایک اور سیٹی بجائی۔ دور سے گھوڑی کے بھاگنے کی آواز نزدیک آنے لگی اور پھر بالکل نزدیک آ گئی۔ تھوڑے فاصلے پر گھوڑی رُک گئی، اُس نے دم اور گردن اُٹھائی ہوئی تھی اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ گھوڑی نے دونوں کو دیکھا اور ایک لمبی سانس لے کر اُن کی طرف چل پڑی۔ وہ چوکنا اور خبردار تھی اور اُن سے چند قدم کے فاصلے پر آ کے رک گئی۔ اُس کا پورا جسم لرز رہا تھا، جیسے وہ کوئی خطرہ سونگھ رہی ہو۔ گنگو نے ہاتھ بڑھایا:

''آؤ میری بنو!'' گھوڑی محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کے پاس رُک گئی۔ گنگو نے اُس کے ماتھے اور ایال کو سہلایا۔ گھوڑی نے اُس کے ہاتھ کو سونگھا اور پیار سے بھرا ہوا ایک پھڑ اپھڑ امارا۔

''سردارے! زین لاؤ'' گنگو نے اتنی اونچی آواز میں کہا کہ بمشکل سردارے تک پہنچ سکی۔

سردارا جھجکتے ہوئے زین اُٹھا کر پاس آیا تو گنگو نے لگام اُٹھالی۔ گھوڑی نے کان پیچھے کر کے دہانہ آگے کو کیا تو گنگو نے لگام چڑھا کر گردن پر تھپکی دی۔ سردارے نے آگے بڑھ کے تاروڑ الا اور زین اوپر رکھ کے تنگ کسنے لگا تو گنگو نے روک دیا۔

''تنگ میں خود کسوں گا۔'' اور پھر اُس نے تنگ کو کسنا شروع کر دیا اور مطمئن ہو کے محمد مالک کی طرف دیکھا۔ محمد مالک نے گھوڑی کے قریب ہوتے ہوئے گنگو کو چھاتی کے ساتھ لگایا۔

''پائیا! سردارے نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔'' اور وہ گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ ''تم اِس کا خیال رکھنا۔''

لہنگا سنگھ جب محمد مالک سے ملنے آیا تو وہ ایک طرح سے انتظار میں تھا۔ اُسے بات پکی کرنے کی جلدی تو تھی لیکن وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر رشتہ ہو جانا اُس کے لیے ترقی کے نئے دروازے کھول سکتا تھا۔ ڈاکٹر امرتسر کے سرکاری ہسپتال میں کام کرتا تھا اور لائل پور اور چک جھمرہ میں اُس کی جائیداد اور زرعی مالکی تھی۔ اُس کی تین شادیاں تھیں۔ پہلی اُس نے دسوئے میں اپنے گھر میں کی تھی لیکن غربت اتنی تھی کہ وہ اُس بیوی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا جہاں اُسے ماں کے ننھیال کا کچھ رقبہ وراثت میں ملا۔ اُس وقت وہ بٹالہ میں زیرِ تعلیم تھا جہاں سے پڑھائی مکمل کر کے لاہور چلا گیا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے شروع ہونے کا پہلا سال تھا اور اُسے داخلہ مل گیا، چناں چہ وہ کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے پہلے ڈاکٹروں میں شامل تھا۔ دوسری شادی اُس نے ماڑی بوچیاں میں کی اور تیسری امرتسر میں اپنی ذات سے باہر۔ ڈاکٹر جب ماڑی بوچیاں آتا، دیوان خانے میں محمد مالک کے ساتھ ملاقات ضرور کرتا۔

''ڈاکدار صاب! تم مجھے پیغام بھیجتے، میں تمھیں آ کر گھر مل لیتا۔'' محمد مالک ہمیشہ تکلف کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے کبھی ملنے نہیں جانا تھا، اُسے اپنی منافقت پسند بھی آتی۔ ڈاکٹر چھوٹے قد کا ایک بھاری آدمی تھا۔ موٹاپے کی وجہ سے اُس کے بازو اور ٹانگیں دھڑ کی نسبت کافی چھوٹی لگتیں۔ محمد مالک اُسے دیکھ کر ہمیشہ محسوس کرتا کہ ڈاکٹر ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ پیدا ہو گیا۔

''تم گاؤں کے سردار ہو، پہلے ہمیشہ میں نے ہی آنا ہے۔ تمھاری مہربانی کہ تم ایسے سوچتے ہو۔'' ڈاکٹر ہمیشہ جواب دیتا۔ محمد مالک ڈاکٹر کے جواب میں سے منافقت ڈھونڈنے کی کوشش کرتا لیکن اُسے اپنا سردار قبول کیے جانا پسند آتا۔

''چودھری جی!'' لہنگے نے بات شروع کی۔ مالک عدم دل چسپی کا تاثر دیتے ہوئے اُس کی بات پوری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''میں ڈاکدار سے ملا تھا۔'' لہنگے نے محمد مالک کی طرف دیکھا۔ محمد مالک نے ایک دم چونک کر اُس پر نظر ڈالی۔ اُس نے

لہنگے کو یہ تاثر دیا کہ اُس نے اُس کی بات ابھی سنی تھی۔ لہنگے نے محمد مالک کے رویے کی طرف توجہ ہی نہیں دی، جس سے اُسے شرمندگی بھی ہوئی۔ ''میں نے ڈاکدار سے بات کی۔ اُس نے بڑی تسلی کے ساتھ میری بات سنی، بیچ میں نا مجھے ٹوکا اور نا ہی سوال پوچھے۔ سوال کیا پوچھتا؟ نا تم اُس کے لیے غیر تھے اور نا وہ تمھارے لیے۔ جب میں بات ختم کر چکا تھا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ میں اُس کے دیکھنے سے تھوڑا پریشان ہو گیا۔ مجھے اُس کی نظر میں نا تو کوئی شک نظر آیا اور نا ہی کوئی الزام، مجھے لگا کہ اُس کی نظر میرے سچے ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں تھا ہی سچا! میں نے اُسی طرح اُسے واپس دیکھا جیسے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا، مجھے بھی جواباً ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ سے اُس کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ 'لہنگے!' اُس نے کہا، 'چودھری محمد مالک میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس کے ساتھ مجھے کوئی تکلف نہیں۔ تم رشتہ لے کر آئے، میں اِس کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے پتا کر کے بتاؤ کہ میں کس دن دیوان خانے آؤں۔' تو بھائیا! اب بتاؤ کہ میں واپس سُنیہا کیا دوں۔''

محمد مالک خاموشی سے اُس کی بات سن رہا تھا۔ وہ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ اُس نے ایک نظر لہنگے کو دیکھا اور لمبا کش لے کر منہ سے دھوئیں کی لکیر چھوڑی اور پھر فضا میں دھواں تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ اُس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اتنی جلدی ہاں نہیں کرے گا۔

''میں عبدالرشید کی ماں سے مشورہ کر لوں۔'' محمد مالک نے روایت کا سہارا لیا۔

''ڈاکدار نے تو اپنی گھر والی سے مشورہ نہیں کیا تھا؟'' لہنگے نے برہمی سے کہا۔

''اُس نے دینی ہے۔ لینے والا سوچتا ہے۔ تم بکری خریدتے ہوئے سوچتے ہو یا بیچتے ہوئے؟''

لہنگے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

''بھائیا! کہتا تو تو ٹھیک ہے۔''

''تو اُسے کسی دن لے آ، شگن کر لیں گے اور پھر ہم لوگ جوابی چکر لگا آئیں گے۔''

محمد مالک نے اپنی بے تابی چھپاتے ہوئے کہا۔ اُسے خوشی تھی کہ ڈاکٹر بندے خاں، جس کے پاس سرکار کے افسر دوا لینے آتے تھے، اُس کا سمدھی بن رہا تھا۔ وہ فخر سے بٹالہ میں سرکاری اہل کاروں کو اپنے رشتے کے متعلق بتایا کرے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ سب کتنے مرعوب ہوں گے اور اِس رشتے کی وجہ سے اُس کا وقار اور بھی بڑھ جائے گا۔ اُس نے تیزی سے لہنگے کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ اُس

کے خیالات کے سلسلے کی دھول پر چلتے ہوئے اُس تک تو نہیں پہنچ رہا؟ اُس نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا۔

''میں ایک آدھ دن میں بات کر کے تمھیں بتادوں گا۔''

''زیادہ دن نہ لگیں۔'' محمد مالک اپنی بے تابی پر قابو نہ پاسکا۔

''بھائیا! یہ تو اب اُس کی مرضی ہے۔ میں اُسے پیغام دے دوں گا۔''

پورے دس دن بعد ڈاکٹر بندے خاں دیوان خانے میں آیا، وہ کسی کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ محمد مالک اُسے اکیلے آتے ہوئے دیکھ کر تھوڑا پریشان ضرور ہوا کیوں کہ اُس نے گاؤں کے تمام معتبر لوگ بلائے ہوئے تھے۔ شاید ڈاکٹر بندے خاں اِس لیے اکیلا آیا تھا کہ سب لوگ اُس کے مہمان تھے۔ ڈاکٹر بندے خاں نے محمد مالک کے ساتھ ہاتھ ملایا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے کسی اور آدمی کی طرف توجہ نہ دی۔ محمد مالک کو یہ عجیب اور کسی حد تک بدتمیزی بھی لگی؛ اُسے اپنے سے کم حیثیت گھر میں رشتے داری کرنے کی روایت درست لگی۔ وہ عجب مخمصے میں تھا، وہ ڈاکٹر کے ساتھ رشتہ داری تو کرنا چاہتا تھا لیکن ایسے نہیں کہ ڈاکٹر اُسے بے عزت کر کے رشتہ دے۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا مالک تھا اور علاقے میں اُس کی دھوم تھی۔ تحصیل میں کوئی اہم کام اُس کی مشاورت کے بغیر نہیں کیا جاتا تھا اور یہاں ڈاکٹر اکیلا ہی اُس کے ساتھ رشتے داری کرنے چلا آیا تھا! اُس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اپنے ساتھ گاؤں کے کچھ لوگ لے کر آئے گا، نائی مٹھائی، کھوپوں اور بتاشوں کے تھال، گڑ اور اناج کی بوریاں اور ایک عدد بھینس، گائے یا گھوڑی تھامے ہوئے ہوں گے۔ اِس سب کے بجائے ڈاکٹر اپنی پھتوئی میں ہاتھ ڈالے کھدو کی طرح رڑتا ہوا آ گیا تھا۔

''ڈاکدار جی خالی ہاتھ ہی؟'' وہاں بیٹھے ایک شریک نے مسکراتے ہوئے حقے کا کش لے کر زیرِ لب کہا۔ اُس کی آواز اِتنی آہستہ بھی نہیں تھی کہ کوئی نہ سنتا۔ ایک دم مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا جسے محمد مالک نے برہمی اور ناپسندیدگی سے اور ڈاکٹر نے دل چسپی سے دیکھا۔

ڈاکٹر نے اپنے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک پُراسرار مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اُس نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تھیلی نکالی کر اُس شریک کو دی جس نے فقرہ کسا تھا۔

''یہ چودھری کو دو، اُس کے لیے ہے۔'' وہاں ایک طنزیہ سی خاموشی پھیل گئی جو سب کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ تمام نظریں تھیلی پر تھیں جو شریک کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں بے جان سی

لٹک رہی تھی۔ اُس نے تھیلی کو نظر نا آنے والے طریقے سے ہلا کر اُس کے اندر کی شے اور وزن کو جاننے کی کوشش کی، پھر اپنی سبکی کو برتری میں بدلنے کے لیے مسکرایا اور محمد مالک کی طرف تھیلی بڑھائی جس نے اِس چھوٹے سے ناٹک کو ختم کرنے کے لیے ایک طرف سے ڈوری کھینچ کر تھیلی کو کھولا، اندر لشکتا ہوا سونے کے ہار کا سانپ کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا تھا۔ محمد مالک نے بہت احتیاط کے ساتھ تھیلی میں ہاتھ ڈالا کہ مبادا سانپ ڈس جائے اور کنڈلی کھولتے ہوئے سانپ کو باہر نکالا۔ سانپ محمد مالک کی اُنگلیوں میں سے لٹکتا تھا اور سب کو پھنکارتے ہوئے دیکھتا تھا۔ محمد مالک نے اپنی اُنگلیوں کو دیکھنے کے بعد سب کی طرف دیکھا اور ہار اپنے پاس بیٹھے ہوئے مہمان کی طرف بڑھا دیا جس نے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد آگے بڑھا دیا۔ ہار چکر کاٹ کر محمد مالک کے پاس پہنچ گیا، اُس نے کسی کارندے کو دیکھنے کے لیے اردگرد نظر دوڑائی تاکہ کھانے پینے کے لیے کچھ منگوالے تو ڈاکٹر بندے خاں نے اُس کو ٹوک دیا:

''چودھری جی! میرے لیے کچھ نہیں منگوائیں۔ کون سا دور سے آیا ہوں۔'' ڈاکٹر نے لاپرواہی لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ محمد مالک نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

''ڈاکدار جی! خود نقل پانی نہیں کرنا تو باقیوں کا پیٹ تو نہ کاٹیں۔'' محمد مالک کا یہ فقرہ اُن کے نزدیک ڈاکٹر کی شکست تھا۔ وہ سب مسکراتے ہوئے کبھی ڈاکٹر، کبھی ایک دوسرے کی طرف اور کبھی محمد مالک کی طرف دیکھتے۔ تین آدمی تھالوں میں دودھ کے گلاس، شکر پارے اور نمک پارے اُٹھائے ہوئے آئے اور سب کو پیش کیے۔ پہلے والے شریک نے گلاس اُٹھاتے ہوئے چوٹ کی:

ڈاکدار جی! چودھری کی گھر والی کے لیے بھی ایک ہار چاہیے۔ مناسب نہیں کہ......'' ڈاکٹر بندے خاں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پہلے جیسی ایک اور تھیلی نکال لی۔ وہاں سب لوگوں نے خاموش نظروں سے کھسر پھسر کی اور ڈاکٹر کی حیثیت کا اندازہ کرنے لگے۔

''کون سی بڑی ٹابری ہے۔ باقی صرف عبدالرشید ہی بچتا ہے۔ اُس کے لیے بھی کچھ لے آتے، ویسے چودھری اور اُس کی گھر والی کے لیے کچھ نہ بھی آتا تو ضروری نہیں تھا، عبدالرشید کے لیے لانا لازمی تھا۔ اب شاید یہی دستور بن گیا ہو۔'' اُسی شریک نے پھر چوٹ کی۔ ڈاکٹر اُسی

آسن میں خاموش بیٹھا اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے بھاری جسم میں مختصر سی حرکت ہوئی اور اُس کا ہاتھ واسکٹ کی جیب میں غوطہ لگا گیا اور ایک ڈبیہ لے کر باہر نکلا۔ اُس نے وہ ڈبیہ آگے بڑھا دی اور بند ڈبیہ ایک چکر کاٹ کر محمد مالک کے پاس پہنچی تو اُس نے ڈھکنا کھولا۔ اندر ایک بھاری انگوٹھی تھی جس کے اوپر ایک نگ لشک رہا تھا۔ محمد مالک نے ڈبیہ کو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ سب لوگ توصیفی نظر کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن وہ سر جھکائے اپنے ہی کسی خیال میں گم تھا۔ پھر وہ آہستہ سے اُٹھا اور پیروں کے وزن کو سنبھالنے کا انتظار کیا اور جب پاؤں مضبوطی کے ساتھ زمین پر جم گئے تو اُس نے ایک قدم اُٹھایا اور پھر کچھ یاد آنے پر رک گیا۔

''چودھری کسی دن میرے گھر آؤ۔ لنگے کے ہاتھ مجھے پیغام بھیج دینا اور ہاں اکیلے مت آنا، جتنے چاہو اپنے ساتھ آدمی لے آنا، کوئی پابندی نہیں۔''

''ڈاکدار جی! مہربانی تمھاری کہ تم نے مجھے یہ عزت دی۔'' اُس نے سونے کے بجائے رشتے کی قبولیت کی طرف اشارہ کیا۔ تمام شریک ایک بھاری خاموشی کے ساتھ دونوں سمدھیوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ وہ اِس تقریب کا حصہ ہونے پر فخر محسوس کرنے کے ساتھ ایک طرح کی اُلجھن میں بھی تھے کہ ایسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ لڑکی کا باپ پسندیدگی کے لیے اکیلا ہی چلا آئے اور تمام گھر کو سونے سے لاد جائے۔

''تم اِس گاؤں کے سردار ہو اور یہ میرے بجائے سرکار برطانیہ کا فیصلہ ہے۔ اِس رشتے سے میرے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔''

ڈاکٹر بُندے خان چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے دیوان خانے کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑا!

حویلی سے تمام مویشی بوڑھ والے کھوہ پر منتقل کر دیے گئے۔ حویلی اب ایک کھلی جگہ تھی جسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کہیں بکرے ذبح ہو رہے تھے تو کہیں جھٹکا کیا جا رہا تھا۔ ایک کونے میں شراب کی بھٹی چالو تھی اور وہاں سے بوتلیں بھر کر اُن میں بھٹوں کے تکوں کے ڈھکنے لگائے جا رہے تھے۔ کہیں پر چاول بن رہے تھے تو کہیں پر سبزی اور دالیں۔ ایک طرف نانبائی اپنا اڈا جمائے بیٹھے تھے جہاں روٹیاں اور طرح طرح کے نان بن رہے تھے۔ مسلمان نائی ذبح گوشت پکا رہے تھے تو سکھ باورچی جھٹکے والی دیگیں بنا رہے تھے۔ ہندو پکانے والے سبزی اور دال کے بڑے پتیلے چولھوں پر رکھے گوشت کے ذائقے کو مات دینے کے لیے ہر لمحے کوئی نئی ترکیب کر رہے تھے۔ بھنگ گھوٹی جا رہی تھی اور افیون کی گولیاں بھی بنائی جا رہی تھیں۔ وہاں کوئی نگران نہیں تھا، ہر کارندہ اپنا خود ہی نگران تھا کیوں کہ اُس کی اپنی ساکھ بھی داؤ پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اچھا کھانا بنا کر وہ تاریخ کا حصہ بن جائے گا اور آنے والے وقتوں میں کہا جائے گا کہ اُس نے کھانا بنا کر چودھری محمد مالک کے بیٹے کی شادی کے مہمانوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

حویلی میں ایک میلے کا سماں تھا۔ میلے بے ترتیب لوگوں کا ہجوم ہوتے ہیں لیکن حویلی میں ایک تنظیم تھی۔ ہر باورچی کو چند لوگ دیے گئے تھے جو اُس کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ اُن کو بہت واضح حکم دیا گیا تھا کہ اُنھوں نے دو ملاؤں میں مرغی حرام نہیں کرنی اور اپنے اڈے کے علاوہ کسی کا کام نہیں کرنا۔ محمد مالک صبح اور شام ایک چکر لگاتا اور تمام باورچیوں کو انعام دیتے ہوئے اُن کے ساتھ ہلکے پھلکے مذاق کر کے اُن کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اُن لوگوں کو بھی اُس کی آمد کا انتظار رہتا، وہ اپنے انعام سے زیادہ تعریف سننے کے خواہش مند تھے۔ اِسی طرح محمد مالک صبح اور شام بوڑھ والے کھوہ پر جا کر مال مویشی دیکھتا، نوکروں نے ہمیشہ چارہ ڈالنے یا اُن کی رات والی جگہ تبدیل کرنے میں کوتاہی کی ہوتی جس پر وہ اُنھیں جی کھول کر ڈانٹتا۔ اسلحے والے کمرے کی چابی صرف اُس کے پاس ہوتی تھی اور پھر وہ تالا کھول کر اندر پڑے اسلحے کے ڈھیر کو ایک مطمئن سی نظر سے دیکھتا۔

دیوان خانے میں شام ہونے سے پہلے سازندے اپنی جگہیں سنبھالنا شروع کر دیتے جہاں تھڑے پر اُن کے لیے ایک چبوترہ خاص کر تعمیر کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے وہاں قوال آتے۔ فتح علی مبارک علی بھی وہاں آتے اور بٹالہ سے کئی ٹولیاں آتیں۔ سرکسوں میں گانے والے گاؤں والوں کے لیے خصوصی طور پر بولیاں، ٹپے، ماہیے اور اپنے بنائے ہوئے گانے گاتے، ہیر اور سیف الملوک پڑھنے والی ٹولیاں چبوترے کی رونق میں اضافہ کرتیں اور سب سے آخر میں جب سننے والے تھک چکے ہوتے لیکن اُنھیں آس ہوتی کہ اُن کی تھکاوٹ جلد ہی دور ہو جائے گی اور وہ تھک چکنے کے باوجود تازہ دم ہو جانے کی اُمید میں کسی بائی کے آنے کے منتظر ہوتے۔ وہ بائی جب چبوترے پر اُکساہٹ لیے کسی آسن میں بیٹھی گھنگھرو باندھ رہی ہوتی تو اِن لوگوں کے بیچ سرگوشی کی ایک لہر زندہ ہو جاتی جو اُن کی تھکاوٹ کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی اور بائی کی پہلی سُر یا ناچ کے پہلے انگ یا گھنگھروؤں کی پہلی چھنک اُنھیں متحرک کر دیتی اور وہ دم سادھ کر آواز اور ناچ کے ملائم سے ملاپ کو محسوس کرتے ہوئے متحرک ہونے کے بعد پھر بے جان ہو جاتے، صرف اُن کی مردہ گردنیں بائی کی حرکت کے طابع ہو کر حرکت کرتیں۔

پچھلے تین دنوں سے مہمان آ رہے تھے۔ تھڑے پر وہی لوگ بیٹھتے جنھیں نائی کے ذریعے پیغام بھیجا گیا تھا اور نیچے بیٹھنے والے جو شادی کے اِس جشن سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو رہے تھے، خود ہی چلے آتے تھے۔ اُن کے لیے انا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا، وہ صرف اپنی آسودگی کے لیے آتے تھے اور سورج طلوع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے اختتام پذیر ہونے والی محفل سے مکمل سیر ہو کر اُٹھتے۔ مہمان وہاں لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنے نام کی حفاظت کے لیے آتے۔ وہ صرف وہاں اِس لیے آتے کہ اُن کا آنا اُن کے مقام کا ایک تعین تھا اور وہ اِس مقام کو اپنی جگہ ایستادہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ وہاں اپنی نفرتوں کے انبار کے ساتھ آتے اور ہر لمحہ اُس ڈھیر میں اضافہ کرتے جاتے۔ وہ اپنی پسند کا نشہ کرتے، پسند کا کھانا کھاتے اور فرمائش کر کے اپنی پسند کی موسیقی سنتے لیکن داد دینا بھول جاتے کیوں کہ وہ وہاں داد دینے کے بجائے اپنی موجودگی کا شکرانہ وصول کرنے آئے تھے۔

محمد مالک یہ سب سمجھتا تھا۔ اُس نے اُن کے چہروں کے تاثرات دیکھے تھے اور وہ یہی تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ مسلمان مہمان اِن محفلوں کو بعید از فہم سمجھتے کیوں کہ اب اِس ملک کو چھوڑنا

ناگزیر ہوتا جارہا تھا اور اُنھیں اب یہاں کسی چیز میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ اِس ملک سے جو لینا چاہتے تھے لے چکے تھے اور جو دینا چاہتے تھے، دے چکے تھے۔ اُنھیں لگ رہا تھا کہ حساب برابر ہے اور محمد مالک احمق ہے۔

سکھ مہمان اُسے شکست دینے آئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد مالک اِس ملک میں اب مہمان ہے اور اُنھیں وہ اورنگ زیب ثانی نظر آتا جس سے اُنھوں نے اپنے گروؤں کا حساب بے باک کرنا تھا۔ وہ اِتنی بڑی تقریب صرف اِس لیے برپا کر رہا تھا کہ وہ ہونی کو ٹال سکے۔ کیا شادی کی تقریب سے وہ اپنی جان بچا سکے گا؟ نہیں! وہ موقع ملتے ہی اِس گاؤں پر چڑھ دوڑیں گے اور اگر گروؤں نے ساتھ دیا تو اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ کوشش یہی ہوگی کہ اُسے دھوکے سے صلح کرنے کے لیے بلایا جائے اور اُسے جان سے مارنے کے بعد اُس کے بیٹے، بہو اور بیوی کی جان لے کر نسل کو ختم کر دیا جائے۔ محمد مالک کا خاندان کئی صدیوں سے اُن پر حاوی رہا ہے، ہمیشہ ایک آدمی پورے علاقے میں سب سے اہم تھا۔ یہ بھی سوچا جاتا کہ اُسے اِس تقریب میں ہی ختم کر دیا جائے لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ سر اُٹھا لیتا کہ ایسا کرنے سے تاریخ میں وہ اورنگ زیب ثانی بن جائیں گے اور لوگ اُنھیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ اپنی پسند کا کھانا کھا رہے تھے، پسند کا نشہ کر رہے تھے، پسند کی موسیقی سن رہے تھے اور محمد مالک کے شکر گزار نہیں تھے کہ وہ بھی اُس کی ایسے ہی خاطر کرتے آئے تھے۔

ہندو مہمان اپنے خیالوں میں گم تقریب میں آتے۔ محمد مالک اچھا آدمی تھا لیکن اب اُس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اُس کے خاندان کے ساتھ اُن کے خاندانوں کے صدیوں پر محیط تعلقات تھے، وہ ایک دوسرے کی غمی اور خوشی میں برابر کے شریک رہے تھے لیکن اب ایسا نہیں رہا۔ اب وقت آگیا تھا جب وہ اپنی صدیوں کی غلامی کا حساب برابر کریں۔ چانکیہ نے بھی یہی کہا تھا کہ دشمن کو نفرت کا پتا نہ چلے۔ سکھ تو بے وقوف تھے جو کھلم کھلا ماڑی بوچیاں پر حملہ کی بات کرتے تھے۔ ماڑی بوچیاں نے تو ڈھیر ہونا ہی تھا لیکن اُس کے ڈھیر ہونے کی تشہیر کیوں کی جائے؟ اگر سکھوں کی منصوبہ بندی کی بھنک بھی اُسے لگ گئی تو وہ اقلیت ہونے کے باوجود اُنھیں شکست دے سکتا ہے۔ ہمیں کیا؟ ہم نے ناٹک لکھ دیا ہے اور کلاکار اپنے اپنے حصے کی کہانی ازبر کر کے کھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ اُن کے علاوہ سب احمق ہیں جو حالات کے دھارے کو سمجھنے کے بجائے اپنے لیے نیا

راستہ بنا رہے ہیں۔ ہمیں کیا!

محمد مالک سکھ مہمانوں کو بہت محبت سے ملتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اُس کے دشمن ہیں۔ سانپ انسان کا دشمن ہے اور اُسے ختم کرنے کے لیے دودھ پلانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ سانپ دودھ پی کے مست ہو کر کسی ٹہنی، شاخ یا جھاڑی کے ساتھ لٹک کر جھولنے لگتا ہے اور یہی وہ وقت ہے جب مارنے کے لیے آنے والے کے قدموں کی بوک بھی نہیں سن سکتا۔ یہ بوک دراصل جلاد کی ہوتی ہے۔ وہ اُنھیں زبردستی قسم قسم کے کھانے کھانے پر مجبور کرتا، اُن کے پاس بیٹھ کر اُن وقتوں کی بات کرتا جب وہ سب جوان تھے اور اُن کے نزدیک دنیا جوتی کی نوک پر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سانپ کو دودھ پلانے اور دشمن کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملانے کے بعد دشمنی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ وہ اُنھیں دودھ بھی پلا رہا تھا اور گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ بھی ملا رہا تھا ساتھ ہی وہ اُس چھری پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا جو اُس کے دشمنوں کی بغل میں ہو سکتی تھی کیوں کہ اُس کے سمیت سب کے منہ پر رام رام تھا۔

مہمان تین دن اور آنے تھے!

سردیاں جا رہی تھیں، گرمیاں ابھی آئی تھیں اور بہار دم توڑ رہی تھی۔ یہ سستی اور کاہلی کے عجیب دِن تھے۔ بدن سردیوں کی ٹھنڈک خارج کر چکے تھے لیکن ابھی گرمیوں کی آگ بھری نہیں گئی تھی۔ بہار کا جوان موسم اپنا جوبن دکھا چکا تھا اور بدن ایک طرح کی مستی میں ٹوٹنے لگے تھے۔ موسموں کے پنڈتوں نے یہی دِن شادیوں کے رکھے تھے کہ خواہشوں کے پھولوں کے بھار سے دبے ہوئے بدن اپنے بوجھ ہلکے کر کے گرمی آنے تک اپنے بیج کو پودا بنتے محسوس کر سکیں۔ محمد مالک کی ہر نسل کی شادی بیساکھی پر ہوئی تھی جب جوان ڈانگیں گھماتے گتکا کھیلتے، چھے والی کبڈی ڈالتے، کشتیاں لڑتے، بیٹھکوں کے مقابلے کرتے، سہاگے اُٹھاتے اور کئی جو اِن کسرتی شغلوں کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پاتے تھے، کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر ٹوٹتے بدنوں کو وصال کی لذت سے آشنا کر کے وہ درد پا جاتے جس کا سواد کسی کھیل میں نہیں تھا۔ یہ وصال کا موسم تھا اور دلہنیں روتے ہوئے ڈولیوں میں بیٹھتی تھیں، کہار بھی گواہی دیتے کہ سارا راستہ آہیں بھرتی رہیں تھیں اور وہ حیران ہوتے کہ جیسے ہی پیسوں کی چھوٹ کے بعد ڈولی نیچے رکھی جاتی دلہن کے کسمساتے ہوئے قہقہے کی آواز آتی؛ ایسا صرف بیساکھی والی دلہنیں کرتیں۔ گرمیوں والی دلہنیں

پیاسی کرلاتی رہتیں، برسات میں اُنھیں حبس زندہ درگور کردیتا اور سردی والی دلہنوں کی چھینکوں سے ڈولیاں توازن کھو بیٹھتیں اور کہار اپنی عزت بچانے کے لیے ڈولی کا توازن برقرار رکھنا ہی اپنی کامیابی سمجھتے؛ اُنھیں دلہن کی چھینکوں سے کوئی غرض نہ ہوتی۔

مہمان تین دِن اور آنے تھے!

سیف الملوک گائی جا چکی تھی۔ نیچے بیٹھے ہوئے لوگ میاں محمد کے سحر میں گرفتار ہوکر غنودگی کی حالت میں تھے، وہ شک میں تھے کہ سوتے ہیں کہ جاگتے ہیں اور اِسی کیفیت میں رہنا چاہتے تھے کہ گھنگھروؤں کی آواز نے اُنھیں آسودگی کی نیند سے نکال باہر کیا۔ تبھی ایک نیم برہنہ شخص، مستی میں جھومتا سب سے آگے آکر ایسے بیٹھا کہ تھڑے پر بیٹھے لوگوں کی نظر اُس پر پڑتی تھی۔ تھڑے پر بنے چبوترے پر روشنی ایسے ڈالی گئی تھی کہ بڑے گیسوں کے اُجالے کا سایہ نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں تک جاتا تھا۔ اُسی اندھیرے سے اُجالے میں محمد مالک نے مستی میں جھومتے ہوئے اُس نیم برہنہ شخص کو پہچان لیا۔ اُس نے جو دیکھا اُس پر یقین نہ آیا۔ وہ شخص گنگو تھا اب اُس نے صرف تصدیق کرنا تھی۔ وہ اپنی تصدیق کو بہت واضح بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کوئی گُرگا گنگو کو پہچان نہ جائے۔ گھنگھرو جب بجے، ہارمونیم نے اپنی صدا اُٹھائی، جوڑی والے نے طبلوں کے پیٹ سے وہی آواز نکالی جو بائی کے لبوں اور ہارمنیم کی چابیوں میں تھی۔ اُسی سمے وہاں ایک نیا سماں وجود پا رہا تھا، میاں محمد کی معرفت ذہنوں سے خارج ہو چکی تھی، بوڑھے جوانی کی ترنگ میں سر دُھن رہے تھے اور لوگ مستی میں جھومتے اُس نیم برہنہ شخص کی موجودگی سے بیگانہ ہو گئے تھے تو محمد مالک اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ ہر رات ایسے ہی اچانک اُٹھنے کے بعد ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ اُس نے تھڑے سے اُتر کر پیچھے دیکھا تو بائی کان پر ہاتھ رکھے سُر لگا رہی تھی اور لوگ اُس کی آواز میں، جو پھٹنا شروع ہو گئی تھی، گم تھے اور وہاں بھی کسی نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ گنگو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حویلی کی پچھلی طرف چلا گیا۔

وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر گنگو بھی وہاں آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ پھر گنگو اُس کے گھٹنوں کو چھونے کے لیے جھکا تو محمد مالک نے اُسے منع نہیں کیا۔ گنگو نے گھٹنے چھو کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا:

''تم نے شادی کی محفل میں آکر بہت خطرے کا کام کیا، مجھے اِس کا احساس ہے اور

میں تمہارا دین دار ہوں۔'' محمد مالک نے جذبات کو بہنے دیا۔ تھڑے سے بائی کے گانے کی آواز رات کی خاموشی میں سے چھنتے ہوئے آ رہی تھی۔

''بھائیا! آنا میرا فرض تھا۔ باقی بات خطرے کی تو میں اُن کا عادی ہوں۔ پھر یہاں مجھے کون پکڑ سکتا ہے۔ چلو ذرا کھوہ کی طرف چلیں۔'' گنگو نے آگے کی طرف چلتے ہوئے محمد مالک کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ محمد مالک پیچھے چل پڑا۔ اُس نے اپنے آپ کو اکیلا اور نہتا محسوس کیا لیکن اُس نے سوچا کہ جانا ہی ہے چاہے خطرہ مول کیوں نہ لینا پڑے۔ وہ خاموشی سے چلتے رہے اور بائی کے گانے کی آواز رات کی خاموشی میں سے چھنتی ہوئی دور ہوتی گئی۔ کھوہ پر خاموشی تھی۔ محمد مالک کو ایک طرف چند سائے نظر آئے اور اُس نے جب بُجھ لگائی تو وہ چند گھڑسوار تھے۔ گھوڑے کبھی کبھی پھڑ پھڑا لگا کر لمبا سانس لیتے، شاید وہ اگلے سفر سے خائف تھے یا اپنے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر کر سفر کی تیاری میں تھے۔

تھڑے پر سے بائی کے گانے کی آواز رات کی خاموشی میں سے چھنتے ہوئے کہیں دور سے آتے ہوئے لگ رہی تھی!

ایک سائے نے حرکت کی اور ایک آدمی اُن کی طرف آیا۔ محمد مالک پریشانی اور ایک کھچاؤ کی کیفیت میں اُسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُسے یہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگا جس میں جسم کوشش کے باوجود حرکت نہیں کر سکتا۔ اُس سائے نے محمد مالک کے پاؤں چھونے کی کوشش کی اور گنگو کو کچھ تھما کے واپس چلا گیا۔ گنگو نے ہاتھ بڑھا کر وہی چیز محمد مالک کی طرف بڑھائی:

''بھائیا! یہ چھوٹی سی بھینٹ بھتیجے کے لیے ہے۔''

محمد مالک نے گنگو کے ہاتھ سے تھیلی لے کر اُسے ہلایا اور سمجھ جانے کے بعد کہا:

''ضرورت نہیں تھی۔ تم خود مشکل حالات میں ہو۔'' محمد مالک نے واپس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''بھائیا! ضرورت تھی تو لایا ہوں۔'' گنگو نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کر لیا۔ ''کچھ اور بھی لایا ہوں۔''

محمد مالک خاموش رہا۔

''کچھ اسلحہ لایا ہوں۔ حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ جب حملہ ہوا تو ڈوگرا جہاز حملے کا نگران ہوگا۔'' پھر اُس نے نچلے ہونٹ کو انگلیوں میں دبا کر ہلکی سی سیٹی بجائی تو دو سوار آگے کی طرف آئے۔ دو زینوں کے آگے گٹھڑی رکھے ہوئے تھے۔ محمد مالک نے دروازہ کھولا اور دونوں گٹھڑیاں اندر لائی گئیں۔ ایک گٹھڑی میں رائفلیں اور دوسری میں گولیاں تھیں۔ گنگو نے ایک نظر دیوار کے ساتھ رکھی رائفلوں پر ڈالی اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''بھائیا! تم تو ایک فوج کو مات دے سکتے ہو۔''

محمد مالک نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا!

''میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ میرے اتنے کام آ رہے ہو۔ جیسے حالات ہیں مجھے تم سے اتنی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے تھی، تمھیں تو میرا دشمن ہونا چاہیے۔ اور تم اپنے لوگوں کی مخالفت کرتے ہوئے میرا ساتھ دے رہے ہو۔ کل یہ تمھارے خلاف ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آج کے بعد میری مدد نہ کرنا بے شک مجھے روز ملو، مجھے اپنا مددگار ہونے کے سبب چاہے گرفتار کرا دو۔''

ایک گہری خاموشی نے دونوں پر اپنا سایہ کر دیا تھا۔ تھڑے پر سے بائی کے گانے کی آواز رات کی خاموشی میں سے چھننا بند ہو گئی تھی!

''بھائیا! اِن میں سے کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا، آج بھی میری ٹوہ میں ہیں کہ مخبری کریں۔ تم نے ہر وقت میرا ساتھ دیا اور اگر میں آج اُن کا ساتھ دوں تو سندر سنگھ کے بجائے کسی حرامی کی سٹ ہوا۔ میں اگر پکڑا جاؤں تو اِس ملک نے مجھے لٹکا دینا ہے اُس لیے جتنی نیکی کما سکوں کم ہے۔ تم مشکل میں ہو اور ہمیشہ کی طرح میں مشکل میں پھنسے ہوئے کے ساتھ ہوں۔'' اُس کی زبان میں لکنت تھی۔ محمد مالک نے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گنگو اپنا غبار نکال لے۔ ''مجھے تین ضلعوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ میں قتل، ڈکیتی اور اغوا میں اشتہاری ہوں۔ میرے خلاف تمام مدعی امیر لوگ ہیں اور غریب میرے لیے دعا کرتے ہیں۔ میں نے ایک دن پکڑے تو جانا ہے، لیکن،'' وہ رُکا، اُس نے ایک بھاری سا قہقہہ لگایا، ''لیکن اب امیر کی بددعا اور غریب کی دعا کے بیچ سخت مقابلہ ہے۔'' گنگو خاموش ہو گیا۔ رات کی خاموشی میں سے بائی کی آواز چھننا شروع ہو گئی: ایسے لگ رہا تھا کہ سُر دریا کی لہروں پر ڈولتے ہوئے آ رہے

تھے۔ ''بھائیا! آ گیا ہے۔''

''جاؤ۔'' محمد مالک نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ تمہارا گھر ہے۔''

''میں اب نہیں ملوں گا۔ اگر کہیں غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔'' ایک دم جیسے اونچی آواز میں بول کر مدھم ہو گیا، گنگھرو بھی جیسے دم توڑنے لگے تھے اور اچانک زندہ ہو کر بج اٹھے اور بانی کی آواز بھیگنے کے بعد میٹھی اور سُریلی ہو گئی۔

محمد مالک نے ایک قدم بڑھ کر گنگو کو گلے لگایا اور گنگو اُس کی گرفت میں سے نکل کر تیزی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔

محمد مالک کسی خواب میں گم دیر تک دور ہوتے ٹاپوں کی آواز سنتا رہا۔ وہ بغیر آنسو بہائے روتا رہا۔ گنگو کے ساتھ اُس کا کبھی تعلق نہیں رہا تھا۔ اُس کا باپ سندر سنگھ اتنا غیر اہم آدمی تھا کہ محمد مالک کو ایک عرصے تک اُس کا نام بھی نہیں آتا تھا۔ پھر اُس نے سندر سنگھ کی مدد کی۔ سندر سنگھ اتنا کمزور اور خوف زدہ تھا کہ اُس کی دی ہوئی امداد قبول کرنے سے بھی ڈرتا تھا۔ پھر ایک شام وہ گھڑ سوار دریا کی طرف سے سرپٹ بھاگتے ہوئے آئے اور دیوان خانے کے باہر گھوڑیوں سے اُتر کر تھڑا چڑھا۔ گنگو اُس وقت گوشت پوست کے انسان کے بجائے کہانیوں میں ڈھلی ایسی حقیقت بن چکا تھا جو اپنے دبدبے کے بجائے محبت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا تھا۔ جب وہ دیوان خانے کے سامنے رکا تو پہلی نظر میں کسی نے اُسے پہچانا نہیں اور جنھوں نے پہچان لیا وہ بادشاہ کو بے لباس کہنے کی جراٴت نہیں کرتے تھے۔ محمد مالک نے اُسے دیکھا نہیں تھا اور وہ تھڑے پر بیٹھا گھڑ سواروں کو حیرت، دل چسپی اور تجسس سے دیکھتا رہا۔ اُن کے گھوڑوں کی گردن اور چڈوں پر پسینہ جھاگ میں تبدیل ہو چکا تھا اور سوار خود دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ دونوں سوار جب نیچے اُترے تھے تو محمد مالک کو اُن کے قد کاٹھ دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی تھی۔ دونوں اُسے خستہ حال اور معذور سے آدمی لگے تھے، اُس نے سوچا تھا کہ گھوڑوں کی حالت اور سواروں کے حلیے دیکھ کر وہ لوگ کسی بادشاہ کے ایلچی لگے تھے۔ دونوں سکھ تھے اور دونوں نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کیا تھا۔

''میں پیجو چک کا رہنے والا ہوں اور میرا نام گنگا سنگھ ہے۔'' اتنا کہہ کر اُس نے اپنی بات کے وزن کو سب پر بوجھ ڈالنے دیا تھا اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہا تھا ''میں چودھری کے چرن

چھونے آیا ہوں۔'' محمد مالک سمجھ گیا تھا کہ وہ اُسے پہچانتا نہیں، اِس لیے وہ ایک بے نیازانہ سی شان کے ساتھ اُٹھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا قد یا تو اونچا تھا یا وہاں بیٹھے سب لوگ بونے تھے۔

''اِدھر آؤ۔'' محمد مالک نے تہہ بند کے لڑ درست کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم ہمارے بہادر شیر ہو، چرن کیوں چھوؤ گے۔ اِدھر آؤ اور سر پر پیار لو۔'' محمد مالک نے اپنا ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا تھا اور گنگو نے اُس کے گھٹنے چھو کر اپنا سر جھکا دیا تھا۔

''بھائیا! تم نے کسی غرض کے بغیر میری مدد کی، میں یاد رکھوں گا۔''

آج گنگو شاید اُسے آخری بار مل گیا تھا۔

بارات ایک کھلے میدان میں آئی جسے کئی دنوں کی محنت کے بعد پورا کیا گیا تھا۔ میدان میں سینکڑوں چار پایاں بچھی ہوئی تھیں، ہر چار پائی پر ایک تکیہ اور کھیس رکھا تھا اور دو چار پائیوں کے درمیاں میں ایک پیچواں حقہ! تمام چار پائیاں، کھیس اور تکیے نئے تھے۔ دولہا کے لیے ایک چبوترہ بنایا گیا تھا جہاں بادشاہوں کے تخت جیسی کرسی رکھی تھی جس پر عبدالرشید کو بیٹھایا گیا۔ ڈاکٹر بُندے خاں اِس شاہی کرسی کے پیچھے اپنے بڑے پیٹ پر چھوٹے چھوٹے ہاتھ رکھے کھڑا باراتیوں کو گن رہا تھا۔ اُس نے دو ہزار تک لوگ گنے اور پھر اُسے لگا کہ لوگ آنے بند ہو گئے ہیں۔ اُس نے اطمینان اور کسی حد تک پریشانی کے ساتھ سوچا کہ محمد مالک صرف دو ہزار آدمی ہی لاسکا جب کہ اُس نے تو پانچ ہزار کا بندوبست کیا تھا۔ تیسری شادی سے اُس کا بڑا بیٹا جو ایم اے او کالج امرتسر میں تاریخ پڑھاتا تھا باراتیوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا، دوسرا بیٹا کہ محکمہ تعلیم میں افسر تھا دیگوں پر نگران تھا، تیسرا بیٹا جو اپنے نام کے ساتھ لگے خاں کو ہٹا کے شاہ لگا کر لائل پور کے ایک مزار کا مجاور بن گیا تھا، پانی پلانے پر مامور تھا اور سب سے چھوٹا بیٹا جو ایک فن کار تھا، اِس شادی میں شامل نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ فرار ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر بُندے خاں کی بیٹی کہ نام جس کا حسنات تھا، ابھی جوان ہوئی ہی تھی کہ اُس کی شادی کر دی گئی۔ وہ اُردو اور فارسی پڑھ اور سمجھ سکتی اور قران پاک بمعہ ترجمہ پڑھ چکی تھی۔ جب ڈولی میں بیٹھی تو اُسے پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؛ اُس نے ہر کسی سے یہی سنا تھا کہ اُس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ پریشان تھی کہ اُس نے اپنی ماں کو ہمیشہ نہ خوش اور کڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ نہ خوشی اور کُڑھنا شادی کا حصہ تھے اور اپنی پیڑھی پر بیٹھے، گھٹنوں میں سر دبائے اکثر سوچتی رہتی کہ کیا وہ اپنی ماں کی طرح کُڑھا کرے گی یا کوئی نیا طریقہ اپنائے گی اور اُس کے فیصلہ کر پانے سے پیشتر ہی اُس کی شادی آن پہنچی اور اُسے ڈولی میں ڈال دیا گیا۔

وہ ڈولی میں بیٹھی تو بالکل نہیں روئی تھی۔ روتی تو تب جب وہ اپنی منزل کو جانتی۔ وہ

بیساکھی کی دلہنوں کے برعکس ڈولی میں خاموش بیٹھی رہی۔ چند گلیوں کا سفر کہاروں نے ایک طویل فاصلہ سمجھ کر طے کیا، شاید انھیں حسنات بی بی کے رونے کی آواز سننے کی فکر تھی یا محمد مالک ڈولی کے اوپر پیسوں کی اتنی سوٹ کر رہا تھا کہ اُن کے لیے فاصلہ طے کرنا محال تھا۔ وہ رک جاتے اور پھر تب چلتے جب اور رکنا ممکن نہ رہتا۔ انھوں نے محمد مالک کے گھر پہنچنے تک اتنا وقت لیا کہ تب تک ڈاکٹر بندے خاں بٹالہ پہنچ چکا تھا۔

جب محمد مالک کے گھر کا دروازہ آیا تو کہاروں نے ڈولی نیچے اُتاری۔ وہ منتظر تھے کہ اندر بیٹھی بی بی کسمسا کر شرمیلا سا قہقہہ لگا کے بیساکھی کی دلہنوں کی روایت پوری کرے لیکن وہ ایک چیخ لگا کے بے ہوش ہوگئی۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ بے ہوش حسنات کو ڈولی میں سے نکالا گیا۔ اُسے پنکھے جھلے گئے، چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے، گھی اور دودھ پلائے گئے، کچھ دیر بعد وہ ہوش میں تو آ گئی لیکن آنکھیں بند کیے لیٹی رہی جیسا کہ اُس نے پرانی کہانیوں میں پڑھا تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے گرد ایک ہنگامہ تھا، ایک وقت آیا کہ وہ اِس ہنگامے میں سے لطف کشید کرنے لگی۔ وہ اب اپنے حواس برقرار کر چکی تھی، اُسے اپنے دولہا کو دیکھنے کا انتظار تھا۔ اُس کی ماں پکے رنگ کی ایک عورت تھی جو پستہ قد تو نہیں تھی لیکن یقیناً دراز قد بھی نہیں تھی۔ اُس کا باپ پستہ قد، بھاری اور خود غرض آدمی تھا جس کے نہ تو اپنے جذبات تھے اور نہ کسی کے جذبات کو سمجھتا تھا۔ ماں کہ ہر وقت کُڑھتی تھی آج رات بہت اُداس ہوگی اور اُس کا دولہا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اُس کے پاس آئے گا۔ کیا وہ بھی اُس کے باپ کی طرح جذبات سے عاری ہوگا؟ اُسے اپنی ماں جیسا ہمدرد ہونا چاہیے یا باپ کی طرح خود غرض اور بے فیض؟ اُس نے سوچا کہ وہ اپنے باپ کی طرح موقع شناس اور ماں کی طرح بے لوث ہوگی۔ اُس نے ایک تھکی ہوئی سی انگڑائی لی، ظاہر کرنے کے لیے کہ اُسے ابھی ہوش آیا ہے۔ حسنات بی بی، جو سارا دِن گھر میں بند رہتی تھی اور جس کی دنیا باہری دروازے کے اِس طرف محدود تھی اور جس نے اُس دروازے کے باہر کبھی جھانکا بھی نہیں تھا اچانک سب کچھ جان گئی۔ حاجرہ نے اُس کی بلائیں لیتے ہوئے اُس کی درازیِ عمر کی دعائیں مانگیں اور کہاروں کو کوسنے دیے جو ڈولی ایسے لائے کہ اُس کے گھر کا چاند کچھ دیر کے لیے ماند پڑ گیا۔ کہار کہ اُس وقت گھر میں صدقے اکٹھے کر رہے تھے ایک دوسرے کو پریشان نظر سے دیکھ کر اُداسی کے ساتھ مسکرائے۔ وہ جانتے تھے کہ قصور ہمیشہ انھیں کا ہوتا ہے۔

میلہ تو نہیں لیکن میلے کا سماں ضرور تھا، تمام رات آتش بازی ہوتی رہی اور دیوان خانے میں تین بائیاں باری باری گاتی رہیں۔ علاقے کے لوگ گانے سننے، آتش بازی دیکھنے اور اس تاریخی اجتماع کا حصہ بننے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ خواص اپنی پسند کا نشہ کر رہے تھے جب کہ عوام کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ اس ہنگامے میں شامل تھے یا اس کی توسیع۔ کھانے کے لیے کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی؛ جس کا جتنا جی چاہے اور جتنی بار چاہے، کھالے۔ تمام ہجوم دالیو خانے کے سامنے چوک میں جمع تھا، کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لوگ اپنی حفاظت کے لیے کم اور لباس کا حصہ بنانے کے لیے زیادہ، ہاتھوں میں ڈانگیں، کھونڈ، برچھیاں، چھویاں، کلہاڑیاں اور باکیاں اُٹھائے ہوئے تھے۔ جب کہ گلیاں سونی، اندھیری اور اُجڑی ہوئی تھیں۔ اُنہیں گلیوں میں ایک گلی کہ جس میں محمد مالک کا گھر تھا، اُتنے اندھیرے میں نہیں تھی۔ وہاں دروازے کے باہر گیس روشن تھا جس کے جلنے کی سرسراہٹ چوک کے شور میں ڈوب گئی تھی اور روشنی بھی وہاں کی روشنیوں کے ساتھ مل کے اُن کا حصہ بن گئی تھی۔ صحن اور تمام دروازوں کی کنڈیوں کے ساتھ روشن لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ گھر میں ایک دبی دبی سی رونق تھی، ہر کوئی خوشی خوشی، کسی کام سے یا یونہی کوئی کام نکالنے کے لیے ادھر اُدھر چکر کاٹے جا رہی تھی۔ حسنات کی شب بسری کا بندوبست تو خاندانی روایت کے مطابق چھت پر کیا گیا تھا، حاجرہ نے ایک عرصے کے بعد صحن میں سونا تھا لیکن ابھی حسنات صحن میں چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی فرش پر بنے رنگوں کے جمگھٹے کو غور سے دیکھتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ ہر رنگ دائرے کے اندر اپنے خانے میں کس نفاست کے ساتھ باریک ہوتے ہوئے ختم ہو کر باقی رنگوں میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اُسے نیند تو نہیں آئی تھی لیکن وہ سونا چاہتی تھی، شاید اُکتاہٹ کی وجہ سے یا شاید وہ عبدالرشید کے آنے کے انتظار میں تھی جو اپنے ہم عمروں کے ساتھ بیٹھا گھر سے بلاوے کا منتظر تھا۔ وہ جب جھجکتے، شرماتے اور کسی حد تک کھسیانہ سا گھر میں داخل ہوا تو صبح کی سپیدی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ اُس وقت صحن سو چکا تھا، لالٹینوں کی روشنی ماند پڑ چکی تھی اور حاجرہ سیڑھیوں کے پاس بچھی چارپائی پر گٹھڑی سی بنی لیٹی تھی۔ عبدالرشید چارپائی کے پاس کھڑا غور سے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ وہ کیا کرے؟ حاجرہ اُسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر وہ چارپائی سے بچتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اگلا دن معمول کا تھا، دیگیں، برتن، آٹے اور چاولوں کی بوریاں، مصالحوں کے ڈبے، بچا ہوا بالن، کھدر کے تھان، ٹب، بالٹیاں، گیس، گھی کے پیلن، مٹی کے تیل کے ڈرم، خالی بورے اور بہت سا چھوٹا چھوٹا ایسا سامان جو کسی گنتی میں نہیں تھا، اکٹھا کیا جانے لگا۔ محمد مالک نے حویلی کو جلد از جلد صاف کرنے، چولھوں کو بند کرنے، کلوں کو ٹھوکنے اور چارہ کترنے کی مشین کو دوبارہ لگانے کے لیے کئی آدمی لگائے تاکہ شام تک مویشی حویلی میں آجائیں اور سورج غروب ہونے تک کسی کو پتا ہی نہ چلے کہ پورا ایک ہفتہ شادی کی تقریب برپا رہی تھی۔ دوپہر تک چارے کے دو گڈے آ گئے جنھیں مشین کے پیچھے ترتیب سے رکھ دیا گیا تاکہ دتھا لگانے والے کو دقت نہ ہو۔ حویلی میں بڑی تیزی اور درستی کے ساتھ کام ہو رہے تھے۔ محمد مالک دیوان خانے میں مبارک دینے والوں کے پاس بیٹھا حقے اور باتوں میں مشغول تھا کہ عبدالرشید بھی وہاں آ گیا۔ وہ دیوان خانے میں تبھی آتا تھا جب محمد مالک اُسے بلاتا یا اُسے کوئی کام ہوتا۔ وہ آکر ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گیا، محمد مالک نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ باتیں سنتا رہا اور جہاں ضروری ہوتا اپنی رائے بھی دیتا۔ محمد مالک اُس کی بات غور سے سنتا اور مبالغانہ طریقے سے سر ہلا کر تائید کرتا۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے دیوان خانے کا مستقل حصہ لگا اور محمد مالک خوشی اور غرور کے ساتھ اُس کی طرف دیکھتا۔ وہ خود بھی اپنی شادی کے بعد ایسے ہی اپنے باپ کے پاس بیٹھنا شروع ہو گیا تھا اور جب وہ فوت ہوا تو اُسے تمام معاملات سے نمٹنا آ گیا تھا۔

وہاں گندم جھاڑ کے بجائے آزادی، نئے ملک کے قیام، متوقع ہجرت اور سکھوں کے ناموافق رویے پر تبادلہ ء خیال ہو رہا تھا۔ سب کو تجسس تھا کہ کون سے موسم میں ملک تبدیل کرنا پڑے گا تاکہ وہ ساونی کی فصلوں کا سوچ رکھیں۔

''میرا نہیں خیال کہ ہم سونی لگا سکیں گے!'' عبدالرشید نے کہا، ''کچھ دن پہلے سری گوبند پور میں بات ہو رہی تھی کہ اب چند مہینے اور ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ہمارے گاؤں پر علاقے کا سب سے بڑا حملہ کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ ہم تو سیدھے محنت کرنے والے لوگ ہیں، یہاں تو کبھی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا، نہ کبھی پولیس آئی اور نہ ہی کچہریوں میں کوئی مقدمے چل رہے ہیں۔''

''تم وہاں کیوں گئے تھے؟'' محمد مالک نے درشتی نے پوچھا۔ ''آج کل کہیں جانا محفوظ

نہیں۔'' اُس نے اپنے لہجے کی درشتی کو محسوس کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ عبدالرشید اب شادی شدہ ہے اور اُسے گاؤں اور علاقے کی سرداری سنبھالنی ہے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ جلد ہی اُنھیں ہجرت کرنا پڑ جانی ہے اور کوئی پتا نہیں کہ قسمت کہاں لے جائے۔ ساتھ ہی اُس نے سوچا کہ وہ کہیں بھی جائیں اور جن لوگوں کے ساتھ آباد ہوں، سرداری تو انھوں نے ہی کرنی ہے۔

''میں سری گوبند پور گیا تھا۔ غفور کے وہاں کسی نے پیسے مارے ہوئے تھے، اس لیے وہاں گیا تھا۔'' عبدالرشید کے لہجے میں کچھ مفاہمت تھی، ''بندوبست پورا تھا۔''

''اب تو جو پیسے مر گئے اُنھیں بھول جانا چاہیے۔'' محمد مالک نے ناراضی سے کہا۔

''زمانہ بہت بدل گیا ہے، پتر!'' حبیب وال سے مبارک دینے کے لیے آئے ہوئے ایک بوڑھے نے کہا، ''اب وار کرنے کا طریقہ بدل گیا۔ جب انگریز نے اپنی سرکار یہاں قائم کی تھی تو اُس وقت مارنے والے للکار کے مارتے تھے، اب تو چھپ کر وار کرتے ہیں۔''

''صاف راستہ ہو اور دور تک نظر آ رہا ہو تو چھپ کر کیسے وار کیا جائے گا۔'' عبدالرشید نے غصے سے کہا۔

''خوش رہو اور سلامت رہو پتر، دشمن کو غافل نہ سمجھو۔'' بوڑھے نے میٹھے لہجے میں دلیل دی جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔

''چاچا جی! ہم دن ہوتے ہوتے واپس آ گئے تھے۔ خطرہ کی بات نہیں تھی۔'' عبدالرشید کے لہجے میں مفاہمت تھی۔

''اب کسی کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔'' محمد مالک کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ ''میں تو یہاں تک کہوں گا کہ کوئی آدمی اکیلا کہیں نہ جائے۔ اُس نے اگر رات کو پانی لگانا ہے تو بندوبست کر کے جائے۔ لاٹھی سوٹا پاس ہونا چاہیے اور اگر جوڑی میں جائیں تو کیا کہنے۔''

''وہاں تو یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ہمارے گاؤں پر بڑا حملہ ہوگا۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمارے پاس اسلحہ بنانے کے کارخانے ہیں اور ہم دھڑا دھڑ اسلحہ بنائے جا رہے ہیں۔'' عبدالرشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پتر! دشمن کے وار کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ وہ تم لوگوں پر ایسے حملہ کرنا چاہتا ہے

جیسے شیر کا شکار کر رہا ہو۔تم لوگوں کے پاس اسلحہ کہاں سے آتا ہے یا بیاس کے کنارے کے مسلمانوں کے پاس۔ہم تو محنتی اور سرکار کے وفادار لوگ ہیں،ہمیں اسلحے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اب سُننے میں آرہا ہے کہ اسلحہ بہت ضروری ہے۔''بوڑھا اپنے نظریے پر قائم تھا۔

''بھائی بھیجے خاں! ٹھیک کہتے ہو۔ہم نے کبھی اسلحہ رکھنے کا سوچا ہی نہیں تھا۔ہمیں ضرورت کیا تھی؟ کچہری تھانہ ہمارا اپنا تھا اور یہی زندگی میں زیادہ ضروری ہیں۔''

''ہم یہاں اکثریت میں تھے،اِس لیے ہمیں اسلحوں کی ضرورت نہیں تھی۔''عبدالرشید نے رائے دی۔

''ضرورت تو تھی لیکن ہم نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔''ایک اور مہمان نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔''شاید ہم بزدل تھے۔''

''نہیں!''حقے کا کش لیتے ہوئے بوڑھے نے کہا،''ہم شریف تھے۔''

''تو پھر بزدل ہی ہوئے نا؟''

''اِن باتوں کا اب وقت نہیں رہا۔ہمیں آگے کا سوچنا ہے۔''محمد مالک نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔''کیا ہمیں یہاں سے لڑتے ہوئے جانا چاہیے یا گاجر مولی کی طرح کٹ جائیں؟''

''اگر ہم نے یہاں گاجر مولی کی طرح کٹنا ہے تو کیا کہیں پر ہمارا بدلہ بھی لیا جائے گا؟''بزدل کہنے والے مہمان نے پوچھا۔

''بدلہ کس نے لینا ہے؟اگر کوئی دوسری طرف مارتا ہے تو وہاں مارے جانے والے بھی ہمارے جیسے ہوں گے۔بہتر تو یہی ہوتا کہ سرکار خود ہمیں وہاں پہنچائے اور اُدھر سے آنے والوں کو یہاں لائے۔''کسی نے کہا۔محمد مالک کو فوراً تحصیل دار کا خیال آیا۔شاید وہ لکیر تک جانے میں اُس کی مدد کردے! اُسے گلے چند دنوں میں اُسے ملنا چاہیے تاکہ اُسے مدد کے لیے کہہ سکے۔ویسے ممکن تھا کہ وہ چند دنوں کے اندر عبدالرشید کی شادی کی مبارک دینے آئے۔محمد مالک کو خیالوں میں گم دیکھ کر سب لوگ سنجیدہ سی خاموشی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگے۔اُسے ایک دم سب کی نظر کا احساس ہوا اور وہ قدرے جھینپ سا گیا۔''ایسے ہی کچھ سوچنے لگ گیا تھا۔''اُس نے کمزور سی آواز میں کہا۔وہ جانتا تھا کہ اردگرد کے لوگوں کے لیے ماڑی بوچیاں اور وہ طاقت اور مدافعت

کا نشان تھے۔ وہ گاؤں جس کی دو پٹواریں تھیں اور اُس کے ہر رہائشی کو لکیر پار کروانا ممکن نہیں تھا لیکن پھر بھی چند وفادار گھرانے ایسے تھے جن کو ساتھ لے جانا ضروری تھا؛ وہ جہاں بھی جائے وہ خاندان اُس کے ساتھ جائیں گے۔ اُس کے ذہن میں اُن خاندانوں کی فہرست اپنے آپ تیار ہونے لگی۔ اُسے حیرت ہوتی کہ میوؤں، ارائیوں کے کچھ گھروں اور چند راجپوتوں کے علاوہ لبانے بار بار اُس کے ذہن میں آتے تو وہ اپنی سوچ کی بے راہ روی پر منظوظ ہوتا تو پھر اُسے خیال آتا کہ اُنھوں نے پیچھے اسی گاؤں میں رہ جانا تھا۔ لبانے جو اُس کے خاندان کے صدیوں سے وفادار تھے، اُنھیں پیچھے چھوڑ کر چلے جانے کا سوچ کر اُسے تکلیف ہوتی لیکن اُنھیں چھوڑنا ہی تھا!

"بُرے وقت آ رہے ہیں۔" کسی نے رائے دی۔

علم دین کی بھٹی متواتر چل رہی تھی۔ وہ ایسے کارہین بنا رہا تھا جو صرف ایک فائر ہی کر سکتے تھے۔ اُس کی تمام تر توجہ اب تلواریں بنانے پر تھی۔ وہ گھی کے کنستروں، نوکوں کے پاڑچھوں، پرنالوں، درانتیوں، کھرپوں کے علاوہ جو بھی لوہے یا ٹین کی چیز ملی، تلوار میں ڈھالتا جا رہا تھا۔ ایسی تلواریں بھی تھیں جنھیں ہوا میں لہرایا جانا ہی کافی تھا اور پھر وہ ٹیڑھی ہو جاتیں اور ایسی بھی تھیں جو انسان کے جسم کو کاٹ کر رکھ دیتیں۔ بوڑھے والے کھوہ پر اب آدمی سلایا جانے لگا کہ اُسے کسی راہی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ محمد مالک نے ایسے آدمی ڈھونڈنا شروع کر دیے جو بندوق چلا سکتے ہوں۔ اُسے پہلی جنگِ عظیم میں حصہ لے چکے تین آدمی مل گئے اور ایک دوسری جنگِ عظیم میں زخمی ہونے کے بعد فارغ کر دیا جانے والا فوجی۔ اِن آدمیوں کو محمد مالک نے اپنا اسلحے کا ذخیرہ تو نہیں دکھایا، صرف اتنا بتایا کہ چند دنوں میں اُس کے پاس رائفلوں، بندوقوں، گولیوں، کارتوسوں اور تلواروں کا ڈھیر پہنچ جائے گا۔ وہ ہر صبح نوجوانوں کو اکٹھا کرتے اور ایک رائفل سے، جو اِس مقصد کے لیے اُس نے اسلحہ خانہ سے نکالی ہوئی تھی، خندق میں کھڑے ہونا، نشانہ لینا، گولی چلانا، گولی کی کارگر رینج اور اُس کی اہلیت کے بارے میں بتاتے۔ وہ جانتے تھے کہ گاؤں کے نوجوان ایک غیر تربیت یافتہ مسلح لشکری ہیں جن میں اپنے فائر کو روکے رکھنے کی قطعاً صلاحیت نہیں تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کو ہر روز بتاتے: "ہم اُسی حالت میں جیت سکتے ہیں اگر فائر روکنا سیکھیں گے۔" نوجوانوں کو حیرت ہوتی۔ "بھائی جی! فائر روک کر ہم کیسے جیتیں گے۔ اُس طرح تو دشمن جیتے گا۔"

بتانے والا ایک لمبی سانس لیتا۔ اُسے اپنے شاگردوں کی عقل پر رونا آتا۔ ''اگر تم دشمن پر اپنے کارگر رینج میں آنے سے پہلے ہی فائر کرنا شروع کر دو گے تو اُس کی موج ہو گئی۔ چلاتے رہو اپنی رائفلیں، وہ دور کھڑا تمھاری بیوقوفی پر ہنستا رہے گا اور ساتھ ہی ایک دستہ تمھارے دائیں یا بائیں سے پیچھے کی طرف بھیج کر بھرکس نکال دے گا۔''

وہ پریشانی سے پوچھتے: ''پھر کیا ہو سکتا ہے۔''

''صبر کرنے کی ضرورت ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اپنی خندقوں میں چپ کر کے بیٹھے رہو۔ اُسے یہ تاثر دو کہ مورچے خالی ہیں۔ وہ پہلے جھجکے گا، کچھ ڈرے گا اور جب اِس طرف سے کوئی حرکت نہیں ہو گی تو دلیر ہو کر بے احتیاط ہونا شروع ہو جائے گا اور ساتھ ہی کارگر رینج میں آجائے گا۔ یہ وقت ہے تمھارے فائر کرنے کا۔ وہ تلیروں کی طرح گریں گے۔ وہ جب گریں تو اُن کے پیچھے نہیں جانا۔ جب بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کیا جائے تو تمھاری اپنی دفاعی پوزیشن خالی ہو جاتی ہے جس پر وہ قبضہ کر لے گا۔'' وہ جنگی حکمتِ عملی سمجھاتے۔ اُنھیں بھی تسلی تھی کہ ہمیشہ مذاق کی زد پر رکھنے کے بجائے کوئی اُن کی بات سُن بھی رہا تھا اور اُنھیں اپنی یہ اہمیت اچھی بھی لگتی۔

''اگر مار کھا کر بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا نہیں کرنا تو پھر لڑائی کا کیا فائدہ؟ ہم نے تو اُسے مارنا ہے۔''

''تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دشمن کا پیچھا گولیوں سے کرتے ہیں بھاگ کر نہیں۔''

محمد مالک نوجوانوں کی ایک فوج تیار کر رہا تھا۔ وہ پرانے فوجیوں کے ساتھ تیاریوں پر تبادلہء خیال بھی کرتا۔ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے:

''سویلین اتنی جلدی سپاہی نہیں بن سکتے۔ اُنھیں پختہ ہونے میں وقت لگے گا۔''

شادی کے تیسرے دن تحصیل دار آیا۔ اُس نے رات نہیں رہنا تھی۔ اُس کا عملہ ایک دن پہلے پہنچ گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دونوں بڑے کمرے میں حقہ درمیان میں رکھ کر بیٹھ گئے۔

"چودھری جی! تیاری ہے؟" تحصیل دار نے ہنستے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تیاری ہے تو نہیں شروع کر دی ہے۔"

"کیسے؟"

"اسلحہ اکٹھا کر لیا ہے اور نوجوانوں کی تربیت بھی ہو رہی ہے۔ چلے تو جاتا ہے تنگن ایک مرتبہ اپنا آپ دکھا کے جاؤں گا۔" محمد مالک نے کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

تحصیل دار تھوڑی دیر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا جیسے وہ ایک احمق آدمی کو دیکھ رہا ہو۔ محمد مالک کو محسوس ہوا کہ تحصیل دار کو اُس کی بات کا یقین کرنا مشکل لگ رہا ہے۔

"اُس سے کیا ہوگا؟ کیا آپ رُک سکیں گے؟" محمد مالک، تحصیل دار کے لہجے کی بے زاری کو شناخت نہ کر سکا۔

"رُکنا چاہتا تو شاید رک بھی جاتا لیکن اب وہ وقت گزر چکا ہے۔" محمد مالک کے جوش کے وزن سے تحصیل دار کی نظر جھک گئی۔

"آپ نے اتنا اسلحہ کہاں سے اکٹھا کر لیا؟" تحصیل دار اپنی دلچسپی کو نہ چھپا سکا۔

"گنگو نے دیا ہے۔"

"گنگو نے؟"

"جی ہاں! گنگو نے!"

"چودھری صاحب! ایک کام تو کرو؟" تحصیل دار نے سرگوشی کی۔

محمد مالک چارپائی پر آگے کی طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ "جی، چودھری صاحب!"

"آپ....." وہ جھجکا، "آپ گنگو کو پکڑ وا سکیں گے؟"

محمد مالک سکتے میں آ گیا۔ اُسے نہ ہی تحصیل دار کی بات کا یقین آیا اور نہ ہی اپنے کانوں پر۔ وہ کچھ دیر بے یقینی کے ساتھ تحصیل دار کو دیکھتا رہا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور ایک لمبی سانس لی، "چودھری جی! پہلی بات تو یہ کہ مجھے گنگو کا کوئی اتا پتا نہیں اور اگر ہو بھی تو نہیں بتاؤں گا۔" محمد مالک کی آواز میں ٹھہراؤ اور ایک طرح کی سختی تھی۔

"میں نے صرف ایک تجسس کے تحت کہا تھا، آپ کو کبھی مجبور نہیں کروں گا۔" اُس کی آواز میں شرمندگی تھی، "میرا یہاں سے تبادلہ ہو رہا ہے۔" محمد مالک نے ایک دم تحصیل دار کی طرف دیکھا۔ وہ قدرے دل چسپی کے ساتھ محمد مالک کو دیکھ رہا تھا۔

"کہاں جائیں گے؟" محمد مالک نے ایک جھجک سے پوچھا۔ اُس نے اچانک اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا۔

"لاہور۔"

"کس عہدے پر؟" محمد مالک نے دل چسپی کے بغیر پوچھا۔

"افسر آبادکاری۔"

اچھا عہدہ ہے؟"

"آنے والے وقت میں اچھا رہے گا۔"

"چودھری جی! ایک کام تھا آپ سے؟" محمد مالک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"حکم کریں!" تحصیل دار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"جب یہاں سے جانے کا وقت آئے تو آپ فوج کی حفاظت میں نکلوا دیں۔"

محمد مالک کو اپنی آواز پر یقین نہ آیا، اُسے یہ ایک التجا لگی۔

"ٹھیک ہے۔ وہاں ایک کمپنی میرے لیے رکھی گئی ہے، میں اُسے استعمال کروں گا گو یہ غیر قانونی ہو گا۔"

محمد مالک احتجاج کے لیے منہ کھولنے لگا تھا لیکن پھر اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

"چودھری صاحب ایک تو گنگو والی بات کا بُرا نہ ماننا، مجھے آپ کو کہنا ہی نہیں چاہیے

تھا۔ میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو یہی جواب دیتا اور اگر آپ میری جگہ ہوتے تو ایسا تقاضا ہی نہ کرتے۔ دوسری بات یہ کہ میں آپ کو حفاظت سے لاہور پہنچا دوں گا۔ آپ اپنا خیال رکھنا۔ جو لڑائی آپ لڑنا چاہتے ہیں اتنی اہم نہیں ہے، شاید آپ کے لیے ہو۔'' تحصیل دار اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دیر تک محمد مالک کو دیکھتا رہا۔ اُس کے خاندان کے اِس کے خاندان کے ساتھ تعلقات محبت، احترام اور خاندانی رواداری پر قائم تھے۔ آج پتا نہیں کیوں حافظ آباد کے تارڑ کے بجائے اُس کے اندر ایک افسر بول اُٹھا؟ اُسے ہاتھ ملانے سے اُلجھن آتی تھی، اپنی ملازمت کے سلسلے میں اُسے روزانہ اتنے ہاتھ ملانے پڑتے تھے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اُس نے ہاتھ ملانا موقوف کر دیا۔ اُس نے محمد مالک سے بھی ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ آج تحصیل دار نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا، محمد مالک کو بھی یقین نہ آیا پھر وہ سمجھ گیا کہ یہ الوداعی مصافحہ ہے۔ تحصیل دار نے پہلے ایک جھجک اور پھر گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ بڑھایا، محمد مالک کو ایسے لگا کہ وہ تحصیل دار کو پہلی مرتبہ مل رہا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنائیت سے ملتا آیا تھا لیکن اِس اپنائیت میں ایک دوری ہوتی تھی جو اِس وقت نہیں تھی۔ محمد مالک نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''چودھری صاحب! انگریز نے عام آدمی کو رتبہ دینے کی کوشش کی، اُس نے اُنھیں افسر تو بنا دیا لیکن خاندانی نہیں بنا سکا۔ آپ نے اپنے خاندانی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کے اندر کا افسر مات کھا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت تکلیف دہ بات تھی۔'' محمد مالک، تحصیل دار کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا۔ پھر تحصیل دار نے اُسے ساتھ لگایا اور گلے ملنے کے بعد دونوں باہر آ گئے جہاں شام ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ تحصیل دار کا عملہ انتظار میں کھڑا تھا اور دونوں کو نکلتے ہوئے دیکھ کر اُن میں ایک دم زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ محمد مالک نے اچانک اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا۔ اُس نے تحصیل دار سے کبھی غیر ضروری کام نہیں لیا تھا لیکن اُس کی موجودگی ایک ستون کی طرح تھی اور اُس نے ہمیشہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا تھا۔ تھڑے پر دونوں نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا، پیار میں رچی ہوئی یہ مسکراہٹ ایک اُداسی لیے ہوئے تھی۔ شاید دونوں ہی اِس اُداسی کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تحصیل دار کو اُس کے عملے کے دو آدمیوں نے گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی۔

زندگی معمول پر آ گئی لیکن ایک کھچاؤ تھا کہ ہر طرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ لوگ رات

بیٹھکوں میں بیٹھتے، حقوں کے کش لیتے، کھانستے، بات
خوف تھا جو ہر سوچ کو دبائے ہوئے تھا۔ اُنھیں اپنی عور
خود کو بھی اجنبی سمجھنے لگے۔ کیا یہ زمین جو اُن کی تھی اب
کے علاوہ کسی عورت سے بہلتا نہیں اِسی طرح اُنھیں ص
نہیں، بیوی، بہن، بیٹی اور محبوبہ تھی۔ وہ اُن کے لیے ا
زندگی کرنا سکھاتی، یہ اُس کے خم کھولتے اور وہ ایک ادا
اُن کی محبوبہ تھی۔ کیا اب اُسی ماں کے تھنوں میں زہر بھر
نکلتے تھے کہ وہ اُن کے قرب سے خائف تھی؟ کیا اُنھیں
اُنھیں اپنی چھاتی سے لگا کر وہ حدت پہنچا سکے گی جس کے

محمد مالک کا مسئلہ اِن سے مختلف تھا۔ اُسے ز
میں نکلنے سے کوئی سروکار نہیں تھا، اُس کے ذہن پر جنگ
پہلے ہی یہاں آباد ہو کر دشمنوں کے بجائے قدرت کے عنا
ہمت، دلیری، موقع شناسی، ذہانت اور چرب زبانی سے ا
اکٹھی کر لی تھی کہ سرکار بھی اُس کے وجود کو تسلیم کرتی۔ سرکا
کے باپ کو دلی میں مدعو کیا گیا تھا۔ زمین تو وہ محبوبہ تھی جس
جب اُس سے بچھڑنے کا وقت آ رہا تھا تو وہ ایک سچے عاشق
سے مٹا دینا چاہتا تھا خواہ اپنی جان کیوں نا چلی جائے۔ کیا
زیان کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اُس نے اِس معرکے میں
تحصیل دار کا فوجی دستہ کسی مرحلے میں آ کر اُس کے غیر فوجی
پر ایک بھاری بوجھ تھا جو اب نہیں رہا تھا۔

عبدالرشید اور حسنات بی بی نے ایک دوسرے
شادیاں کبھی ناکام نہیں ہوئیں تھیں لیکن سوائے بوچہ مل کے
نہیں تھا اور غالباً اُس کی ہر نسل میں ایک اولاد پیدا ہونے کی
سلسلے کو ختم کرے اور ایک سے زیادہ اولاد اُن کے صحن میں ک

جلدی ہو سکے عبدالرشید اور حسنات کو لکیر پار کروادے۔ کیا عبدالرشید اُسے وہاں چھوڑ کر
پر راضی ہو جائے گا؟ کیا حاجرہ اُس کے بغیر چلی جائے گی۔ یہ مسائل تھے جو اُس
کریدتے رہتے، وہ ان کے بارے میں سوچتا ضرور لیکن اہمیت نہ دیتا کیوں کہ اُس۔
اور رتبہ ایسے مسائل سے بلند رکھا ہوا تھا اور وہی ہوتا جو وہ چاہتا اور وہ وہی چاہتا تھا جو اُ
بہتر ہو۔ یہ معرکہ وہ اکیلا ہی لڑے گا کیوں کہ اُس کی ذاتی جنگ تھی، عبدالرشید وقت آ
جنگیں لڑے گا جو شاید اِس جنگ سے بھی شدید ہوں۔ یہ جنگ لڑنا کہیں اُس کی شکست
وہ ثابت کیا کرنا چاہتا تھا؟ یہی کہ وہ اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ جانے کے باوجود اُنھیں
کر کے جا رہا تھا۔ رائے بوچل جب یہاں آباد ہوا تو وہ تہی دست تھا اور پھر اُس نے
جھولی بھری۔ آج کئی نسلوں کے بعد وہ اُسی طرح جا رہا تھا جیسے بوچل یہاں آیا تھا، اکیلا

گنگو سے اُس کا کوئی رابطہ نہیں تھا، وہ جہاں بھی ہے سلامت رہے۔ وہ اُ
حصہ رہا ہے جس نے گنگو کو جنم دیا لیکن وہ گنگو کے ساتھ تھا، وہ اُسے کامیاب دیکھنا چاہتا
کامیابی کیا تھی؟ اِسی طرح زندہ رہنا، اپنی جان کو بچاتے ہوئے! وہ ایک عرصے سے مف
یہی فرار اُس کی زندگی ہے۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جنگلوں اور بیلوں میں چ
زندہ تھا اور شاید وہ یہی زندگی جینا جانتا تھا۔ کیا وہ ایک ترتیب میں ڈھلی ہوئی زندگی
گا؟ شاید نہیں! اُسے گنگو کی اتنی فکر کیوں تھی؟ صرف اِس لیے کہ وہ اُسے اطلاعات پ
! گنگو جیسے کئی لوگ سرکار کے تشدد کا نشانہ بنے ہوں گے لیکن صرف اُس نے ہی سرکار کو وا
دیا؛ شاید اِس لیے گنگو اُسے پسند تھا۔ اُس نے خود سرکار سے کبھی بغاوت نہیں کی تھی؛
سرکاری طور پر سرکار کا وفادار رہا، ممکن ہے اُس کے اندر ایک باغی تھا جسے گنگو کی بغاوت
ہو۔ گاؤں پر حملہ آور ہونے والوں کے خلاف مورچہ بند ہونا شاید اُس کی وہ بغاوت تھی
سے اُس کے اندر سلگ رہی تھی۔

زندگی معمول پر آنے کے باوجود معمول پر نہیں تھی!

ہر طرف افواہوں کا ایک سیلاب تھا جس میں سب بہے جا رہے تھے۔ یہ افو
ساتھ ایک بے یقینی اور خوف لاتیں جو بعض اوقات اُس کے ارادے کو متزلزل کر دیتیں
: کیا لڑنا ضروری ہے؟ اگر وہ مارا گیا تو کیا اُس کا خاندان نئے ملک میں اپنے لیے جگہ بنا

کا سوچتے لیکن بولتے کچھ نا، ایک
رہو گئیں، زمین بیگانی لگنے لگی اور وہ
جائے گی؟ جس طرح ایک بچہ ماں
ن سے پیار تھا۔ وہ اُن کی ماں ہی
رتی، اُنھیں زندہ رہنے کے لیے
کے ساتھ اُن پر مسکراتی جاتی کہ
ن کی مردانگی سے زہر کے فوارے
ی ضرورت تھی؟ نئی ماں یا محبوبہ

ہیں؟
چھن جانے یا نئی زمین کے کھوج
رائے بوچل آخری معرکے سے
ساتھ نبرد آزما رہا اور اُس نے اپنی
ور اپنی نسلوں کے لیے اتنی زمین
کے ولی عہد کے دربار میں اُس
نے کا کبھی سوچا نہیں تھا اور اب
ح رقیبانِ روحِ سیاہ کو صفحۂ ہستی
بلہ درست تھا؟ اب وہ سود اور
الفوں کی طاقت کو آزمانا تھا۔
لے جائے گا؛ یہ اُس کے ذہن

ر لیا تھا۔ اُس کے خاندان کی
ید اپنی بیوی کے ساتھ لگاؤ ہی
ں! ممکن ہے کہ عبدالرشید اِس
مارے۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنا

اُسے صرف اپنے خاندان کے لیے ہی زندہ رہنا ہے؟ کیا اُس کا اپنا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا؟ کیا اُسے صرف اِس لیے زندہ رہنا چاہیے کہ وہ اپنے خاندان کی نگہداشت کر سکے؟ کیا اُس کے اپنے کوئی آدرش نہیں؟ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سربراہ کے مرنے کے بعد خاندان دنیا میں اپنا مقام کھو بیٹھا ہو؟ یہ تو بہتے پانی والا سلسلہ ہے جس نے ایک رفتار سے بہتے ہی چلا جانا ہے، ہر رکاوٹ کو راستے سے ہٹاتے ہوئے! اگر وہ اِس لڑائی میں مارا بھی گیا تو عبدالرشید اتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے کہ اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ نئی زندگی کو آگے چلا سکے گا۔ وہ مطمئن ہو جاتا اور گاؤں کے دفاع کی تیاریوں میں جُٹ جاتا۔

زندگی معمول پر آنے کے باوجود معمول پر نہیں تھی!

اُسے شاید وہم کی بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ اُسے فضا میں ہر وقت چھروں کی شوکر سنائی دیتی رہتی، بعض اوقات لگتا کہ کوئی چھرہ اُس کی آنکھ، کان، ہونٹ یا کسی اور عضو کو زخمی کر گیا ہے۔ بعض اوقات یہ آوازیں اتنی شدت اختیار کر جاتیں کہ اُسے بچنے کے لیے کسی آڑ کے پیچھے پناہ لینا پڑتی اور وہاں چھپتے ہی وہ محفوظ ہو جاتا۔ وہ اُس درخت، دیوار، کوٹھے یا دھڑ کے پیچھے سے نکل کر خجل سا چوفیرے دیکھتا کہ اُس کا بھانڈا تو نہیں پھوٹ گیا؟ وہ اُن جگہوں سے نکلتے ہوئے یہی تاثر دیتا کہ اپنا مثانہ خالی کر رہا تھا۔ ایسے لمحات میں وہ ایک ناقابلِ بیان اذیت میں سے گزرتا اور اپنی تکلیف کو کم کرنے کے لیے پرانے فوجیوں سے رابطہ کرتا۔

''جتنی تیزی سے ممکن ہے ہم اِن نوجوانوں کی تربیت کر رہے ہیں۔'' اُن میں سے جو عمر میں سب سے بڑا تھا، کہتا۔

''مجھے کوئی شک نہیں تم لوگوں کی محنت اور خلوص پر۔'' محمد مالک کی آواز میں سچ کی گونج ہوتی۔

''چودھری صاب! محنت کر رہے ہیں۔ میرے وقت میں کہا جاتا تھا کہ رنگروٹ اور بوٹ کو جتنا رگڑو اُتنا ہی چمکے گا۔ ہم بھی اِسی فوجی کہاوت پر کام کر رہے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا۔ محمد مالک کو یہ بات سمجھ نہ آتی مگر وہ سب کچھ جاننے والے کی طرح مسکرائے جاتا۔

''ہم اِن کو نکے میں سے نکال کر آپ کو دیں گے۔'' وہ اعتماد سے کہتا تو باقی اُستاد جو ایک طرح لاتعلقی سے باتیں سن رہے ہوتے، فوراً بلند آواز میں کہتے، ''بے شک، بے شک۔''

محمد مالک کو فوری حوصلہ ملتا اور اُسے اپنے کانوں میں چھروں کی شوکر آنا بند ہو جاتی۔ وہ

مطمئن سا، دیوان خانے میں ایک چکر لگانے کے بعد حویلی میں جا کر مویشیوں پر اُداسی سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالتا۔ کئی بھینسیں ایسی تھیں جن کی پانچویں نسل وہاں کلے پر بندھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ تمام مال حویلی میں ہی رہ جانا ہے۔ گھوڑیوں کا وہ کیا کرے؟ کیا اُنھیں کلے پر بندھا چھوڑ جائے یا اُن کے رسے یا زنجیر کھول کر آزاد کر دے تا کہ وہ اپنی مرضی کا مالک ڈھونڈ لیں۔ کیا ایسا کرنا ممکن ہوگا؟ وہ کھڑا اُنھیں دیکھتا رہتا اور لمبی سانسیں کھینچتا رہتا۔ نوکر اُس کی موجودگی کو اہمیت دیے بغیر چارہ کترنے میں مصروف ہوتے اور مویشی اپنی کھرلیاں بھرے جانے کے انتظار میں جگالی ترک کر چکے ہوتے۔ اُسے یہ سب چھوڑ کر کسی نامعلوم بستی میں آباد ہونے سے ڈر آرہا تھا لیکن اُس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

زندگی معمول پر آنے کے باوجود معمول پر نہیں تھی!

گاؤں میں ایک ہی مسجد تھی جو اورنگ زیب کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھی اور مسجدِ اورنگ زیبی کے نام سے مشہور تھی۔ مسجد میں کوئی بھی نماز پڑھنے نہیں آتا تھا سوائے شریف جولاہے کے جس کا گھر مسجد کے سامنے تھا اور وہ فجر کی نماز سے پہلے صحن میں جھاڑو لگاتا اور ہر نماز سے پہلے اذان دیتا۔ وہ ایک بے سُری اذان ہوتی جس کے لوگ اتنے عادی ہو گئے تھے کہ وہ جب کسی گاؤں میں سُر میں دی گئی اذان سنتے تو اُنھیں مایوسی ہوتی کہ یہ موؤزن کتنا بے سُرا ہے! لیکن جب سے بے یقینی شروع ہوئی وہاں رونق ہونے لگی تھی۔ مسجد کا صحن کھلا اور گنبد بلند تھے، مغرب سے پہلے لوگ وہاں آکر بیٹھ جاتے، اُنھیں نماز سے غرض نہیں تھی، وہ ایک سہارے کی تلاش میں آتے تھے اور وہاں لوگوں کی موجودگی اُنھیں طاقت دیتی۔ محمد مالک سماجی عمل کے طور پر عید اور نمازِ جنازہ ادا کرتا تھا اور ایک دن وہ بھی مسجد میں آگیا۔ وہ جھجکتا ہوا مسجد میں داخل ہوا تو صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا؛ کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے تو کچھ کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے، کچھ لیٹے ہوئے کسی کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھے تو کچھ اپنی ہی سوچوں میں گم اور کچھ ملکی حالات کو جانتے ہوئے خاموشی کو ترجیح دیے ہوئے تھے۔ وہاں سنجیدگی میں گندھی ہوئی ایک رونق تھی اور اُسے غیر سنجیدہ رونق پسند تھی:

''کوئی حقہ ہی لے آتا؟'' محمد مالک نے خوش مزاجی سے کہا۔

''مولوی سے اجازت لے کے پکڑ لاتے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

"وہ مولوی تھوڑا ہے!" کسی طرف سے آواز آئی۔

"کیا ہے؟" پوچھا گیا۔

"بانگی!" جواب آیا۔

"دعا تو کر سکتا ہے!" ایک سنجیدہ سی رائے دی گئی۔

"قبول نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟"

"بانگ دینے کے پیسے نہیں لیتا، اس لیے۔"

اُسی وقت شریف نے گلا صاف کیا اور مغرب کی اذان دینے لگا، ہر کوئی خاموش ہوگیا اور مسجد کا صحن ایک بھاری خاموشی سے بھر گیا؛ صرف شریف جولاہا اذان دیتا رہا۔

اُس کے بعد ہر شام لوگ اپنے اپنے خوف سے چھٹکارا پانے کے لیے مسجد میں آبیٹھتے اور اُنھیں اپنے اردگرد ایسی طاقت کا احساس ہوتا جو بوقتِ ضرورت اُنھیں بچالے گی۔ محمد مالک پہلی مرتبہ وہاں لوگوں کے بیٹھنے کی وجہ معلوم کرنے آیا تھا اور لوگوں کے وہاں بیٹھنے کے انداز نے اُسے ایسی عقیدت سے بھر دیا جس سے اُس کی شناسائی نہیں تھی۔ وہ مسجد میں آکر خود کو محفوظ سمجھتا اور اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی مخالف اُسے شکست نہیں دے سکتا۔ اُسے خیال آیا کہ وہاں بیٹھنا اُس کی کامیابی کی نشانی نہیں جب تک وہ کامیاب ہونے کی کوشش جاری نہ رکھے۔ مسجد میں طاقت حاصل کرنے کے لیے اُس کا آنا تو سمجھ آتا تھا لیکن وہاں چھپنا ایک فرار تھا اور فرار میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ اُسے نا صرف خود کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہنا تھا، اُسے دوسروں کو بھی زندگی کا سامنا کرنے کے لیے قائل کرنا تھا۔ وہ اگر اُنھیں مسجد میں آنے سے منع کرے تو اِس تجویز سے وابستہ خلوص کو وہ سمجھ نہیں پائیں گے۔ اُس نے شریف کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

شریف اُس کے پیغام کے جواب میں جلد ہی دیوان خانے میں پہنچ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب زمین دار مویشیوں کے لیے چارہ کاٹنے، کترنے، پانی پلانے اور پیشہ ور کاریگر اپنے پیشوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ محمد مالک، شریف کے اُس وقت فوری طور پر آجانے سے متاثر ہوا۔

"شریف! کیا کر رہے تھے؟" محمد مالک نے جھجکتے ہوئے بیان کے انداز میں سوال کیا۔

شریف نے ہاتھ بڑھا کر حقہ اپنی طرف کھینچا اور جواب دینے سے پہلے ایک کش

لیا، ''بس چودھری جی ! مصروف ہی تھا۔'' شریف نے ایک اور کش لیتے ہوئے بات جاری رکھی، ''یہ اپنا ہی وقت ہوتا ہے۔کھڈی پر تھان چڑھایا ہوا ہے، چند وار دیے تھے۔'' شریف نے جواب دیا۔محمد مالک کو شریف کا احساس ذمے داری پسند آیا۔لوگ جب غیبی طاقت حاصل کرنے کے لیے مسجد میں پناہ لے رہے تھے تو یہ مسجد کا امام ہونے کے باوجود اپنا عہد نبھا رہا تھا۔

''کسی کے لیے بنا رہے ہو؟'' محمد مالک نے بات کو طول دینا چاہا۔

''نہیں! چودھری۔''

''پھر؟'' محمد مالک کے لہجے میں تجسس تھا۔

''میں پیشہ ور کپڑا بنانے والا ہوں اور دن کا کچھ حصہ کھڈی پر گزارتا ہوں۔''

''کیا بنا رہے تھے؟''

''کھدر!''

محمد مالک تھوڑا سا مسکرایا۔اُسے بھی کھدر کی ضرورت تھی لیکن اِن حالات میں وہ کرتے کے لیے کپڑے کا نہیں کہے گا۔

''محمد شریف! ایک کام تو کرو۔''

محمد مالک نے محتاط سے انداز میں پوچھا، ''جی؟''

''گاؤں کے لوگ ایک دم مسجد میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ مسجد کی حفاظت میں چھپ سے گئے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کو سمجھیں اور مخالفوں سے مقابلے کا سوچیں۔وہ نماز کے وقت ضرور آئیں اور پڑھیں بھی، میں بھی پڑھا کروں گا تا کہ اتفاق کی فضا قائم رہے۔'' محمد مالک نے اپنی بات کو شریف پر اثر کرنے کے لیے چند لمحوں کی خاموشی کو ترجیح دی۔شریف حقے کی نے کو تھامے کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا، محمد مالک غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔شریف نے پھر کش لیا اور محمد مالک کی طرف دیکھا۔

''چودھری جی ! مسجد خدا کا گھر ہے۔میں کسی کو آنے سے کیسے روک سکتا ہوں؟'' شریف نے شکائیتی لہجے میں کہا۔

''روکنا کیوں ہے؟ وہ ضرور آئیں، نماز کے لیے اور بس..... چھپنے کے لیے نہیں۔'' محمد مالک کے لہجے میں پہلے والی مٹھاس نہیں تھی۔''وہ دراصل بزدل ہو گئے ہیں۔اُنھوں نے اپنے

معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا ہے، انھیں بتانا ہے کہ بزدلی کے بجائے دلیری کی ضرورت ہے اور ہم نے کامیابی حاصل کرنی ہے۔''

''میں آنے سے منع کرنے کے بجائے انھیں اپنے کاموں میں دلچسپی لینے کو کہوں گا......''

''جس طرح،'' محمد مالک نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''تم نے کھڈی پر کام نہیں چھوڑا۔''

شریف تھوڑا سا مسکرایا۔ اُس کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا، ''وہاں زیادہ زمین دار ہی آتے ہیں۔ پیشہ وروں نے تو کر کے کھانا ہے۔''

محمد مالک نے شریف کے طنز کو اتنی اہمیت نا دی، اُس نے شریف کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر اپنی کہی، ''میرا مسئلہ انھیں اپنی موجودہ صورتِ حال کو سمجھانا ہے۔ ہم نے اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے اور اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے اندر مدافعت ہونی چاہیے جو مسجد کے صحن میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔''

''مقابلہ کیسے کیا جائے گا؟'' شریف نے اپنے تجسس کو چھپاتے ہوئے ایک جھجک سے پوچھا۔

''جیسے کرتے ہیں!'' محمد مالک نے سختی سے کہا۔ اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جواب سے شریف ایک دم سکڑ سا گیا ہے۔ اُسے اپنے لہجے کی درشتی پر افسوس ہوا، ''میرا مطلب ہے کہ ہم نے اپنے گاؤں کا دفاع کرنا ہے اور ہم نے جانے سے پہلے ایک کہانی چھوڑ کر جانی ہے تا کہ ہمارے بعد اِس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں یاد رکھیں۔'' اُس نے ایک طرح سے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''میں کسی کو روک تو نہیں سکتا، ہاں نماز کے بعد دروازہ بند کر دیا کروں گا۔'' شریف نے وضاحت کی۔

''نہیں، دروازہ بند کرنا حل نہیں ہے محمد شریف!'' محمد مالک نے بگڑتے ہوئے کہا، ''تم انھیں سمجھاؤ۔ کل کہو گے کہ مسجد کو تالا لگا دوں گا تا کہ کوئی وہاں آئے ہی نا۔ اب میری بات غور سے سنو!'' محمد مالک کے لہجے میں ایک دم مٹھاس آ گئی، ''دروازہ بند کرنا یا تالا لگانا تو میرا کام بنتا ہے، تمھارا نہیں۔ تم نے انھیں قائل کرنا ہے۔''

شریف نے شکست کھائی ہوئی نظر کے ساتھ محمد مالک کی طرف دیکھا؛ ایسے لگ رہا تھا

معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا ہے، اُنھیں بتانا ہے کہ بزدلی کے بجائے دلیری کی ضرورت ہے اور ہم نے کامیابی حاصل کرنی ہے۔''

''میں آنے سے منع کرنے کے بجائے اُنھیں اپنے کاموں میں دل چسپی لینے کو کہوں گا......''

''جس طرح،'' محمد مالک نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہنا شروع کیا،'' تم نے کھڈی پر کام نہیں چھوڑا۔''

شریف تھوڑا سا مسکرایا۔ اُس کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا،'' وہاں زیادہ زمین دار ہی آتے ہیں۔ پیشہ وروں نے تو کر کے کھانا ہے۔''

محمد مالک نے شریف کے طنز کو اتنی اہمیت نا دی، اُس نے شریف کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر اپنی کہی،'' میرا مسئلہ اُنھیں اپنی موجودہ صورتِ حال کو سمجھانا ہے۔ ہم نے اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے اور اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے اندر مدافعت ہونی چاہیے جو مسجد کے صحن میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔''

''مقابلہ کیسے کیا جائے گا؟'' شریف نے اپنے تجسس کو چھپاتے ہوئے ایک جھجک سے پوچھا۔

''جیسے کرتے ہیں!'' محمد مالک نے سختی سے کہا۔ اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جواب سے شریف ایک دم سکڑ سا گیا ہے۔ اُسے اپنے لہجے کی درشتی پر افسوس ہوا،'' میرا مطلب ہے کہ ہم نے اپنے گاؤں کا دفاع کرنا ہے اور ہم نے جانے سے پہلے ایک کہانی چھوڑ کر جانی ہے تاکہ ہمارے بعد اِس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں یاد رکھیں۔'' اُس نے ایک طرح سے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''میں کسی کو روک تو نہیں سکتا، ہاں نماز کے بعد دروازہ بند کر دیا کروں گا۔'' شریف نے وضاحت کی۔

''نہیں، دروازہ بند کرنا حل نہیں ہے محمد شریف!'' محمد مالک نے بگڑتے ہوئے کہا،'' تم اُنھیں سمجھاؤ۔ کل کہو گے کہ مسجد کو تالا لگا دوں گا تاکہ کوئی وہاں آئے ہی نا۔ اب میری بات غور سے سنو!'' محمد مالک کے لہجے میں ایک دم مٹھاس آ گئی،'' دروازہ بند کرنا یا تالا لگانا تو میرا کام بنتا ہے، تمھارا نہیں۔ تم نے اُنھیں قائل کرنا ہے۔''

شریف نے شکست کھائی ہوئی نظر کے ساتھ محمد مالک کی طرف دیکھا؛ ایسے لگ رہا تھا

مغرب کی نماز میں ابھی تھوڑا وقت تھا اور روزانہ وہاں جمع ہونے والے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ شریف بار بار اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بے چینی کے ساتھ محمد مالک کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ محمد مالک کو بچپن میں کھیلے جانے والی آنکھ مچولی لگی کہ ایک فریق دوسرے سے چھپ رہا ہے۔ محمد مالک اُس سے آنکھ ملانے سے کترا رہا تھا کہ یہ کوئی اشارہ نہ سمجھا جائے۔ پھر شریف نے اونچی آواز میں گلا صاف کیا اور محمد مالک کی طرف دیکھتے ہوئے، جو بظاہر کسی کی بات کو غور سے سن رہا تھا، کھڑا ہو گیا۔

''بھائیو! میری بات غور سے سنو!'' شریف نے کسی حد تک کم اعتمادی سے کہا۔

''اذان دو محمد شریف! ہمیں کیا بتانا ہے؟'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی، اذان دو۔''

''ہم سب جانتے ہیں! اذان دو۔'' ادھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔ شریف جو کچھ دیر پہلے تک محمد مالک کے دباؤ تلے اُس کی زبان میں بات کرنا چاہتا تھا، اچانک اُسے درست سمجھنے لگا۔ سب لوگ نماز کی ادائی کے بجائے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اگر نماز ادا کرنی تھی تو کام کرتے ہوئے اپنے کھیتوں میں بھی کر سکتے تھے۔ پرانے مسلمان تو جنگ روک کر بھی سجدہ ریز ہو جایا کرتے تھے اور ایک یہ لوگ ہیں کہ کسی قسم کی جنگ سے پہلے ہتھیار پھینک کر مسجد میں پناہ گزین ہو چکے ہیں۔

''میری بات غور سے سنو!'' اِس مرتبہ اُس کی آواز میں اعتماد تھا اور سب لوگ اپنی کھسر پھسر چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے جیسے اُس سے خائف ہو گئے ہوں۔ مسجد کے صحن میں احترام میں ڈوبی ایک خاموشی پھیل گئی۔ سب ایک طرح حیرت کے ساتھ شریف کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''میری بات غور سے سنو!'' اُس نے دہرایا، ''مسجد نماز کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوتی تھی، میں اِس کو سنبھالتا تھا اور ہمیشہ مجھے مذاق سہنے پڑتے۔ میں جواب میں ہمیشہ ہنس دیتا کیوں کہ مجھے تم

لوگوں کی کم علمی کا پتا تھا۔ پھر تم مسجد میں آنے لگے، اِس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ اِس وقت میں مسجد کے صحن میں ہوں اور تم لوگ بھی۔ مسجد میں کبھی غلط بات نہیں کی جاتی۔ میں پوچھتا ہوں،" وہ رکا۔ اُس نے اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے محمد مالک کو ایک نظر دیکھا اور بات جاری رکھی،" میں پوچھتا ہوں، کیا تم لوگ یہاں نماز کے لیے آتے ہو؟" وہ رکا۔ سب لوگ اُس کے ساتھ نظر ملانے سے کترانے لگے۔ محمد مالک نے سر کو ہلکے سے اثبات میں جنبش دی۔ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو وہ جواب سمجھے ورنہ یہ شریف کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا۔ شریف نے بھی اپنے اندر ایک طاقت محسوس کی، "یقیناً آتے ہوگے۔ میں خدا کے گھر میں آنے والوں کو اور کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن تم لوگوں کا یہاں چھپ کر بیٹھنا مناسب نہیں۔ ضرور بیٹھو، نماز ادا کرو اور اِس کے علاوہ بھی کچھ سوچو!" اب وہ مکمل اعتماد میں تھا،" تم لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے مت بیٹھو۔ ہم نے کسی کی جان نہیں لینی لیکن اپنی جان بچانا ہمارا فرض ہے اور خدا کا بھی یہی حکم ہے۔" غصے اور جوش سے بولنے کی وجہ سے اُس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ دمے کے مریض کی طرح ہانپ رہا تھا۔

محمد مالک نے ہاتھ اُٹھا کر شریف کو رکنے اور اپنی بات کرنے کا اعلان کیا۔

"جو ابھی شریف نے کہا، میں بھی کہنا چاہتا تھا۔ حرکت انسان کی بنیادی ضرورت ہے کیوں کہ حرکت میں برکت ہے۔ ہم لوگ حرکت کو چھوڑ کر مسجد کے صحن آن بیٹھے ہیں۔ ہمارے اپنے مسائل ہیں جنھیں ہم نے حل کرنا ہے نا کہ ریت میں سر دے کر چھپنا ہے۔ یہاں آئے، نماز پڑھی اور باہر جا کے اپنی زندگی میں مصروف ہوگئے۔ یہاں چھپ کر بیٹھنا مردوں والا کام نہیں،" وہ آہستہ سے ہنستے ہوئے رکا،" اور نہ گھروں میں بیٹھنا۔ مرد کو باہر نکلنا چاہیے۔ ہم سب کو چاہیے کہ پرانے وقتوں کی طرح جئیں۔"

"چودھری! ہم اُس طرح کیسے جی سکتے ہیں؟" ایک طرف سے اعتراض آیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" محمد مالک نے اپنی آواز میں دلچسپی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"حالات تبدیل ہوگئے ہیں۔ ہماری زندگیوں کو خطرہ ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہماری زندگیوں کو جس سے خطرہ ہے اُس کی زندگی کو ہم سے بھی خطرہ ہے۔" محمد مالک نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا۔

"ہم سے کیا خطرہ ہوتا ہے؟ ہم نے تو آج تک پدی بھی نہیں ماری۔ پورے علاقے میں ہم سا شریف کوئی بھی نہیں تھا۔"

"ایک بات بتاؤں؟" محمد مالک نے سرگوشی سے قدرے بلند آواز میں کہا جس کا اُس کے سننے والوں پر مقناطیسی اثر ہوا، سب نے اپنی بے چینی اور پریشانی چھوڑ کر تمام تر توجہ اُس پر مرکوز کر دی۔ "آج جب ملک تقسیم ہونے والا ہے اور اردگرد قتل و غارت کی وارداتیں ہو رہی ہیں لیکن کسی کو ایک شریف گاؤں کی طرف آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اُس کی وجہ کہ ہم اُن کے لیے تیار ہیں۔ جو اِس طرف آئے گا زندہ واپس نہیں جائے گا۔ میں تم لوگوں کو ضمانت دیتا ہوں۔" محمد مالک نے سب کے چہروں پر نظر دوڑائی اور اُسے وہاں ایک یقین طلوع ہوتے محسوس ہوا۔ "اگر ہم یہاں رہے تو سب کو شکست دے کر اپنی زندگی جاری رکھیں گے اور اگر گئے تو بھی شکست دے کر جائیں گے۔" وہ پھر رکا اور اُس نے سب کے چہروں پر نظر دوڑائی، اُسے وہاں اپنا ہی عکس نظر آیا۔ "ہم حرکت میں یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ اِس رگڑو کو ہم نے آباد کیا اور یہ اُسی حرکت کی برکت ہے کہ اردگرد ہماری دھوم ہے؛ پہلے ہم محنتی، کمزور اور ایمان دار لوگ تھے اور آج ہم دلیر، اہم اور قابل نفرت سمجھے جاتے ہیں۔ شریف نے ہمیں اپنی پہچان کرانے کی کوشش کی ہے جس کے لیے اُس کا شکریہ۔ ہم اپنے کاروبار سنبھالیں اور جب کوئی بڑا فیصلہ کرنا پڑے تو دلیری کے ساتھ کریں۔"

شریف نے مغرب کی اذان دینا شروع کر دی، تمام لوگ صفوں میں کھڑے ہو گئے اور شریف نماز کی امامت کرنے لگا۔

چودہ اگست کو ملک تقسیم ہوا تو ماڑی بوچیاں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں کا اُس دن وہی معمول تھا جو تیرہ اگست کو تھا، ہالی اپنے ہل لے کر تڑکے اپنی زمینوں پر گئے، چارہ کاٹنے والے اپنی درانتیاں لے کر مویشیوں کے لیے اُس دن کا چارہ کاٹ کر لائے اور ساتھ اپنی دیگر مصروفیات کے بارے میں بھی سوچتے رہے۔ محمد مالک پریشان تھا لیکن اُس نے اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ اُسے گنگو کی طرف سے پیشگی اطلاع کا انتظار تھا اور ساتھ ہی دھڑکا تھا کہ گاؤں پر چپ چھپتے حملہ نہ ہو جائے۔ اِس کے لیے اُس نے فوجیوں سے مشورہ کیا جنھوں نے اونچے چوباروں پر نوجوانوں کو بٹھا کر دور دور تک دیکھتے رہنے کا کہا؛ ہر تین گھنٹے بعد نگرانی کرنے والے تبدیل ہوتے رہتے کیوں کہ یہ ایک اُکتا دینے والا کام تھا۔

دو ہفتے اسی کھچاؤ میں گزر گئے اور پھر محمد مالک پر ایک طرح سے ذہنی دباؤ کم ہونے لگا۔ وہ محسوس کرتا کہ مخالف قوتوں نے اُن کے وجود کو اپنا حصہ سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ زندگیوں کی ساجھے داری قبول کر لی ہے۔ اُس نے اپنے سابقہ فوجیوں سے پہرہ ہٹانے کو کہا تو انھوں سے سخت احتجاج کیا۔ اردگرد قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور آتش زدگی کے واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف سے بھی ایسی ہی خبریں آ رہی تھیں۔ انھوں نے محمد مالک کو مشورہ دیا کہ کسی نہ کسی دن ماڑی بوچیاں کی باری آنی ہے، دشمن صرف اُن کے صبر کا امتحان لے رہا ہے اور ساتھ ہی اُنھیں اپنی احتیاط ترک کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ محمد مالک کو اُن کی رائے کے ساتھ اتفاق نہیں تھا لیکن اُس نے اُنھیں مکمل طور پر رد بھی نہیں کیا۔

دو ہفتوں کے کھچاؤ کے بعد محمد مالک نے کمر سیدھی کر کے چلنا شروع کر دیا اور اُس کے ماتھے پر ہر وقت موجود رہنے والے بل غائب ہو گئے۔ اُس نے پیغام بھیج کر لوگوں کو ڈیرے پر بلانا شروع کر دیا؛ ڈیرے پر پرانے وقتوں کی رونق شروع ہو گئی۔ ٹھٹھہ مخول، ہنسی مذاق، گالی گلوچ، جھگڑے، لڑائی، ناراضیاں، روٹھنا اور ماننا ایک طرح سے از سرِ نو زندگی کا معمول بن گئے۔ محمد مالک یہ سب دل چسپی، پیار اور اپنائیت کے ساتھ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا اور بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ یہ دو ہفتے خواب کی طرح تھے؛ بہت نازک، بہت دل چسپ، بہت طویل، بہت مختصر، بعض اوقات بے سر و پا اور بعض اوقات انتہائی بامقصد، بعض اوقات اتنے گاڑھے اور گہرے کہ دم گھٹنے لگتا اور بعض اوقات اتنے عام کہ جی چاہتا کہ کبھی دوبارہ نہ آئیں۔

دو ہفتے گزر گئے اور ستمبر کا آغاز آ گیا۔ دریا سے آنے والی ہوائیں رات کو پانی کی ٹھنڈ بھی ساتھ لانے لگیں اور دن اتنے چھوٹے ہونا شروع ہو گئے کہ کام ہی نہ نمٹائے جاتے۔ کھیتوں میں کپاس کے پودے نظر آنا شروع ہو گئے اور گندم کی بیجائی کی تیاری ہونے لگی۔ دو ستمبر کی رات ابھی نہیں آئی تھی اور شام ڈھل چکی تھی کہ شتر سوار گاؤں میں داخل ہوا۔ اونٹ کی سواری ایک عجوبے سے کم نہیں تھی، منہ پر مڑا سا باندھے سانڈنی پر سوار چوک میں آیا۔ اُس کے پیچھے حیران، متجسس اور بے یقین بچے آ رہے تھے۔ اُنھوں نے اُسے نکیل کھینچ کر چخ چخ کہتے ہوئے سانڈنی کو بٹھاتے دیکھا اور جب وہ بیٹھ رہی تھی تو دلچسپی اور خوف سے اُسے چھوتے اور یقین کرنے کے بعد پھر چھوتے۔ سوار چھلانگ لگا کر، بچوں سے بے خبر، نیچے اُترا اور تیز قدموں سے

سیڑھیاں چڑھ گیا۔ بچوں میں سانڈنی اور اُس کے سوار کے متعلق سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی تھیں جب کہ تھڑے پر سوار، محمد مالک کو ایک طرف لے گیا۔ اُس نے سرگوشی کی:

''بھائیا! پرسوں صبح کسی وقت حملہ ہوگا۔ تیاری رکھنا۔''

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اُسی رفتار سے سیڑھیاں اُترا، سانڈنی اُسے آتے ہوئے دیکھ کر کھڑی ہونا شروع ہوگئی اور وہ کھڑے ہوتی اونٹنی پر سوار ہوگیا۔ بچے ابھی اپنی حیرت پر قابو بھی نہ پا سکے تھے کہ وہ اندھیرے میں گم ہوگیا۔

محمد مالک کو لگا کہ اُسے سکون آگیا ہے، جیسے وہ اِس خبر کے انتظار میں تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایسے محسوس کیا کہ وہ اُس گھوڑے کی طرح ہے جو شتری ہی چلے جانا چاہتا ہے۔ اُسے اپنے دماغ میں منصوبوں کے جالے بنتے اور کھلتے محسوس ہوئے۔ اُس نے خبر کو فی الحال اپنے تک رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن فوجیوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ ایلچی کے جانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ اُس نے ظاہر کیا کہ آنے والا معمول کی ملاقات کے لیے آیا تھا اور اُس کے جانے کے بعد وہ پھر وہی سننے لگا جو منقطع ہوگیا تھا۔ اِسی دوران میں اُس نے کسی کے ذریعے فوجیوں کو پیغام بھجوا کے وہاں بیٹھے لوگوں کو اشارۃً اُٹھنے کا کہا۔ لوگ شرمندہ سے اُٹھ گئے اور فوجیوں کے آنے تک دیوان خانے میں وہ اکیلا تھا اور اِس جگہ کو چھوڑ کر جانے پر اُس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ یہ جگہ جو اُن کے وقار اور طاقت کی علامت تھی اُس میں وہ کسی رات کی تنہائی میں، چپکے سے نکل جائے گا اُس چور کی طرح جو کسی غریب گھر میں گھس گیا ہو۔ اِس جگہ پر انگریز افسر آئے اور دیسی افسر بھی، یہاں جائیدادوں، لڑائیوں اور مقدموں کے فیصلے ہوئے اور وہ اپنے وقار کی علامت کو کسی کو سونپے بغیر ہی نکل جائے گا۔ اُس نے کسی طرح تحصیل دار سے بھی رابطہ کرنا ہے کہ وہ جلد از جلد اُن کے لیے فوجی گاڑیاں بھیجے۔ اُس کے ذہن میں تحصیل دار کا ملازم آیا جو شاید ابھی وہیں ہو، وہ صبح ہی کسی کو پیغام دے کر بھیجے گا۔

فوجی آگئے اور وہ سب دو چار پائیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''تھوڑی دیر پہلے گنگو کا آدمی آیا تھا۔'' محمد مالک نے دھیمی آواز میں بات شروع کی، اُس کی دھیمی آواز میں موقع کی نزاکت کا بھاری پن تھا۔ 'وہ بتا گیا ہے کہ پرسوں صبح کسی وقت حملہ ہوگا۔'' وہ رکا تا کہ سب سوچ کے ایک مقام پر آجائیں، ''اب ہم نے دو کام ایک ہی وقت میں

کرنے ہیں۔ تم لوگ لڑو گے اور میں گاؤں خالی کرواؤں گا۔"

"ٹھیک ہے چودھری! لیکن تمھارا یہاں ہونا بھی ضروری ہے۔" ایک فوجی نے رائے دی۔

"میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں تو بوڑھ والے کھوہ کے کوٹھے کی چھت پر بیٹھوں گا۔"

محمد مالک نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔

"وہ اچھی جگہ ہے، محفوظ بھی اور اہم بھی۔"

محمد مالک کو لگا کہ وہ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔

"یہ تو نہیں پتا چلا کہ حملہ کس طرف سے ہوگا؟"

"نہیں!"

"پرسوں صبح اگر حملہ ہے تو کل رات ہمیں اپنی پوزیشنوں میں ہونا چاہیے۔" ایک فوجی نے باقیوں کو مخاطب کیا۔

"میں اتنا تو نہیں جانتا لیکن تجربہ ضرور ہے۔ تم لوگ آج سے ہی گاؤں میں پہرہ لگواؤ۔ کسی کو اسلحہ ابھی مت دینا، لڑکوں کے پاس بلمیں وغیرہ ہی ہوں۔"

"چودھری نے ٹھیک کہا ہے۔ ہمیں فوج میں بتایا گیا تھا کہ صحیح فیصلہ تبھی ہوگا جب اُس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں گی۔"

"چودھری! کل رات سب کے پاس اسلحہ ہونا چاہیے۔ کارتوسوں اور گولیوں کی سپلائی کا بندوبست رہنا چاہیے۔"

"یہ چودھری کی ذمے داری ہے، ہم لوگ تو آپریشن میں مصروف ہوں گے۔"

"گولیوں کی تقسیم کا کام علم دین کے سپرد کردیں گے۔" محمد مالک نے فیصلہ دیا۔

"وہ ہمارا سٹاک بیچ دے گا۔" کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔ محمد مالک اِس مذاق سے مطمئن سا ہوگیا۔ اُسے تسلی ہوئی کہ فوجی اپنے شروع کے صدمے پر قابو پا چکنے کے بعد اب معمول کے مطابق سوچ رہے تھے۔

"صبح میں برادریوں کے بڑوں کو بلوا کر اُن کو معاملات سمجھاؤں گا۔" محمد مالک نے اُنھیں اعتماد میں لیا۔

"چودھری! پورا منصوبہ نہ بتانا۔" ایک فوجی نے مشورہ دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب میں کوئی شک نہیں۔بات نکل جاتی ہے،ایسا منصوبہ ہمیشہ راز میں رکھنا چاہیے۔اگر بات نکل گئی تو دوسروں تک پہنچ جائے گی۔"اُس فوجی نے اپنی رائے دی۔اب وہ سب محمد مالک کی طرف دیکھ رہے تھے۔وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا اُنھیں دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔میں تمھاری بات سمجھتا ہوں۔اُنھیں صرف اتنا ہی بتاؤں گا کہ پرسوں حملہ ہونا ہے۔"

"مناسب بات ہے۔یہ بتا دینا کہ ہمارے پاس حملہ روکنے کے تمام انتظامات ہیں۔"اُسے مشورہ دیا گیا،"اور کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔سمجھتا ہوں۔"محمد مالک نے تائید کی۔

اُس رات گاؤں کی ہر گلی میں نوجوان اپنی ڈانگیں، کھونڈ، برچھیاں، بلمیں اور دات لے کے ساری رات پھرتے رہے۔ ایک وقت تک یہ ایک سنجیدہ عمل تھا اور بعد میں ایک مذاق کے طور پر وہ ہر گلی کے آغاز پر ایک دوسرے سے مل کر گپیں لگاتے، معمول کے معاملات پر تبادلہ خیال کرتے اور جھوٹ موٹ کے چور ڈاکو سامنے لا کر اپنی اپنی بڑائیاں بیان کر کے اپنی گشت پر نکل جاتے۔ اُس رات وہ زندگی کے حقائق سے کنارہ کر کے گشت کے کھیل میں جتلا تھے؛ وہ بھول چکے تھے کہ اُن کے اردگرد قتل و غارت کا بازار گرم ہے، اُنھیں بھی خطرات لاحق ہیں، اُن کے گھر اور زندگیاں خطرے میں تھیں؛ لیکن وہ محمد مالک کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں وہی ہوتا تھا جو وہ کہتا تھا سو یہ گشت ایک بے معنی سی احتیاطی تدبیر تھی، اِس لیے وہ گشت کرتے ہوئے کسی حد تک غیر سنجیدہ تھے۔

اُس رات پورا چاند تھا، گھروں کی ملی ہوئی چھتوں سے لے کر تا حدِ نظر ہر چیز چاندنی کے دودھ میں نہائی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کی ٹولیاں چھتوں پر اکٹھی ہو کر بیٹھ کر کھیلی جانے والی کھیلوں میں مشغول تھیں۔ کسی چھت پر کوٹلا چھپاکی ہو رہا تھا اور کسی پر دائرے میں بیٹھی لڑکیاں ماہیے گاتے ہوئے اصلی یا فرضی محبوبوں کو یاد کر رہی تھیں۔ اُن کی آوازوں میں درد میں ڈوبی ہوئی مٹھاس تھی اور اُن کے گالوں پر جوانی کی مٹھاس کا درد تھا۔ اُن کی آوازیں چاندنی کی لہروں پر تیرتی تھیں تو اُن کے گال جوانی کی چاندنی میں دمکتے تھے۔ وہ کسی مستی میں گم ایسی داستان کا حصہ تھی جس کے انجام کا سرا اُن کے ہاتھوں سے سرک گیا تھا۔ وہ اپنے راز سب پر کھولنا چاہتی تھیں لیکن اُن کے افشا ہونے سے خائف تھیں۔ وہ اِس طرح کی کئی راتوں کا سواد چکھ چکی تھیں لیکن یہ رات اُن راتوں سے مختلف تھی؛ یہ رات اُن کی چھاتیوں کی کوٹھڑیوں میں کسی بے یقینی کا ڈیرا نہیں ڈالے ہوئے تھی۔

اُس رات بوڑھے کچھ پریشان تھے۔ اُن کے تجربہ کار خیالات میں ایک ایسی بوتل بار بار آتی جس کا ڈھکن بوتل نے خود ہی کھول دیا تھا اور جن باہر نکل کر بوتل کے مالک کو سب سے

پہلے ہڑپ کر جانا چاہتا تھا لیکن مالک، مالک ہونے سے انکاری تھا۔ وہ بوڑھے جو وقت کے ڈسے ہوئے تھے اُسی وقت میں تریاق ڈھونڈتے تھے۔ وہ وقت کا زینہ چڑھتے ہوئے وہاں پہنچے تھے جہاں سے نیچے اُترنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ وہ فضا میں ایسی خوشبو سونگھ رہے تھے جو پہلے کسی نے نہیں سونگھی تھی۔ وہ اپنے تجربے کے علم کے باوجود تازہ خون کی مہک کو نہیں پہچان سکے تھے! وہ اپنے علم کی گہرائی میں ڈوبنے کے باوجود سطحیت کے غبارے سے چمٹے ہوئے تھے، اُنھیں زندگی اور موت بے وزن اور بے معنی لگ رہی تھیں۔ وہ نوجوانوں سے کہہ چکے تھے کہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔

اُس رات محمد مالک اپنے صحن میں بے چینی سے کروٹیں لیتا رہا، اُس کے برابر والی چارپائی پر حاجرہ کے ہلکے خراٹے اُس کی نیند میں مخل ہو رہے تھے۔ اُس کے کانوں میں سرسراتی گولیوں کی گونج اور درد میں ڈوبی ہوئی کراہیں تھیں۔ وہ جتنا ممکن ہو سکتا تھا، سونا چاہتا تھا لیکن ایک خوف اُسے جگائے رکھے ہوئے تھا۔ کیا وہ اپنے جنون میں ادراک کی سرحد پار کر گیا تھا؟ ہمیشہ کی طرح یہ خیال آج بھی اُس کے ذہن کے کواڑ پر دستک دے رہا تھا۔ اُسے حاجرہ پر ترس آیا اور رشک بھی! وہ زیست کے اتنے نازک موڑ پر بے فکری کی گہری نیند سو رہی تھی۔ کیا عورتیں ایسے ہی ہوتی ہیں؟ اپنا بوجھ مرد کے کاندھوں پر ڈالنے کے بعد تھکاوٹ سے چور سو گئیں! وہ خود بھی حاجرہ کی طرح سونا چاہتا تھا لیکن شاید اُس کا سب کچھ داؤ پر تھا اور حاجرہ اُس کی اِس چال سے بے خبر نیند کی کشتی میں سوار تھی!

اُس رات وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہا تھا کہ شریف نے فجر کی اذان دینا شروع کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور اُداس بھی۔ ماڑی بوچیاں میں یہ اُس کا آخری دن تھا اور کل پتا نہیں وہ رہے یا نہ رہے! اُس نے عبدالرشید کی شادی کر کے رائے بوچہ ل کی نسل کو ایک اور زینہ طے کرنے کا بندوبست کر دیا تھا، اب اُس کی اپنی زندگی اتنی اہم نہیں رہ گئی تھی۔ کیا وہ ستی کر رہا تھا؟ ستی تو عورتیں کرتی ہیں لیکن ہر مرد اپنی زمین، گھر بستی اور عزت کی عورت ہوتا ہے؛ اُس کا ستی کرنا عین مناسب ہے اور یہ بھی ممکن اُس کے لیے یہ آگ گلنار بن جائے!

ساتھ والی چارپائی پر حاجرہ کے کان میں بھی شریف کی اذان نے گدگدی کی اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اندھیرے اور اُجالے کے سنگھم میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُٹھی اور

ایک نظر محمد مالک پر ڈالتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئی۔ محمد مالک نے برادریوں کے سربراہوں کا اکٹھ کرنا تھا، اُس نے فوجیوں کے ساتھ مل کر موریچوں میں لوگوں کو بٹھانا تھا، چلم دین سے مل کے گولیوں، کارتوسوں، کاربینوں اور تلواروں کو لڑنے والوں تک پہنچانے کا بندوبست کرنا تھا۔ وہ اکیلا تھا، گاؤں اُس سے ایک اُمید رکھے ہوئے تھا اور اُس نے اُن کی ہر اُمید پر پورا اُترنا تھا۔ کیا وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھے یا گاؤں کی قیادت کرتے ہوئے آگ میں کود جائے؟ اگر وہ مارا گیا تو یہ سب کاٹ کر رکھ دیے جائیں گے! اُسے اُنھیں زندہ رکھنے کے لیے خود کو زندہ رکھنا ہے۔

حاجرہ نے نماز پڑھ کے چاٹی میں مدھانی ڈالی اور ادھ رڑکے کا گلاس محمد مالک کو دیا جسے پی کر وہ باہر نکل گیا۔ معمول تو ادھ رڑکے کے بعد حقے کی چندواریاں لگانے کا تھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں گم باہر نکل گیا۔ حویلی میں اُس نے نوکر کو چلم بھرنے کا کہا اور خود جانوروں کو ایک نظر دیکھنے چلا گیا۔ شاید یہ اُس کا آخری چکر ہو اور کل اِس وقت تک گولیوں کے شور میں یہ سنگل تڑوا کر بھاگ گئے ہوں۔ حویلی میں ایک بھینس ایسی بھی تھی جو سُونے کے بعد پہلا دودھ نکالنے والے آدمی کے ہاتھ کی عادی ہو جاتی تھی اور وہ آدمی پورے سال کے لیے اُس کا دودھ نکالنے کا پابند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی اُس کے سُونے کی خبر گاؤں میں پھیلتی، دودھ نکالنے والے آدمی گھروں سے بھاگ جاتے۔ وہ بھینس آخری دنوں میں تھی، محمد مالک نے سوچتے ہوئے کہ اگلی دفعہ کون دودھ نکالے گا، پیار سے اُس کی کمر کو تھاپڑا۔ بھینسوں کو بھوک بڑھانے اور ہاضمہ درست رکھنے کے لیے مصالحہ دیا جاتا تھا، ایک بھینس منہ کی اتنی سخت تھی کہ اُسے آج تک کوئی مصالحہ نہیں دے سکا تھا۔ محمد مالک کو آتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اُس نے چوکنی ہو کر محمد مالک کی طرف دیکھا اور پھر چارا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ محمد مالک نے اُس کی کمر کو بھی پیار سے تھاپڑا۔ مشکی گھوڑی کو دوڑ میں کوئی گھوڑی یا گھوڑا آج تک ہرا نہیں پایا تھا، اُس کو خریدنے کے لیے کئی شوقین اور بیوپاری آئے مگر محمد مالک نے اُسے بیچا نہیں۔ وہ گھوڑی اُس کے اصطبل کا گہنا تھی اور بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ محمد مالک دیر تک کھڑا اُسے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اُس نے اُس کے ماتھے کو پیار سے سہلایا اور گھوڑی نے کنوتیاں کس کر جواب دیا۔

وہ دیوان خانے میں گیا تو فوجی وہاں موجود تھے۔ اُن کے چہروں پر اطمینان اور جسم کی زبان بے چین تھی۔ محمد مالک نے سوچا کہ اُنھیں جلد از جلد اپنی جگہوں پر پہنچ جانا چاہیے۔

''تم لوگ اِس اکٹھ میں بے شک نہ بیٹھو۔ میں فارغ ہو کر بوڑھ والے کھوہ پر آ جاؤں گا۔''

وہ تھوڑا جھجکے۔ محمد مالک اُن کے خدشات نہیں سننا چاہتا تھا؛ یہ عمل کا وقت تھا۔ اُٹھنے سے پہلے اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سیڑھیوں سے نیچے چلے گئے۔ محمد مالک نے اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھ کر اُس دن حقے کا پہلا کش لیا۔ وہ دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں لوگ آنا شروع ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگوں کے کام کا وقت تھا لیکن آج کون سے کام ہوں گے؟ آج صرف جانیں اپنی تھیں؛ مویشی، گھر، جولاہوں کے کپڑے، موچیوں کے جوتے، ترکھانوں اور لوہاروں کے اوزار، نائیوں کی دیگیں، جھیروں کی مشکیں اور میووں کے جال سب بیکار تھے۔ وہ جہاں بھی گئے نئے اوزار بنا کر گاؤں والوں کے اُتنے ہی کام آئیں گے جتنے یہاں آتے رہے تھے۔ اُس نے سب لوگوں کو ایک نظر دیکھا۔ اُسے تسلی ہوئی کہ چوہڑے اور لبانے بھی آئے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو گاؤں کا حصہ سمجھا اور وہ اُن سے گاؤں کی حفاظت میں بھی پورا کام لے گا تاکہ وہ خود کو گاؤں سے الگ محسوس نہ کریں۔

''بات شروع کریں؟'' اُس نے سب سے اجازت چاہی۔

''ہاں!''

''کیوں نہیں؟''

''پوچھتے کیوں ہو؟''

محمد مالک نے ہاتھ بلند کر کے مزید اجازتوں کو روکا۔ ''رات ایک ایلچی آیا تھا۔'' اُس نے بغیر تمہید کے بات شروع کی، ورنہ وہ ہمیشہ ایک لمبے تعارف کے بعد اصل مقصد پر آیا کرتا تھا۔ ''وہ گنگو کا ساتھی تھا۔'' ایک دم لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ اُن کے چہروں پر خوف، اعتماد اور اُمید کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ''وہ گنگو کا پیغام لے کر آیا تھا۔'' وہ ارادتاً ایک ایک فقرہ بول رہا تھا تاکہ سب لوگ اُس کی بات کو مکمل طور پر سمجھتے رہیں۔ ''اُس نے بتایا کہ ماڑی بوچیاں پر حملہ کی تیاری مکمل ہو گئی ہے۔'' کئی لوگ اپنی جگہوں پر بے چینی سے ہلے، کچھ کھانسے اور کچھ نے لمبے کش لیے۔ ''کل صبح کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔'' وہاں ایک دم ہر طرح کی حرکت ختم ہو گئی؛ سب لوگ پتھر بن گئے یا اُن کے جسموں سے جان جاتی رہی اور یا وہ اُس گھوڑے کی طرح تھے جو اگلی چھلانگ بھرنے سے پہلے اپنی طاقت مجتمع کرتا ہے۔ ''ہم نے اپنے گاؤں کا دفاع کرنا ہے اور لڑتے

ہوئے یہاں سے نکل جانا ہے۔"

"اگر کوئی اِسی وقت جانا چاہے؟" نیاز محمد نے جو ایک چھوٹا زمین دار تھا، پوچھا۔

"تو وہ جائے۔ اُس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں لیکن وہ اپنے ذمے داری پر جا رہا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے تھوڑا خوف زدہ ہوکر پوچھا۔

"میں نے فوجی گاڑیوں اور گارد کا بندوبست کیا ہوا ہے، وہ اِس وقت کے بعد کبھی آسکتے ہیں۔ اُن کے آتے ہی ہم لوگوں کو یہاں سے بھیجنا شروع کر دیں گے۔"

"میرے لائل پور والے رشتے دار بلا رہے ہیں، میں آج ہی نکل جانا چاہتا ہوں۔" نیاز کے لہجے میں معذرت سی تھی۔

"جاؤ۔" اور پھر محمد مالک پورے مجمع سے مخاطب ہوا۔ "کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ جو جانا چاہے، نیاجے کے ساتھ چلا جائے تاکہ ایک قافلہ بن جائے۔ میں جانے والوں کے حصے کا اسلحہ دے دوں گا۔" محمد مالک نے خلوص کے ساتھ کہا۔

چار خاندان اور جانے کے لیے تیار تھے۔ محمد مالک نے علم دین کو فی خاندان ایک کاربین اور ایک تلوار دینے اور ہر کاربین کے ساتھ دس کارتوسوں کا بھی کہا۔ لوگوں میں پھر ایک بار کھسر پھسر شروع ہوئی۔ محمد مالک نے اُنھیں روکا نہیں۔

"یہاں جانے کے بعد گاؤں سے باہر جوڑی میں جائیں گے اور کوئی آدمی ہتھیار کے بغیر نہیں ہوگا۔ رات پہرا پکے طریقے سے دیا جائے گا کھیل سمجھ کر نہیں جیسے ہو رہا تھا...."

"گھبرانے کی بات نہیں کوئی، ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ بھون کر رکھ دیں گے۔"

علم دین نے بات کاٹی۔

"گھبرانے کی بات نہیں لیکن ہے بھی،" محمد مالک نے سوچتے ہوئے جواب دیا، "ہمارے پاس اسلحہ تو کافی ہے لیکن حملہ کرنے والا ہمیشہ فائدے میں ہوتا ہے اور اِس کے علاوہ تمام حالات ہمارے مخالفوں کے حق میں ہیں۔ ہم تو اِس گاؤں کے قلعے میں بند ہیں وہ جس طرف سے چاہے حملہ کر دے۔"

"ہمارے پاس اور کوئی حل ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"ہاں! ہے!" محمد مالک نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" کئی آوازیں اکٹھی بلند ہوئیں۔

"وہ ہمیں ایک ایک کر کے مارتے جائیں اور ہم مرتے جائیں۔"

وہاں ایک خاموشی نے سب کے سانس گھونٹ دیے۔ محمد مالک سب کے چہرے دیکھتا جاتا تھا اور سب ایک سکتے میں گم اُسے دیکھتے جاتے تھے۔ تمام نمائندوں کے لیے یہ ایک مشکل وقت تھا۔ اُنھیں پہلی دفعہ اُس گاؤں میں گزاری زندگی بے وقعت لگی۔ اُن کو اُس گاؤں میں رہتے ہوئے صدیاں ہو گئیں تھیں، وہ وہاں پیدا ہونے کے بعد مر کے وہیں دفن ہونے کا سوچتے ہوئے آئے تھے اور اب اُسی گاؤں میں اُن کی زندگی اور عزت خطرے میں تھی۔

"جب مرنا ہے تو مارتے ہوئے کیوں نہ مریں۔" کسی نے کہا۔

"ماریں گے!" کسی نے تائید کی اور وہاں ایک دم شور بلند ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے والا کھچاؤ بھک سے اُڑ گیا؛ سب کے چہروں پر رونق، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ اب وہ ہنستے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔

"اب اپنے اپنے کام سنبھالیں۔ صرف مال کے پٹھے دتھے اور پانی کا بندوبست کرو، باقی کام کرنے کا وقت گزر گیا۔" محمد مالک یک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، "شریف کو کہنا کہ آج کھڈی پر نہ بیٹھے۔"

ہر طرف سے قہقہے بلند ہو گئے۔ محمد مالک نے سوچا کہ انسان کتنی عجیب مخلوق ہے، اِس کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی؛ کچھ دیر پہلے یہ لوگ مرنے کے خوف سے سہمے ہوئے تھے اور اب قہقہے لگاتے ہوئے مرنے کو تیار تھے۔

"وہ کہتا ہے کہ وہ کھڈی چلاتے ہوئے سوچتا ہے۔" جواب آیا۔

"کھڈی چلاتے ہوئے کیا سوچنا ہوتا ہے؟" ہنستے ہوئے طنز سے پوچھا گیا۔

"کیا سوچنا ہوتا ہے؟"

"اُس کے مطابق وہ اپنے فیصلے کھڈی چلاتے ہوئے سوچتا ہے۔"

"آج بھی کھڈی پر بیٹھا ہو گا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے، گاؤں نے اپنا فیصلہ تو یہاں کر لیا ہے لیکن اُس نے اپنا کھڈی پر کرنا ہو گا۔" قہقہوں کی آتش بازیاں چھوٹ گئیں۔

"اب ہم یہاں سے اپنے اپنے گھروں کو جائیں اور جوانوں کو بوڑھ والے کھوہ پر

بھیجیں تا کہ اُنھیں ذمے داری سونپی جائے۔"

اُس نے سن رکھا تھا کہ رانا سانگھا، بابر بادشاہ سے شکست کھانے کے بعد زیادہ دیر جیا نہیں۔ اُس کا ماڑی بوچیاں سے نکالے جانا ویسی ہی شکست تھی۔ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا؟ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا، اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ گاؤں جو اُس کا تھا اب نہیں رہا۔ اُس کے پرکھوں نے اِس گاؤں کو تاریخ میں وہ مقام دیا جو شاید ہی کوئی اولاد اپنے بزرگوں کو دے سکی ہو۔ یہ گاؤں دراصل اُس کی طاقت رہا تھا؛ وہ ہمیشہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ گاؤں کی طاقت اُس کی وجہ سے تھی لیکن اِن دنوں میں اُسے احساس ہوا کہ وہ خود تو کچھ بھی نہیں، اگر کچھ ہوتا تو اُسے یہاں سے نکلنے کا سوچنا ہی نہ پڑتا۔ اگلے جہان میں وہ بوچے مل کو کیا جواب دے گا؟ اُسے تو نئے ملک سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ وہاں جانے کا کیوں سوچتا جہاں اُسے اپنی منزل ہی نہیں پتا۔ وہ تو وہاں صرف اِس لیے جا رہا ہے کہ اُسے یہاں مار دیا جانا تھا اور وہاں اُس کی نسل ایک زینہ اور چڑھ جائے گی۔ ہو گا تو مشکل لیکن اُس نے کسی طرح عبدالرشید کو کل سے لڑی جانے والی لڑائی سے دور رکھنا ہو گا۔ اُس نے اکٹھ میں آئے ہوئے سربراہوں کو جوانوں کو بوڑھے والے کھوہ پر بھیجنے کا کہا ہے، وہ عبدالرشید کو وہاں جانے کا نہیں کہے گا۔ اُس کا وہاں کیا کام؟ وہاں کے معاملات تو اُس نے خود طے کرنے ہیں وہاں عبدالرشید کو بلا کر غیر اہم کرنا ہو گا اور وہ کبھی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہے گا جہاں عبدالرشید غیر اہم لگے۔ وہ گاؤں میں پہرا دینے والوں کے ساتھ ہو گا!

اُسے اچانک بھوک کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا: یہ ماں یا وی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کچھ کھانے کے لیے گھر کی طرف چل پڑا!

حاجرہ اور حسنات کو کل ہونے والے حملے کے بارے میں علم نہیں تھا؛ اب اُنھیں بتا دینا چاہیے تا کہ وہ وہاں سے نکل جانے کے لیے تیار رہیں۔ وہ تو گھر کا سارا سامان لے کر جانا چاہیں گی لیکن زیور اور ایک دو کپڑوں کے علاوہ ساتھ کچھ جا نہیں سکتا تھا۔ لوگوں کے اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے کی خبریں اُس تک پہنچ رہی تھیں، اُس کا دل اِن خبروں پر خون کے آنسو روتا۔ جانے والے لوگ ایک آگ میں سے گزر کر اپنی منزل کی طرف جا تو رہے تھے لیکن کیا وہ وہاں پہنچ پائیں گے؟ سنا تھا کہ اُن کی جگہ لینے والے لوگ بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ وہ لوگ لٹے پٹے، خستہ حال اور بے بسی کی عجیب مثال تھے۔ وہ بھی اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ بیاس

کے پانیوں کی طرح پرسکون زندگی میں اب طغیانی آ گئی تھی؛ اُس کے ذہن میں کبھی اور کوئی گھر آیا ہی نہیں تھا! کیا وہ اب اِس گھر کو صرف خوابوں میں ہی دیکھا کرے گا؟ لیکن اُسے تو کبھی خواب آیا ہی نہیں! کیا پھر وہ اِسے بھول ہی جائے؟ کیا بھول جانا ممکن ہوگا؟ کیا وہ بیاس کے پانیوں کو دوبارہ نہیں دیکھے گا؟ ریتوں پر لیٹے سنسار شاید کہیں نہ ملیں! اُس نے سوچا کہ وہ جہاں بھی گیا پانی کے کنارے ہی آباد ہوگا۔

صحن معمول کی طرح ہی تھا۔ دو عورتیں کچھ کام کرتے ہوئے اور کچھ کام کرنے کا دکھاوا کرتے ہوئے ادھر اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔ حاجرہ حسبِ معمول چارپائی پر بیٹھی اُسے آتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور حسنات چھوٹا سا گھونگھٹ نکال کر اندر چلی گئی۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک عورت نے اُس کے سامنے حقہ لا کر رکھ دیا۔ اُس نے ایک کش لیا اور حاجرہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیڑھی لے کر آ بیٹھی:

''حاجرہ! اب ہمیں یہاں سے جانا ہوگا؟'' محمد مالک نے بات شروع کی۔

''کہاں اور کب؟'' حاجرہ نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ کر پوچھا۔

''رات مجھے پیغام ملا تھا کہ کل ماڑی پر حملہ ہوگا۔'' محمد مالک نے گھر پر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم نے جواب دینے کی تیاری کر لی ہے۔ پھر ہم نے اڈول نکل جانا ہے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' حاجرہ نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔ دیکھو!'' محمد مالک نے ایک آہ بھری اور سر جھکا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں وہ روکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنسو گھر میں ہی بہائے جا سکتے ہیں۔ وہ اُٹھا اور صحن کا چکر لگا کر دالان میں چلا گیا جہاں اُسے ایک عجیب طرح کی بو کا احساس ہوا جو اُسے موت کی بو لگی۔ وہ جو زندگی کا مقابلہ کرنے میں یقین رکھتا تھا اب اچانک خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا؟ کیا موت کمروں میں بھٹکتی پھرا کرتی ہے؟ اُسے مرنے کا ڈر نہیں لیکن پھر موت سے خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا؟ کیا وہ بزدل ہو گیا ہے؟ بہادر کبھی بزدل نہیں ہو سکتا، اُس کے خون میں بہادری ہی تھی شاید خوف ایک عارضی سا احساس تھا جیسے گرمیوں میں بادل آ کر دھوپ کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ کوٹھڑیوں میں گیا جہاں پیٹیوں میں بستروں کے اتنے ڈھیر تھے جو کسی راجے، مہاراجے کی بارات کے لیے کافی تھے۔ دیواروں پر اتنے برتن ٹنگے ہوئے تھے کہ ایک ہی وقت پر

عبدالرشید کی طرح کی دو بڑی شادیاں نمٹائی جا سکتی تھیں۔ یہ چیزیں کئی نسلوں سے ان کمروں میں اکٹھی ہوتی آئی تھیں اُن قصوں کی طرح جو اُن کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔ کوئی برتن اُس کی ماں کے دنوں کے تھے تو کوئی دادی کے اور ہر ڈونگے، تھالی، پیالی یا گول کے ساتھ ایک داستان بھی تھی اور جب بھی اِن برتنوں میں سے کسی کو استعمال کیا جاتا تو اُس کے ساتھ وابستہ قصے کو بھی بیان کیا جاتا جو لاتعداد بار سنے جانے کے باوجود اُس وقت بالکل نیا لگتا اور اگر سنایا نہ جاتا تو لگتا کچھ ادھورا سا رہ گیا ہے جیسے بیلنے پر جا کر گرم گرم تازہ گڑ نہ کھایا جائے۔ کل جب وہ یاد کر کے اِن برتنوں کی باتیں کریں گے تو اُسی وقت اُن باتوں کو جانے بغیر کوئی اور استعمال کر رہا ہو گا۔ کیا وہ بھی کہیں جا کر کسی کے برتنوں کے ساتھ ایسے ہی کریں گے؟

جب وہ صحن میں گیا تو حسنات بھی پیڑھی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''اب بتاؤ۔'' حاجرہ نے کہا۔

''عبدالرشید گھر نہیں؟''

''نہیں! وہ صبح کا نکلا ہوا ہے۔''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' اُس نے بچوں کی طرح کہا۔ حاجرہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ حسنات جلدی سے اُٹھ کر ناشتے والا تھال لے آئی۔

''میں نے تحصیل دار کو پیغام بھجوایا ہوا ہے، اُمید ہے آج رات سے کسی بھی وقت فوج ہمیں لینے آ جائے گی۔ تم سب اُس میں چلے جانا۔'' محمد مالک نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اُس کا خیال تھا کہ نوالہ گلے میں اٹکے گا لیکن ایسے ہوا نہیں، خالی پیٹ میں سے نکلنے والے لعاب نے سالن، مکھن اور اچار لگے لقمے کو کوئی رکاوٹ نہ ہونے دی۔

''تم نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔'' حسنات نے اپنی جگہ بدلی، ''عبدالرشید، تم لوگوں کے ساتھ جائے گا۔'' اُس نے حسنات کے پیڑھی پر جگہ بدلنے کا جواب دیا۔ حسنات نے ایک تسلی کے ساتھ شرماتے ہوئے گھٹنوں میں سر دے دیا۔ ''تم لاہور جاؤ گے۔ تحصیل دار نے تم لوگوں کے رہنے کا بندوبست کیا ہو گا۔ اِس لیے پریشانی کی بات نہیں۔''

''تم ہمیں ڈھونڈو گے کیسے؟'' حاجرہ کے تمام سوالوں میں ایک مثبت پہلو تھا جس کی

وجہ محمد مالک کے ساتھ زندگی کی طویل رفاقت تھی۔

''تحصیل دار کا پتا چلانا مشکل نہیں ہوگا، وہ یہاں سے جانے والوں کو ادھر کے بدلے میں جائیدادیں الاٹ کرتا ہے۔ پھر لائل پور میں حسنات کے سوتیلے بھائی ہیں۔'' محمد مالک نے اپنی دلیل سے اُسے قائل کرلیا۔ ''حقہ!'' اُس نے کسی کو کہے بغیر آواز لگائی۔

''وہ بٹی کہہ رہی تھی کہ اُس کے بھائیوں کے جانے کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے؟'' حاجرہ نے جھجکتے ہوئے، بظاہر اعتماد سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ بیٹا جتنا حسنات کے سوتیلے بھائیوں کی عزت کرتے تھے، اُتنا ہی اُس کے سگے بھائی اُنھیں ناپسند تھے۔ محمد مالک کے ماتھے پر فوراً بل پڑ گئے۔ وہ خاموشی سے دونوں کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ حاجرہ سامنے دیوار کو دیکھے جا رہی تھی جب کہ حسنات نے سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے، لے جائیں گے۔'' محمد مالک نے سوچتے ہوئے کہا، ''اُن کا وہاں اتنا مسئلہ نہیں ہوگا۔ ڈاکدار کا لیل پور میں پہلے ہی رقبہ ہے۔ یہ وہاں جا کر آباد ہو جائیں گے۔ اللہ کی شان! ہم جو مالک ہیں بے مالکے ہو جائیں گے۔''

''وہ ہمارا بھی رکھوالا ہے، حوصلہ رکھو۔'' حاجرہ نے کہا

''حوصلہ بہت ہے۔'' محمد مالک نے خوش مزاجی سے جواب دیا اور ایک لمبا کش لے کر باہر چلا گیا۔ چوک میں جا کر اُس نے دیوان خانے اور حویلی کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا۔ وہ دیوان خانے میں آخری بار بیٹھ چکا تھا اور حویلی کا آخری چکر لگا چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بوڑھ والے کھوہ کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے کافی لوگ جو ادھر اُدھر کھڑے تھے اُس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ کھسر پھسر سن سکتا تھا لیکن اُس نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا نہیں؛ ایک تو اُس کا سوال سننے کا ارادہ نہیں تھا اور دوسرے وہ اُن تمام مشکلات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُسے درپیش تھیں۔

بوڑھ والے کھوہ پر فوجی اُس کے منتظر تھے۔ اُس کے پیچھے آنے والے لوگ ذرا فاصلے پر رک گئے۔

''کسی بھی وقت فوجی ٹرک آ جانے ہیں اور تمھارے خاندان اُن میں لاہور بھیج دیے جائیں گے۔'' محمد مالک جانتا تھا کہ اُنھیں یہ مسئلہ پریشان رکھے ہوئے تھا اور وہ اُس کے ساتھ یہی بات کرنا چاہتے تھے۔ تینوں کے چہرے پہلی کرن کی طرح روشن ہو گئے۔ ''تیاری مکمل ہے؟''

''ہاں۔ ہمیں ہر چوبارے پر ایک آدمی کھڑا کرنا ہے جو اردگرد دور تک نظر رکھے اور جیسے ہی کوئی حرکت نظر آئے، یہاں اطلاع کردے۔ ہم نے اُنھیں یہ بھی بتانا ہے کہ اُنھوں نے کسی بھی طرف لڑی جانے والی لڑائی کی طرف توجہ نہیں دینی، یہ اُن کا کام نہیں، اُن کا کام چوفیرے پر نظر رکھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اور ہم نے رات کو تمام راستوں پر پہرہ رکھنا ہے۔''

''چودھری! تم تو پورے فوجی ہو۔'' وہ تینوں ہنس پڑے جب گاؤں کے ایک آدمی نے پیچھے سے رائے دی۔

''چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن پر توجہ دینی ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی تھانے دار بنے ہوئے ہیں۔'' محمد مالک نے لوگوں کی طرف آنکھ میچتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک قہقہہ بلند ہو گیا۔ ''اب تم لوگ اپنے ڈنڈے سوٹے پکڑو اور اپنی اپنی پتی اور گلی کی حفاظت شروع کرو۔ اگلے ایک یا دو دن کوئی آرام نہیں۔ ہم سب نے یا مرنا ہے اور یا مارنا ہے۔'' وہ رکا، اُس نے تینوں فوجیوں کی طرف دیکھا، ''انسان اپنے نام، عزت اور مٹی کے لیے جان دیتا ہے۔ یہ زمین اب ہماری نہیں رہی، اِس نے ہمیں کئی صدیاں سہارا دیے رکھا لیکن آج انسانی سوچ اِس پر بھاری ہو گئی اور ہم نے آنے والوں کو بتانا ہے کہ دھرتی سوچ سے بھاری ہے۔'' اُس نے سب لوگوں پر ایک گہری، بامعنی نظر ڈالی؛ ایسی نظر جس میں اُن سب کے لیے ایک پیغام اور ایک حکم تھا کہ اُنھوں نے کسی بھی مرحلے پر اپنی مرضی نہیں کرنی۔ وہ فوجیوں کی طرف مُڑا، ''تم اِن سب کو اِن کے کام بتاؤ۔'' اور خود ست سا بوڑھ کی طرف چلا گیا جہاں اُس کے لیے چارپائی بچھی تھی اور علم دین حقہ لیے بیٹھا تھا۔

''کچھ کھایا یا ایسے ہی خالی پیٹ ہو۔'' محمد مالک نے پوچھا۔

''کھانا کیا تھا، صبح سے اِن کے ہاتھ چڑھا ہوا ہوں۔'' اُس نے ہنستے ہوئے فوجیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ایسے لگتا تھا کہ ماڑی بوچیاں پر آسیب قابض ہیں، کوئی بچہ، عورت، بوڑھا یا جوان نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں کونوں میں کسی ترتیب کے بغیر تعمیر کیے چوباروں پر ذمے دار آدمی پہرے پر کھڑے کر دیے گئے تھے۔ محمد مالک بوڑھ والے کھوہ کے کوٹھے کی چھت پر بے چین بیٹھا ہوا تھا، اُسے متوقع حملے سے زیادہ تحصیل دار کے ٹرکوں کے اب تک نہ پہنچنے کی پریشانی تھی۔ آج اُسے

کل والی کوئی اُلجھن نہیں تھی، وہ کسی حد تک مطمئن چھت پر بے چینی سے ٹرکوں کا منتظر تھا۔ اِس لڑائی میں اُس کے لیے اب کوئی دل چسپی نہیں تھی، اُس نے منصوبہ کے لیے جو ممکن تھا کرلیا، اسلحے کے ڈھیر تھے، تربیت یافتہ نشانچی تھے، گلیوں میں اِس وقت بھی پہرہ تھا، تمام گھر خالی ہو گئے تھے، بوڑھے ایک احاطے میں بیٹھے تھے جب کہ عورتوں کو دو گھروں میں بند کر دیا گیا تھا اور وہاں رائفلوں کا پہرہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُس نے کوئی وجہ نہیں چھوڑی تھی، حملہ آور کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

گاؤں والے اُس کی اِس لڑائی میں مکمل طور شامل تھے، سوائے اُن چند گھروں کے جنھوں نے سب کی اجازت سے جانے میں بہتری جانی، اُنھیں بہت دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ بیل گاڑیوں میں روانہ کیا گیا اور سب دور تک اُن کے پیچھے چلتے ہوئے گئے تھے۔ وہ عجیب سماں تھا، وہ لوگ کبھی نہ ملنے کے لیے بچھڑ رہے تھے اور اُنھیں ایسے الوداع کہا جا رہا تھا کہ شام کو اُن سے پھر ملاقات ہو جانی ہے۔ اور بیل گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے خاندان مسکراہٹوں میں ڈوبے ہوئے ایسے جا رہے تھے کہ دریا تک ہو کے شام کو واپس آ جائیں گے۔ اُسے اُن خاندانوں کی بہت فکر تھی، صرف وہ جانتا تھا کہ وہ اِس طرح اپنے عزیزوں تک جاتے ہوئے خطروں کے کتنے گہرے دریاؤں کو پار کر رہے ہیں! وہ اُنھیں روک نہیں سکتا تھا، جب اُنھوں نے جانے کے لیے کہا تھا تو اُن کے بدن کی زبان ایسی تھی کہ اُنھیں روکا نہیں جا سکتا تھا۔

جب بھی فوجی ٹرک آئے تو اُنھیں کئی چکر لگانا پڑنے ہیں۔ اُس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ ایک قافلہ پیدل بھیجے گا تا کہ ٹرک، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو جلد از جلد پہنچا سکیں۔ اُسے صرف حملے کا انتظار تھا۔ اُسے شک گزرنے لگا کہ گنگو کی اطلاع کہیں غلط تو نہیں تھی یا حملہ کرنے والوں نے منصوبے میں تبدیلی کر لی ہو اور وہ پیغام نہ بھجوا سکا ہو! لیکن اب کوئی قانون بھی نہیں تھا جس کا اُسے ڈر ہوتا؛ وہ تو خود بھی آ سکتا تھا لیکن شاید مقامی لوگوں کے خوف یا اُن کے پر تشدد ردِ عمل کی وجہ سے خود آنا نامناسب سمجھا ہو۔ لیکن وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں، اُس کی ساری زندگی بے خوفی کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اُس نے ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جس وقت پر اُسے کہیں پہنچنا ہو نہ پہنچا ہو، خواہ کسی کی جان ہی کیوں نہ لینی ہو! شاید وہ کسی وقت آ ہی جائے، شاید اُس کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو جائے! شاید ایسا کرنا اُس کے لیے ممکن نہ ہو کیوں کہ

اُس کے عزیز بھی اِس حملے میں شامل ہوں گے۔ وہ جو جان لینا جانتا تھا شاید اپنے عزیزوں کی جان نہ لے سکے!

محمد مالک حملے کے انتظار میں ایسی باتیں سوچے جا رہا تھا۔ اُسے آج کسی قسم کا کھچاؤ تو محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن اُس پر ایک دباؤ ضرور تھا۔ اُس پر اتنی جانوں کی ذمے داری تھی، اگر اُس کی منصوبہ بندی ناکام ہوگئی اور یہ سارے لوگ مارے گئے تو! اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ وہ خود اور کون؟ کیا اُس کے پاس کوئی اور حل تھا؟ وہ لوگوں کو جانے دیتا۔ اگر ایسا کرنے دیتا تو بھی اُنھوں نے مارے جانا تھا۔ وہ سب تو پنجرے سے نکلے ہوئے توتے کی طرح تھے جنھوں نے باہر نکلتے ہی اُڑنے کی کوشش میں گر کے مر جانا تھا۔ وہ اُنھیں اپنے پروں کے نیچے چھپائے ہوئے تھا، مرغی کی طرح۔ مرغی کے نیچے بھی کئی مرغیوں کے انڈے ہوتے ہیں جن کی وہ اپنے بچے سمجھ کے حفاظت کرتی ہے۔ اُس پر لازم ہوگیا تھا کہ وہ اُنھیں بحفاظت کسی مقام تک لے جائے۔ لیکن اُس نے گاؤں چھوڑنا اپنی ذاتی جنگ بنالیا تھا، وہ اُنھیں اپنی جنگ میں کیوں جھونک رہا تھا؟ شاید طاقت نے اُسے خود غرض بنادیا تھا اور اب وہ اُن کے بل بوتے پر اپنی طاقت آزمانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی طاقت تو وہ تھے؛ اُس کے پاس کیا تھا؟ ایک بیٹا اور گھر کی دو عورتیں!

محمد مالک کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا؛ اُسے لگا کہ کچھ ہونے والا ہے، پھر اُسے خیال آیا کہ وہ صبح سے ہی ایسے محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اچانک تیز قدموں کی آواز سنائی دی، جو نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ وہ قدرے بے یقینی کی کیفیت میں آنے والے کو دیکھنے کے بجائے قدموں کی آواز کو سنتا رہا۔ پھر اُسے آنے والے کے تیز سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی اور اُسے اُس آواز میں آنے والے کے دل کی دھڑکن بھی محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ حملہ ہو رہا ہے۔ اُسے ایک عجیب قسم کے تجسس نے اپنی گرفت میں لے لیا، وہ اپنے اندر ایک بچہ بن گیا۔ اُس نے اپنے گھر میں داستانوں کے طور پر کئی حملوں کے متعلق سنا تھا اور وہ ہمیشہ سے اپنے ذہن میں حملے کا ایک نقشہ بنائے ہوئے تھا۔ اُسے لگا کہ آج اُس کے تخیل کی تصدیق یا تردید ہو جائے گی! اُسے اپنے آپ پر ہنسی آئی اور وہ بچپن سے نکل کر گاؤں سے آنے والے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے محمد مالک نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا:

''چودھری جی! اُس طرف سے،'' اُس نے شمال کی طرف، جہاں سے اُنھیں توقع تھی اور

گنگو نے بھی اشارہ دیا تھا، اشارہ کیا، ''لشکروں کے لشکر آ رہے ہیں۔'' لڑکے کی آواز میں خوف اور اہمیت کی کپکپی تھی۔

''پتر! آنے دو!'' محمد مالک نے تحمل کے ساتھ کہا۔ اُسے خود بھی اپنی آواز پر حیرت ہوئی۔ اُسے لگا کہ سرپٹ بھاگتی ہوئی گھوڑی راستے میں آنے والی رکاوٹ کو اپنے قدم توڑے بغیر پار کر گئی ہے۔

''ہلا جی!'' لڑکے نے بے یقینی سے جواب دیا۔

''ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہنی ہوئیں۔''

''ہلا جی؟'' لڑکے کی آواز میں حیرت تھی۔

''وہاں سے فوجی کو بلاؤ!'' محمد مالک نے کہا۔ اُسی وقت ایک فوجی بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کی حالت لڑکے سے کافی بہتر تھی۔ اُس نے چھوٹی سے ٹوکری اُلٹی کر کے سر پر رکھی ہوئی تھی اور اُس میں ٹہنیاں اُڑسی ہوئی تھیں۔ محمد مالک کو یہ مضحکہ خیز لگا اور وہ وقت فقرہ کسنے کا نہیں تھا، وہ خاموش رہا۔ اُسے یہ پتے نظر تو آئے تھے اور اُس نے اِسے چھوٹی سی جھاڑی سمجھا تھا۔

''وہ آ رہے ہیں۔ دور ڈھول کی آواز آ رہی ہے۔'' اُس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے اطلاع دی۔ اُسی وقت دور سے ڈھول کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ محمد مالک کو یہ آواز اپنی چھاتی میں گدگدی سی کرتے اور کبھی تتلی کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے محسوس ہوتی۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ایک دم منقطع ہو گیا اور اُسے اپنی ٹانگوں میں ایک طرح سے ضعف اور کپکپی محسوس ہوئی اور خوف کی لہر سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو مجتمع کیا اور جس طرف سے آواز آ رہی تھی اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

''چودھری! تم فکر نہ کرو۔ اب دیکھنا۔'' فوجی نے کہا، پھر وہ لڑکے کی طرف مڑا، ''جوان! تم اپنی پوسٹ پر جاؤ۔''

اب ڈھول کی آواز نزدیک آنے لگی تھی، محمد مالک کو اب یہ آواز چھاتی کے بجائے کانوں میں محسوس ہو رہی تھی اور اب وہ پھر سرپٹ بھاگتی اُس گھوڑی کی طرح ہو گیا تھا جو اپنے قدم توڑے بغیر رکاوٹ عبور کر گئی ہو۔ اُسے اُلجھن ہونے لگی کہ حملہ آور ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟ اب ڈھول کے ساتھ گھٹتی بڑھتی انسانی آوازیں بھی آنے لگی تھیں جیسے دور رکڑ میں گرمی کی لہریں نزدیک

دور ہو رہی ہوتی ہیں۔ درمیانی فاصلے پر زمین کی سلوٹ پر چڑھتے لوگ نظر آنے شروع ہو گئے تھے، تاحدِ نظر؛ سبز، پیلی، نیلی، آسمانی، فیروزی اور سُرخ پگڑیاں ہی پگڑیاں تھیں..... گھڑ سوار تھے اور پیدل لوگ۔ وہ ہوا میں کرپانیں، بندوقیں، لاٹھیاں، برچھیاں لہراتے، نعرے لگاتے، اُسے گالیاں دیتے، بلبلیاں اور بانگرے مارتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اِس طرف کی پوری خاموشی نے حملہ آوروں کو مکمل طور پر نڈر اور لاپروا بنا دیا تھا، شروع کی ترتیب اب بے ترتیبی میں تبدیل ہو گئی تھی؛ وہ تلئیروں کے غول کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ محمد مالک اب اپنے لوگوں کے ردِعمل کا منتظر تھا اور اُسے اُن کی خاموشی سے اُلجھن بھی ہونے لگی تھی۔ کیا ماں یاوے سو گئے ہیں یا اُسے پتا چلنے دیے بغیر بھاگ گئے ہیں لیکن جھاڑی نما ٹوکری ابھی تک وہیں تھی جہاں اُس نے صبح دیکھا تھی۔ پھر کچھ آگے ایک اور ٹوکری کی حرکت نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دوسرے فوجی کا ہاتھ ہلا اور چھوٹی چھوٹی سیٹیاں بجنے لگیں اور اُسی وقت گولیاں چلنے کی آواز نے، جو اُس کے لیے غیر متوقع تھی، اُسے چونکا دیا؛ وہ چھت سے گرتے گرتے بچا۔ گولیوں کی بوچھاڑ حملہ آوروں کے لیے بھی اُتنی ہی غیر متوقع تھی۔ کچھ لوگ زمین پر گرے، گھوڑے بے پا ہوئے، کئی سوار زمین پر آرہے، چند سواروں کے پاؤں رکابوں میں پھنسے اور گھوڑے اُنھیں گھسیٹتے ہوئے لے بھاگے، زمین پر لیٹ کر پناہ لینے والے اُٹھے اور سامنے کچھ نہ پا کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک دفعہ پھر سیٹیاں بجیں، گولیاں چلیں، گھوڑے ہنہنائے، سوار گرے اور زمین کی پناہ میں جانے والے پیچھے کی طرف بھاگے اور اُن کے ساتھ گھڑ سوار بھی۔ خندقوں سے ایک نعرہ بلند ہوا اور ساتھ ہی فوجیوں کی اپنے سپاہیوں کو خاموش رہنے کے لیے ننگی گالیاں۔

سامنے میدان میں کچھ لوگ ابھی تک پڑے ہوئے تھے، وہ یا تو کام آچکے تھے اور یا زخمی۔ درد سے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن فوجیوں نے اُس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ سامنے خالی میدان میں نظریں جمائے ہوئے تھے لیکن وہاں سوائے تکلیف دہ کراہوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنی خندقوں میں دشمن کے نئے حملے کے منتظر رہے لیکن شام سر پر آگئی تھی اور حملے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

محمد مالک کو فوراً اگلے دو مرحلوں نے آن گھیرا۔ رات کو اُن کا لائحہ عمل کیا ہوگا اور تحصیلدار کے بھیجے ہوئے ٹرک کب تک آئیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ کا پہلا مرحلہ اُن کے

ہاتھ رہا ہے لیکن وہ غیر معینہ مدت کے لیے حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، گنگو نے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈوگرا فوج کا دستہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ اُسی وقت دور سے ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ ایک فوجی بھاگتا ہوا آیا:

''چودھری! ہلنا نہیں، ہوائی ریکی ہے۔'' اور پھر وہ اپنی جگہ پر گیا، ''او سنو سب! کوئی جہاز کو دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں۔ وہ ہمیں دیکھنے آرہا ہے کہ یہاں کیا کیا ہے۔'' اور پھر وہ اپنی جگہ چلا گیا!

جہاز نیچے پرواز کرتے ہوئے خندقوں کے اوپر چکر لگاتا رہا۔ اُس وقت وہاں کسی قسم کی حرکت نہیں تھی، چیونٹی تک بھی حرکت میں نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جہاز گاؤں پر چکر لگانے کے بعد واپس چلا گیا۔ جہاز کے جانے کے تھوڑی دیر بعد تینوں فوجی محمد مالک کے پاس آئے۔

''چودھری! اب دوسرے حملے کا انتظار کرتے ہیں۔ تم گاؤں جا کر رات کے پہرے اور کھانے وغیرہ کا بندوبست کرو۔'' پہلی جنگِ عظیم کے سینئر فوجی نے کہا، ''لڑائی بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ ہی لڑی جاتی ہے۔ یہاں فوری خطرہ نہیں۔''

محمد مالک مطمئن سا وہاں سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اُسے اب فوجی ٹرکوں کا بے تابی سے انتظار تھا۔ اُن کے نہ آنے کی وجہ کہیں ایسا کوئی مسئلہ تو نہیں جس کا اُسے علم نہ ہو اور وہ ایک اُمید میں بیٹھا ہو! اگر آج رات تک ٹرک نہ آئے تو اُسے یہاں سے اپنے طور پر نکلنے کا سوچنا ہوگا؛ نکلنے کا راستہ، وقت، بیل گاڑیوں کی تعداد، حفاظت، کھانے کا سامان، اگر کوئی عورت زچگی کے دنوں میں ہوئی تو اُس کا بندوبست وغیرہ۔

چوک میں اُسے وہ تمام لوگ ملے جو گاؤں کی حفاظت پر لگائے گئے تھے اور چاروں چوباروں پر نگہبانی کے لیے چڑھائے گئے تھے۔ اُن سب نے ایک جوش کے تحت اُسے گھیرے میں لے لیا۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہتا جاتا تھا اور خوشی میں قہقہہ لگاتا جاتا تھا۔ اُسے اُن لوگوں کے اپنی ذمے داری کی جگہ چھوڑنے پر بے حد غصہ آیا، وہ فوری طور پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے سب کی طرف ایک پیار بھری مطمئن سی نظر سے ایسے دیکھا کہ اُن پر اپنی اندرونی پریشانی ظاہر نہ ہو۔ اُسے رات کے کھانے کے لیے کچھ پکوانا بھی تھا؛ پورے گاؤں میں شاید کہیں کھانا پکایا یا کھایا نہیں گیا تھا۔ اُس نے ایک بیل ذبح کر کے چاولوں میں ڈال کے پکانے کا

کہا۔ نائیوں نے بتایا کہ دس دیگیں پکیں گی۔

''بھڑ و لے لکھوالو، بچا کر کسی ماے کو دینے ہیں۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ سب لوگ قہقہے لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ''تم لوگوں نے پھر بھی چاول اور گھی نہیں دینا۔'' پھر اُس نے نائی کو مخاطب کیا، ''جاؤ اور میرے گھر سے چاول لے آؤ۔ اب کا پکایا ہوا صبح بھی کام آئے گا۔''

''لے چودھری! یہ کیا بات ہوئی؟ جہاں سے مرضی منگواؤ۔'' کسی نے کہا۔

''مادر چودو! تب تو کوئی نہیں بولا تھا۔'' اُس نے غصے سے کہا۔ ''اور تم سب یہاں کیا کر رہے ہو؟ کسی ماں کو ملنے آئے ہو؟ چلو، اپنی اپنی جگہوں پر۔ سب کا کھانا وہیں پر پہنچ جائے گا۔'' کچھ تائید میں اور کچھ احتجاج میں سرگوشیاں ہوئیں اور کسی طرف سے دبی دبی ہنسی بھی آئی جیسے وہ لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اُس نے سب کے ردِ عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے دھمکی کے طور پر گلا صاف کیا اور سب ایسے تتر بتر ہو گئے جیسے کتیا کے پیچھے پھرتے کتے جو زمین سے پتھر اُٹھانے کے دکھاوے سے ہی تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ ''اب جب تک بلایا نہ جائے کوئی اِس طرف نہ آئے۔''

محمد مالک وہاں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اُسے بھرا پُرا گاؤں اُجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ گاؤں تو تبھی بھرا ہوا لگتا ہے جب کوئی ہنگامہ ہو، چاہے موت ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ اُس نے سوچا: کیا زندگی یہی ہے؟ اُس نے تو ہمیشہ رونق ہی دیکھی تھی، کل سے اُسے شاید اور بھی تنہائی سہنا پڑے! اُس نے اپنے ذہن کو ایک جھٹکے سے اِن خیالات سے آزاد کیا، اِس وقت مایوسی کے بجائے عمل کی ضرورت تھی۔ اُسے حقے کی شدید طلب ہوئی، اُس نے صبح کے بعد ایک بھی کش نہیں لیا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سا نائیوں کے پاس گیا اور اُن کا حقہ لے کر ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

''کب تک کھانا بن جائے گا۔'' اُس نے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

''گوشت آ جائے تو پھر شروع کریں گے۔ دیر گوشت کی ہے۔ چاول بھی ابھی نہیں آئے۔''

''کام تیزی سے کرواؤ۔'' اُس نے نائیوں سے کہا، ''آج نائیوں والے تُور میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حقے کے کش نے اُسے چوکس کر دیا تھا۔ اُس نے اردگرد دیکھا، اُسے ایندھن کم لگا، ''بالن پورا ہو جائے گا؟'' اُس نے شک سے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں چودھری جی!'' ایک نائی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تمھاری ماں لائے گی اکٹھا کر کے، کنجرو۔'' وہ دھاڑا۔ ''ماں کے کھسمو! کوئی کوٹھا

گراؤ، چھت پھاڑو، ڈھارا گراؤ۔ اب یہ سب کس کے لیے چھوڑ کر جانا ہے؟ چلو لاؤ!''
نائی خوف زدہ سے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاول آ گئے اور گوشت بھی آنا شروع ہو گیا۔ نائی بالٹن کندھوں اور سروں پر اُٹھائے آنے لگے اور کچھ دیر بعد کھانے کی خوشبو پھیلنے لگی۔ محمد مالک وہاں خاموش بیٹھا اس کارروائی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بے چینی پر قابو نہیں پا رہا تھا۔
''چودھری جی! گھر کا چکر لگا آؤ۔'' کسی نے مشورہ دیا۔
''نہیں! اگر سب لوگ گھروں میں نہیں جائیں گے تو میں کیوں جاؤں؟ آج سب چلتے پھرتے ہی سوئیں گے۔''

اگلی صبح سورج ایک کھچاؤ کے ساتھ طلوع ہوا، موسم دبا دبا اور گھٹا گھٹا سا تھا۔ لوگ ایک وزن اُٹھائے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ محمد مالک گلیوں کا چکر لگا کے بوڑھ والے کھوہ پر چلا گیا؛ وہاں آدمی اپنی بندوقیں سنبھالے ہوئے حملے کے انتظار میں بے چین ہو رہے تھے جو اُسے پسند نہیں آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اُس گھوڑے کی طرح ہوں جو رات کو گھر کی طرف جاتے اپنی رفتار تیز نہ کرے۔ سب لوگ کھا پی چکے تھے۔ عورتوں نے اجتماعی طور پر دودھ کو جاگ لگا کر دہی بنائی تھی اور پھر بلو کر لسی۔ تمام گاؤں میں لسی تقسیم کی گئی اور علی الصبح گاؤں میں ایک جشن کا سماں تھا۔ چاول گوشت کھاتے اور لسی پیتے لوگ اپنے سرہانے کھڑی موت سے نظریں ہٹا کر اُس مختصر سے وقت میں اطمینان کی اُن سرحدوں کو چھو رہے تھے پہلے جن سے اُن کی شناسائی نہیں تھی؛ وہ تو ہل جوتنا، فصل بیچنا اور بچے پیدا کرنا ہی جانتے تھے۔ اپنی شادی والے دن دولہا معمول کا ہل چلاتا یا پانی لگاتا یا بیج کا چھٹا دیتا اور دلھن گھر کی صفائی کر کے بیل کو کھانا کھلاتی، کپڑے دھوتی اور پھر سہیلیوں کے ساتھ مل کر اپنے رخصت ہونے کے لیے ہار سنگھار میں لگ جاتی۔ اُس نے جب سب کو اپنی اپنی جگہوں پر جانے کا کہا تو اُنھیں موقع کی نزاکت کا پتا چلا۔ مردوں نے اپنی عورتوں، ماؤں نے بیٹوں اور بہنوں نے بھائیوں کو ایک اُداسی، حسرت، پریشانی، دُکھ اور تکلیف کے ساتھ دیکھا، جیسے آخری ملاقات ہو اور بھاری قدموں سے اپنی اپنی جگہوں کی طرف چل دیے۔

محمد مالک اپنے آپ کو بارش کے بعد گیلی ریت کے اوپر دریا کی طرف جاتے ہوئے محسوس کر رہا تھا، ہر قدم بھاری اور تھکا تھکا سا۔ وہ کوٹھے پر چڑھنے لگا تو سینئر فوجی بھاگتا ہوا آیا۔ اُسے یہ آدمی ہمیشہ بے کار لگا کرتا تھا اور اُس کی بات کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی کیوں کہ وہ انتہائی غیر منطقی طریقے سے اپنا نقطہء نظر پیش کیا کرتا تھا لیکن پچھلے دو دنوں سے اُس نے اپنی شخصیت کا نیا رُخ سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اُس کو احترام اور نئی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

''ہم سب تازہ دم ہیں۔ آج اگر حملہ ہوا تو کل سے بھی بُری مار دیں گے۔'' اُس نے کہا۔

''سوئے تو نہیں رہے ساری رات؟'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ فوجی بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

''نا جی نا! ہم نے باریاں رکھی ہوئی تھیں۔ باری باری سوتے اور جاگتے تھے۔ اب بالکل تازہ دم ہیں۔''

سائے ابھی لمبے تھے اور ہوا میں خنکی تھی، یہ وہ وقت تھا جب پرندے ابھی ستانے کے لیے درختوں پر واپس نہیں آتے تھے۔ لیکن آج پرندے کہیں چھپ گئے تھے، نا وہ زمین پر تھے اور نا ہی درختوں پر۔ شاید وہ اپنے گاؤں والوں سے پہلے ہی ہجرت کر گئے تھے اور اُن کی جگہ آنے والے ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔

''ہم نے رات سامنے والے علاقے کا،'' فوجی نے سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''چکر لگایا تھا۔ وہاں خون اور پگڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، شاید زخمیوں کو پٹیاں باندھی گئی ہوں۔ ہمارے خیال کے مطابق دو سے تین لوگ مرے بھی ہیں؛ کم بھی ہو سکتے ہیں اور زیادہ بھی۔'' محمد مالک کو اُس کی ایسی مبہم باتوں پر اعتراض رہا کرتا تھا۔ پھر فوجی ہنسا، ''لیکن مرے ضرور ہیں۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، دور کہیں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کان آوازوں پر لگائے اُنھیں شناخت کرنے کی کوشش میں تھے۔ فوجی کے ہونٹوں پر پریشان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''انجنوں کی آواز ہے۔ ہماری گاڑیاں ہیں یا حملہ کرنے والوں کی مدد کے لیے فوج آ گئی ہے۔'' فوجی نے آوازوں کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ آنکھوں سے سنتا ہو۔ ''یہ آواز حملے والے رُخ سے نہیں آ رہی۔'' فوجی نے یقین کے ساتھ کہا۔ ''جنوب کی طرف سے ہے۔ ہمارے لیے گاڑیاں آئی ہیں۔'' اُس کی آواز میں اُمید اور خوشی تھی۔ وہ بار بار حملے والی سمت بھی دیکھے جا رہا تھا۔ ''اُس طرف بھی کچھ ہے۔'' اور وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ کی طرف بھاگ گیا۔

اُسی وقت کل والا لڑکا بھاگتا اور ہانپتا ہوا آیا۔

''چودَری جی! وہ....'' اُس نے اشارہ کیا، ''آ رہے ہیں۔'' لڑکا کچھ ڈرا ہوا لگ رہا

تھا،'' آج بہت زیادہ ہیں۔ دور دور تک سر ہی سر ہیں۔'' اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ فوجی بھی اُن کے پاس آ گیا۔ وہ اُن کے پاس کھڑا حملے والی سمت میں ہی دیکھے جا رہا تھا۔

''پتر! تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ ہم یہاں ہیں۔'' لڑکا مایوس سا بھاگ گیا۔ ''آج تعداد زیادہ ہے اور ہم بھی تیار ہیں۔ آج اُنھیں اور نزدیک آنے دینا ہے تا کہ گولیاں لگیں، ہوا میں نہ جائیں۔ اور ہمارے خیال میں وہ دوسرا اور تیسرا حملہ بھی کریں گے۔'' وہ رکا، ''پہلا حملہ شاید ایک جھانسا ہی ہو۔'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنی جگہ کی طرف بھاگ گیا۔

ڈھول کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی، اِس دفعہ نعرے، بلبلیاں اور ہانگرے نہیں تھے۔ ابھی سر نظر آنا شروع نہیں ہوئے تھے، ڈھول نزدیک ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ فوجی کے تجزیے نے اُسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ کیا وہ ایک سے زیادہ حملوں کا بوجھ برداشت کر سکیں گے؟ اُس نے سامنے دیکھا تو زمین کی سلوٹ کے اوپر سر نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ کل کی طرح کئی رنگوں کی پگڑیاں ایک پرابنائے آگے بڑھ رہی تھیں۔ محمد مالک حیرت میں گم اُنھیں دیکھتا رہا۔ اتنے لوگ!.... کیا وہ اُنھیں پسپا کر سکیں گے؟ انجنوں کی آواز نزدیک آ گئی تھی اور اُسے اُن کے متعلق جاننے کی بھی بے چینی تھی۔ حملہ آور اب سامنے تھے، وہ کچھ دیر بغیر کسی واضح حرکت کے کھڑے رہے، وہ سمجھا شاید ہدایات دی جا رہی ہوں۔ پھر ایک نعرہ بلند ہوا جو وہ سمجھ نہیں سکا اور اُس نعرے کے جواب میں کئی نعرے بلند ہوئے اور گھڑ سوار اور پیدل لوگ آگے بڑھنے لگے۔ یہ پیر غازی کے میلے کا سماں تھا، لوگ للکارتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، میلے میں ایک طرف سے للکارتے ہوئے لوگ جیسے دوسری طرف والوں کو للکارتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ موج میلہ ہوتا تھا اور یہ بقا کے لیے ایک جنگ تھی۔

سامنے حملہ آور احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے آ رہے تھے، اُن کی رفتار میں کل والی غیر ذمے داری نہیں تھی۔ محمد مالک کو لگا کہ وہ محتاط ہونے کے بجائے خائف ہیں۔ وہ خندقوں میں اپنے آدمیوں کی انگلیوں میں چیونٹیاں رینگتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا، وہ جانتا تھا کہ جلد از جلد لاشوں کے ڈھیر لگا دینا چاہتے تھے۔ اُسی وقت پیچھے سے کسی کے تیز قدموں کی آواز نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، جنوب والے چوبارے سے ایک لڑکا جوش کے ساتھ بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

''تایا جی! تایا جی! فوجی آئے ہیں، آپ کو بلاتے ہیں۔'' اُس نے پھولی ہوئی سانس

سے خوشی اور جوش کے ساتھ کہا۔

''تم چلو۔ میں آتا ہوں۔'' اُس نے سامنے دیکھتے ہوئے سرسری طور پر کہا۔ لڑکا مایوسی کے ساتھ واپس چلا گیا، اُس کا خیال تھا کہ وہ محمد مالک کے ساتھ واپس جائے گا۔ محمد مالک نے جھاڑی نما ٹوکریوں کی طرف دیکھا، وہاں کوئی حرکت نہیں تھی۔ سامنے حملہ آور اُس جگہ پر رُک گئے جہاں اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی۔ اُسے لگا کہ وہ سانس روکے ہوئے کھڑے ہیں، اِس کے بعد اگلا قدم اُنھیں گولیوں کی چادر کے سامنے لے جائے گا۔ پھر اُسے اُن میں حرکت محسوس ہوئی، وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھنا شروع ہو گئے۔ ایک پراسراریت نے اُس کے قدم روک لیے؛ اُسے لگا کہ کسی چیز نے اُس کے پاؤں جکڑ لیے ہیں۔ تھوڑی جھجک کے بعد حملہ آوروں کی پیش قدمی میں اعتماد آ گیا اور وہ نعرے لگانا شروع ہو گئے۔ اُس نے اپنی خندقوں کی طرف دیکھا وہاں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اُسی وقت سیٹیاں بجیں، گولیوں کا ایک سیلاب تھا جو حملہ آوروں کو وقتی طور پر ایک سکتے میں لے گیا۔ وہ ابھی اُس کیفیت سے باہر نہیں آئے تھے کہ اُن میں سے چند چیخ کر نیچے گر گئے اور باقیوں نے گولیوں کی دیوار کو پار نا کرنا مشکل جانتے ہوئے پیچھے کو بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ خندقوں سے چلنے والی گولیوں نے اُن کا تعاقب کیا اور اُنھوں نے زمین کی سلوٹ کے اُس پار پناہ لی جہاں سے وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔

محمد مالک نے ایک نظر سارے منظر پر ڈالی اور نیچے اُتر آیا۔ اُس نے فوجی کو آواز دینا نامناسب سمجھا اور گاؤں کی طرف تیزی سے چلا گیا۔ ٹرکوں کے گرد گاؤں کے لوگ جمع تھے اور اُسے دیکھتے ہی منتشر ہو گئے۔ چھ ٹرک تھے اور اُسے عملے میں سکھ بھی نظر آئے جنھوں نے اُسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔ ایک مسلمان فوجی نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

''ہم دو دنوں کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ جتنا جلدی ہو سکے ہمیں بھیج دیں تاکہ ہم رات کو ایک اور پھیرا لے جائیں۔'' محمد مالک جانتا تھا کہ وقت کی رفتار کم اور حالات کی تیز ہے۔ اُس نے فوراً آدمیوں کو ایک ایک ٹرک میں لوگوں کو بٹھانے پر مامور کیا اور کہا کہ حاجرہ اور حسنات پہلے ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ پھر اُس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا:

''ہاں! اور عبدالرشید کو بھی اُن کے ساتھ بٹھا دینا۔'' پھر وہ رکا، ''وقت ضائع نہ ہو، ٹرک جلد سے جلد نکل جانے چاہئیں۔''

وہ جس وقت گاؤں سے نکلا تو گولیوں کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے، پھر وہ اُس طرف چل پڑا۔ حملہ آور اُسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے پچھلی دو مرتبہ اُنھیں واپس ہونا پڑا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ کوٹھے کی طرف چلنے لگا۔ پھر اُس نے وہ دیکھا جس کی اُسے توقع نہیں تھی۔ لبانوں کے مورچوں میں سے سفید جھنڈے جیسی کوئی چیز بلند ہوئی اور اُسے ہوا میں لہرایا جانے لگا۔ گولیاں چلنا ایک دم بند ہو گئیں، جیسے ہر کوئی سکتے میں آ گیا ہو۔ حملہ آور شاید انتظار میں تھے، وہاں ''واہ گرو کی جے'' کا نعرہ بلند ہوا اور حملہ آور سفید جھنڈے والے مورچے کی طرف لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسے پار کر گئے۔ دوسرے مورچوں سے اُن پر گولیاں چلائی گئیں لیکن وقت گزر چکا تھا۔ حملہ آور تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگتے جاتے تھے اور ساتھ فتح کے بانگرے مارتے جاتے تھے۔ کسی کی نظر اُس پر پڑی اور اُس نے للکارا:

''وہ رہا بڑا اسان، محمد و مالکو!''

اور تب ایک شور بلند ہو: ''وہ رہا، وہ رہا۔'' ساتھ ہی فوجی اپنے مورچے میں سے نکلا، اُس کے ساتھ کئی اور نوجوان بندوقیں اُٹھائے اُس کی طرف بھاگے اور اُنھوں نے محمد مالک کو گھیرے میں لے لیا۔ دوسرے مورچوں میں سے بھی نوجوان باہر نکلے اور گاؤں کی طرف بھاگے، حملہ آوروں کے کئی گروہ بھی گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ اب وہاں زندگی اور موت ایک سرکس کی طرح تھے؛ کسی کے گولی لگی تو کسی کے رائفل کا بٹ، کسی کے پیٹ میں چھرا گھونپا گیا تو کسی پر برچھی سے وار ہوا۔ محمد مالک کے بائیں ہاتھ کو ایک کرپان ایسے چھو کر گزری کہ اُس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا جس کا اُسے پتا نہیں چلا تھا۔ وہ بغیر ہتھیار کے ہوتے ہوئے مسلح ساتھیوں کے گھیرے میں تھا؛ وہ حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے اُسے گاؤں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے اُن کے اشاروں پر عمل کرتے ہوئے گاؤں کی طرف جا رہا تھا، اُسے لگا کہ وہ یرغمالی ہے۔

''ایک آدھا ہتھیار مجھے بھی دو۔ میں اپنی حفاظت خود کرتا ہوں۔'' اُس نے بلند آواز میں کہا۔

''نہیں! ہم تمھارے جان نثار ہیں۔'' علم دین کی آواز آئی۔ پہلی مرتبہ تھا کہ کسی نے بھی اُس کی آواز میں منافقت محسوس نہ کی۔ محمد مالک کو لگا کہ اِس فقرے میں اُسے اپنی صدیوں کی

رفاقت کا صلہ مل گیا ہے۔ اُس نے سوچا: یہ ایسی جذباتی باتوں کا وقت نہیں، ابھی ٹھنڈے دماغ سے کئی کام کرنے ہیں۔ وہ اب گاؤں کے نزدیک تھے اور اُس وقت حملہ آوروں کا پہلا جتھہ گاؤں میں داخل ہونے کو تھا کہ ایک گھر کی چھت سے گولیاں چلنے لگیں۔ حملہ آور شاید اِس کے لیے تیار نہیں تھے، اُن کے خیال میں وہ مزاحمت ختم کر چکے تھے۔ گولیوں کی آواز کے ساتھ ہی اُس کے محافظوں نے ''یا علی'' کا نعرہ لگایا۔ اِس نعرے نے حملہ آوروں کو وقتی صدمے سے باہر نکالا اور اُنھوں نے ''واہ گرو کی جے'' کا جوابی نعرہ لگایا اور گاؤں کا دفاع کرنے والوں پر حملہ آور ہو گئے جو ایسی کسی بھی کارروائی کے لیے تیار تھے۔ وہاں میلوں میں لڑی جانے والی لڑائی لڑی جانے لگی؛ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے ساتھ بدفعلی، مذہب کی تضحیک، ملکوں پر لعنت اور نامردی کے ایک دوسرے پر الزامات لگاتے، برچھیوں، بلموں، تلواروں، کھونڈوں، ڈانگوں اور کرپانوں سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ پستول اور کاربین بھی چل رہے تھے اور جب یہ ہو رہا تھا تو محمد مالک اُس تمام شور، ہنگامے، افراتفری اور بے یقین قسم کی صورتِ حال میں سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں کسی گرے ہوئے سکھ سے چھینی ہوئی ایک نالی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی تھی۔ وہ سید ھا ٹرکوں کے پاس گیا جہاں پہلا پھیرا جانے کو تیار تھا۔ اُس نے اپنے خاندان کو جاتے ہوئے دیکھا اور ایک عجیب قسم کی اُداسی نے اُس کی حالت مکئی کے پتوں جیسی کر دی جو بارش کے بعد پانی کے وزن سے اپنے سر جھکا لیتے ہیں۔

اب وہ آزاد تھا!

اُسی وقت علم دین نے اُسے بتایا کہ عورتوں کی ایک پناہ گاہ کا دروازہ توڑ دیا گیا ہے اور وہاں قتلِ عام جاری ہے۔ ایک پریشانی اور خوف کی حالت میں وہ اُس گھر کی طرف چل پڑے۔ محمد مالک تیز تیز چلتے ہوئے وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اُس سے تیز چلا نہیں جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گلی کا موڑ مڑے سامنے سے دو عورتیں بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔ محمد مالک وہیں رُک گیا اور اُس نے ایک ہاتھ پیچھے کر کے بندوق ایسے چھپائی کہ سامنے سے آنے والوں کو نظر نہ آئے۔ اُسی وقت اُن عورتوں کے پیچھے دو سکھ اُنھیں پکڑنے کے لیے بھاگے آ رہے تھے۔

''بچاؤ ہمیں!'' ایک عورت پکاری۔ ''وہاں ظالموں نے ساری مار دی ہیں۔''

محمد مالک نے کوئی جواب نہیں دیا وہ عورتوں کو قریب آتے دیکھتا رہا اور اُن دونوں کی

طرف سے کوئی ردِ عمل نہ دیکھ کر تعاقب میں آنے والے سکھ دلیر ہو گئے۔ یہ دونوں چھوٹے گھر میں تھیں، کیا ساری ماردی گئیں؟ محمد مالک خاموش کھڑا انھیں اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عورتیں اُن دونوں کے پیچھے چھپ گئیں، دونوں سکھ اُسی رفتار سے اُن کے پیچھے بھاگتے رہے اور اب اتنے قریب آگئے تھے کہ محمد مالک اُن کے چہرے، چہروں پر پسینے کے قطرے، وحشت اور نفرت دیکھ سکتا تھا، اُس نے انھیں پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ اُن چہروں کو اپنی یادداشت کے کسی خانے میں نہ رکھ سکا۔ اُسی وقت اُس نے پیچھے سے بندوق نکالی، سامنے والے آدمی کی چھاتی کا نشانہ لیا اور گھوڑا دبا دیا۔ محمد مالک کو اپنی چھاتی پر ایک جھٹکا لگا، بارود چلنے کی آواز آئی، سکھ اپنی ہی رفتار کے زور پر اونچی چھلانگ لگانے کے آسن میں اوپر اُٹھا اور دوڑنے کی حرکت ختم ہونے پر زمین پر آرہا۔ دوسرے سکھ نے زمین پر گرے ہوئے ساتھی کو بے یقینی کے ساتھ دیکھا اور واپس بھاگا جہاں اِن دونوں کے تعاقب میں گاؤں کے لوگ آرہے تھے!

محمد مالک خون آلود کپڑوں میں، چند نوجوانوں کے ساتھ دس دن پیدل چلنے کے بعد، بھوک اور پیاس برداشت کرتے ہوئے، والٹن روڈ پر مہاجروں کے کیمپ میں پہنچا تو عبدالرشید کیمپ کے باہر بیٹھا، زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اُس نے محمد مالک کے خون آلود کپڑے دیکھے تو اُس میں دوبارہ اُس طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا باپ شدید زخمی ہوگیا ہے جس کا وہ ذمے دار ہے! اُسے اپنے باپ کو اِس طرح چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ محمد مالک نے سڑک پار کرتے ہوئے عبدالرشید کو دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں خوشی، اُداسی، جُدائی اور ملاپ کے آنسو آ گئے۔ پچھلے دس دِن زندگی اور موت کے کھیل میں سے گزرتے ہوئے واہگہ تک اِس خوف کے ساتھ پہنچا تھا کہ وہ اپنے خاندان سے شاید ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔ اُسے بار بار یہ خیال آتا، جسے وہ ایک احساسِ جُرم کے ساتھ کچھ خائف سا فوراً ذہن سے نکال دیتا کہ اُس نے اپنی ضد کی وجہ سے اپنا خاندان کھو دیا ہے۔ وہ عبدالرشید کے سامنے رک گیا جو ابھی تک زمین پر لکیریں لگائے جا رہا تھا۔

''عبدالرشید!'' محمد مالک نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔ اُسے اپنی آواز کھوکھلی اور کہیں دور سے آتے ہوئے محسوس ہوئی۔ جیسے ہی اُس کی آواز گلے میں سے نکلی اُسے اپنے وہاں ہونے اور عبدالرشید کی موجودگی کا احساس ہوا اور اُس کے تمام خدشات، وسوسے اور مفروضے جاتے رہے۔

عبدالرشید اُس کی آواز سُن کر بظاہر چونکا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا سر جھکایا اور محمد مالک نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ دونوں خاموش تھے اور ایک دوسرے کو بے یقینی سے دیکھتے تھے، جیسے شناخت کرنے کی کوشش میں ہوں۔

''تمھاری ماں اور......''

''دونوں ٹھیک ہیں،'' وہ رکا اور ایک اطمینان بھری ہنسی ہنستے ہوئے بات مکمل کی، ''آپ کے لیے پریشان تھیں اور مجھے روزانہ یہاں بھیج دیتی تھیں اور میں سارا دِن یہاں آپ کے انتظار میں

گزار کے رات کو واپس چلا جاتا تھا۔'' اُس نے پھر توقف کیا، باپ کے ساتھ آئے آدمیوں کو باری باری گلے لگایا: ''میاں جی! آپ یہاں ٹھہریں، میں انھیں اندر پہنچا کے آتا ہوں۔''

محمد مالک کچھ اور سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن اُس نے تمام حالات جانے بغیر کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ ابھی تک ماڑی بوچیاں سے نکلنے کے بعد اپنے آپ کو کہیں بھی رہنے کے لیے تیار نہیں کر پایا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اُسے ایک بار پھر رائے بوچہ ل بننا پڑتا ہے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی عورت کے ساتھ اکیلا تھا اور اُس کے ساتھ جوان بیٹا تھا جو اپنے کندھے پر خاندان کا بوجھ اُٹھانے کے لیے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بچھیرے کو لادو نکالنے کے لیے اُس پر آہستہ آہستہ وزن ڈالتے ہوئے نر گھوڑے میں تبدیل کیا جاتا ہے، اگر ایک دم وزن ڈال دیا جائے تو گھوڑا اڑیل ہو جاتا ہے اور یا اُس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ عبدالرشید ان دس دنوں میں لادو ہو گیا تھا، اُس نے اُس کے چہرے پر ایک بالغ پن دیکھا تھا جو ماڑی بوچیاں میں نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں بات کرتے ہوئے کہیں دور دیکھتی تھیں، ماتھے پر سوچ کی لکیریں، ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اور لہجے میں تلخی تھی۔

عبدالرشید انھیں لے کے کہاں چلا گیا تھا؟ پیچھے انسانوں کا ٹھیں مارتا ہوا ایک دریا تھا جس کا ہلکا ہلکا شور دور تک جاتا تھا جیسے ڈھکنے سے دبائی گئی ہانڈی میں دال کے پکنے کی آواز آرہی ہو۔ اُس نے پہلے اتنے آدمی ایک جگہ کبھی نہیں دیکھے تھے، یہ پیر غازی کے میلے سے بھی بڑا ہجوم تھا۔ پیر غازی کا میلہ جیٹھ میں لگا کرتا تھا اب وہ وہاں کبھی نہیں جا پائے گا۔ کشتی میں بیٹھنے سے پہلے اُس نے ایک نظر اپنے خون آلود کپڑوں پر ڈالی تھی، ایک اُداس سی نظر سے پیر غازی کی طرف دیکھا تھا اور پھر ماڑی بوچیاں کو مخاطب کیا تھا: ''دیکھ لو، جب ہم یہاں آئے تو خالی ہاتھ تھے۔'' اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر ہوا میں لہرائے تھے، ''اور اب میں یہاں سے جا رہا ہوں، دیکھ لو۔'' اُس نے پھر ہاتھ ہوا میں لہرائے، ''دونوں ہاتھ خالی ہیں اور،'' پھر اُس نے کُرتے کی دائیں جانب والی جیب باہر نکالی اور تہہ بند کھول کر جھاڑا، ''خالی جھولی لیے جا رہا ہوں۔ تم نے مجھے کچھ نہیں دیا لیکن میں تمھیں بسا کر جا رہا ہوں۔'' یہ سوچتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اُس نے کُرتے کے گھیرے سے اپنی آنکھیں خشک کیں، لمبی سانس لی اور پھر لوگوں کے ٹھیں مارتے دریا کی طرف منہ کر لیا۔ وہ اُن بے خانماں، خستہ حال لوگوں کو دیکھتے چلا جانا چاہتا تھا۔ عبدالرشید اُسے

وہاں کھڑا کر گیا تھا، اچھا ہوتا اُسے بھی ساتھ لے جاتا۔ اِن چند دنوں میں اُسے اکیلے رہنے سے خوف سا آنے لگا تھا۔ اُسے فوری طور پر گولیاں چلنے، نعرے لگنے، گھوڑوں کے ہنہنانے، فوجیوں کی سیٹیاں بجنے، مجھے بچاؤ اور ایک نالی بندوق کے چلنے کی آواز، گلیوں میں بھاگتے ہوئے قدم، خاموش راتوں میں سفر کرتے پاؤں گھسیٹنے، کہیں گیدڑ اور کتوں کی کسی لاش کو کھانے لیے ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے کی آواز، دِن کو کماد میں ہوا چلنے سے کسی کے آنے کی آوازیں اور راستہ گم ہونے کا وہم اُس کے سامنے آن کھڑے ہوتے اور وہ بے بس سا ہو جاتا۔

نو، راتیں ایک ختم نا ہونے والا تسلسل لیے ہوئے تھیں، وہ اندھیرا ہوتے ہی کچے گنے چوس کر چل پڑتے۔ ایک سڑک جو لاہور جایا کرتی تھی اب، کسی طرف جا رہی تھی اور وہ اُسے اپنے دائیں ہاتھ رکھ کے، اپنے اور سڑک کے بیچ میں تھوڑا فاصلہ چھوڑ کے چلتے رہے۔ راتیں خاموش ہوتے ہوئے بھی خاموش نہیں تھی۔ سڑک پر سے لوگوں کے قافلے چلتے رہتے تھے اور کبھی کبھی اُن قافلوں پر حملہ ہو جاتا؛ شور، چیخیں، گولیاں، گالیاں، نعرے، بھگدڑ اور پھر ایک لمبی چپ..... محمد مالک اور اُس کے ساتھی زمین پر لیٹ جاتے ایسے جیسے وہ لاشیں تھیں یا شروع سے زمین کا حصہ رہے ہوں۔ جب سڑک پر حملہ ہوا ہوتا تو محمد مالک اور اُس کے ساتھی بھی قافلے والوں کی مدد کے لیے جانا چاہتے لیکن اُنھیں اپنی جان بھی پیاری تھی اور وہ لاشیں ہی بنے رہتے۔ وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے چلتے، کسی درخت کے نیچے رکتے، دیر تک سامنے علاقے کا جائزہ لیتے اور جب کوئی سایہ، حرکت یا آواز سنائی نہ دیتی تو درخت کی حفاظت میں سے رینگتے ہوئے نکلتے، اور تھوڑی دور تک رینگنے کے بعد کھڑے ہو کے اپنا سفر شروع کر دیتے۔ راستے میں کئی گاؤں آتے جن کے گرد اُنھیں ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ گاؤں آباد تھے لیکن آباد ہونے کا شور نہیں تھا؛ ایسے ہی محسوس ہوتا کہ مرے ہوئے گاؤں میں کہیں کہیں لالٹینیں جل رہی ہیں۔ اُنھیں کتوں کا ڈر تھا کہ اُن کا بھونکنا اجنبیوں کی موجودگی کی چغلی کھا جائے گا۔ بھوک اُن کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ گنے اُن کی بھوک کا حل تو نہیں تھے لیکن اُن کے پیٹ میں ایک بدمزہ سا رس ڈال دیتے جو اُنھیں اِتنی طاقت دے دیتا کہ گرے بغیر وہ ساری رات چلتے رہتے۔ راستے میں کئی کنویں آئے لیکن محمد مالک نے پھیر دے کر پانی نکال کر پینے کی ممانعت کی ہوئی تھی۔ ایک تو چلتے کنویں کی رات کی خاموشی میں آواز دور تک جائے گی اور دوسرے ممکن تھا کہ کنویں میں زہر ڈالا گیا ہو۔ کبھی کسی گاؤں سے ہانڈی کی اشتہا انگیز خوشبو آتی تو اُن کے

معدوں سے نکلنے والے مادے منہ کو میٹھے سے لعاب سے بھر دیتے جنھیں نگل کر وہ وقتی سی طاقت حاصل کر لیتے۔ اُن میں سے کسی کا وہیں انتظار کرنے کا جی کرتا کہ گھر والوں کے سو جانے کے بعد چھکو میں رکھی دیگچی اُٹھا لائیں۔ یہ بھوک کو بہلانے کا محض ایک بہانہ تھا۔

محمد مالک نے ساری عمر حقہ پیا تھا، وہ تونئے کو ہونٹوں میں دبا کے سویا کرتا تھا اور جب کبھی آنکھ کھلتی تو نیم بیداری کی کیفیت میں ایک یا دو کش لے کر سو جاتا۔ اِس سفر میں خالی پیٹ اور حقے کی عدم موجودگی نے، اُسے محسوس ہوتا، معدے میں پتھر سے بنا دیے تھے جو بسیار کوشش کے باہر نہیں نکل سک رہے تھے اور وہ ایک مستقل اذیت میں مبتلا تھا۔ اُسے چلتے ہوئے چکر آتے رہتے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا بھی محسوس ہوتا لیکن اُس نے اپنی حالت کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور سب سے آگے چلتا رہا اور باقی اپنے دلوں میں اُس کی ہمت کی داد دیتے ہوئے اور بعض اوقات چاہتے ہوئے کہ جو ہونا ہے ہو جائے، اُنھیں صرف کھانا اور سونے کی جگہ مل جائے اور اِس کے عوض وہ کسی بھی ملک میں رہنے کو تیار تھے۔

اسوکی راتوں میں ہوا بند تھی اور وہ جب بھی رکتے، مچھروں کی فوج حملہ آور ہو جاتی اور محسوس ہوتا کہ اُنھیں کاٹ کاٹ کر زخمی کر دے گی۔ محمد مالک نے مچھر اُڑانے کے لیے اُنھیں جسم پر ہاتھ مارنے یا سر کے اوپر گردش کرتے مچھروں کو تالی کے ذریعے پکڑنے یا مارنے سے منع کیا ہوا تھا کہ یہ آواز رات میں دور تک سنی جا سکتی تھی۔

ہندوستانی سرحد پر اُن جیسے کئی گروہ اور قافلے موجود تھے اور وہ سب ریوڑ میں بھینسوں کی طرح، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش میں، ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ محمد مالک گنتی کر کے اپنے آدمی لے کر چل پڑا۔ اب اُسے جلد یا بدیر، حقہ ملنے کی اُمید بندھ گئی تھی۔ اُسے اپنی رفتار میں تیزی کے ساتھ اپنے خاندان سے ملنے کی اُمید اور نہ مل پانے کا خوف بھی تھا۔ جس طرف لوگوں کی لمبی قطاریں جا رہی تھیں، وہ بھی اُسی طرف چلے جا رہا تھا۔ یہ چلنا اُسے سردیوں میں دریا پر مرغابیوں کے چکر کاٹنے کی طرح لگا جنھیں پانی نیچے کھینچ رہا ہوتا تھا اور وہ اُس میں گرتی جاتی تھیں۔ اُمید کی رقاصہ اُس کے سامنے رقص کر رہی تھی اور وہ اُسی کے تعاقب میں چلے جا رہا تھا کہ اُس نے عبدالرشید کو دیکھ لیا۔ وہ جان گیا تھا کہ عبدالرشید نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا لیکن کسی مصلحت کے تحت زمین پر لکیریں کھینچنا شروع کر دی تھیں۔

محمد مالک، عبدالرشید کے انتظار میں کھڑا پریشان ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پچھلے دنوں کے واقعات نے اُس کے اندر ایک بے یقینی کے ساتھ ساتھ عجب طرح کی بے چینی اور وہم پیدا کر دیے تھے۔ راتوں کو چلتے ہوئے اُسے محسوس ہوتا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک جتھا اُن کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ کسی بھی وقت اُن پر حملہ کر سکتا ہے۔ وہ بار بار اُس جتھے کے متعلق اتنی شدت سے سوچتا کہ وہ جتھا اُسے نظر آنا شروع ہو جاتا اور وہ سب کو زمین پر لیٹنے کے لیے رکھا ہوا اشارہ کر دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن کے پیچھے کوئی جتھا نہیں لیکن اُس نے اپنے آپ کو یقین بھی دلا دیا تھا کہ کسی بھی وقت حملہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کھسیانہ سا اُٹھتا اور کوئی وجہ بتائے بغیر چل پڑتا۔

ایسی ہی پریشانی اُسے اب ہونا شروع ہو گئی تھی!

محمد مالک نے عبدالرشید کے پیچھے جانے کا سوچا لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ وہ اپنے اردگرد سے مکمل طور پر ناواقف ہے اور ایسا نا ہو کہ عبدالرشید کو ڈھونڈتے ہوئے وہ خود ہی گم جائے۔ اُس نے وہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور زمین پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

عبدالرشید جب واپس آیا تو دن ڈھلنے کے قریب تھا۔ کیمپ میں اب شور زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا محمد مالک کو دیکھتا رہا جو گھٹنوں پر تھوڑی رکھے گہری نیند سویا ہوا تھا، وہ اُسے جگانے کے بجائے وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جس طرح وہ سویا ہوا تھا، ایک تھکا دینے والا آسن تھا اور جلد ہی اُسے جاگ آ جانا تھی، یہ بھی اُس کے علم میں تھا کہ وہ اتنا تھکا ہوا ہوگا کہ شاید دو دن سویا ہی رہے۔ وہ بیٹھا محمد مالک کو دیکھتا رہا جو ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ اُسے اِس طرح سوئے ہوئے دیکھتے چلے جانے سے عبدالرشید کی پریشانی، دل چسپی میں تبدیل ہو گئی اور وہ اپنی پریشانی بھول کر مسکرائے جا رہا تھا۔ اُسے اپنے باپ میں ہمیشہ ایک سخت گیر اور سمجھوتہ نہ کرنے والا آدمی نظر آیا کرتا تھا جو اُسے خوف زدہ کیے رکھتا اور وہ اُسے دوسرے آدمیوں سے الگ لگتا آیا تھا۔ اِس طرح سوئے ہوئے وہ اتنا غیر محفوظ اور معصوم لگا کہ اُس کے لیے اُسے دیکھے جانا مشکل ہو گیا۔

"میاں جی! اُٹھو!" عبدالرشید نے اچانک اُسے ہلایا۔

محمد مالک ہڑبڑا کر اُٹھا، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس نے پھٹی پھٹی اور خالی نظروں سے اردگرد دیکھا اور پھر وہ حیران سا عبدالرشید کی طرف دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ اُس پر تمام حالت واضح ہونے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آنے لگی اور وہ ایسے مسکرانے لگا

جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"میں اُنھیں باقیوں کے پاس پہنچا آیا ہوں۔" عبدالرشید نے محمد مالک کے خون آلود کپڑے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے پوچھا: "یہ کیا ہوا ہے؟"

"معمولی سا زخم آ گیا تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تبدیل کرنے کو اور جوڑا نہیں تھا۔" محمد مالک نے اپنی قمیص کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب لوگ آرام سے ہیں؟ لگتا ہے کہ پوری خلقت یہاں اکٹھی ہو گئی ہے۔"

"آرام سے تو نہیں لیکن ایک طرح سے اکٹھے ہیں۔ کچھ خاندان منٹگمری کی طرف چلے گئے ہیں اور کچھ لائل پور کو۔ آہستہ آہستہ سب لوگ کسی نہ کسی طرف نکل ہی جائیں گے، یہاں بیٹھے رہنے کے لیے تو نہیں آئے!" اُس نے سوالیہ انداز میں بات کی۔ محمد مالک کو لگا کہ وہ بزدل ہو گیا ہے، وہ کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن پوچھنے سے خائف تھا، وہ جاننا چاہتا تھا کہ اُن لوگوں نے کہاں ٹھہرنا ہے؟ اُس کی ماں اور بیوی کہاں ہیں؟

"وہ کہاں ہیں؟ تمھاری ماں اور بہو؟" محمد مالک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنی شادی کے بعد کبھی اتنے عرصے کے لیے حاجرہ سے دور نہیں ہوا تھا اور پچھلے بارہ چودہ دن زندگی اور موت کے درمیان میں اِس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ اُسے حاجرہ کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ آج عبدالرشید کو صحت مند اور تازہ دم دیکھ کر اُسے اچانک حاجرہ کی کمی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ماڑی بوچیاں کی یاد نے اُس کی چھاتی پر ایک بوجھ رکھ دیا۔ وہ دریا، ونگوں، دیوان خانے اور اور نگ زیبی مسجد کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ گلیاں جہاں وہ کمہاروں کے گدھوں پر سواری کیا کرتا تھا اور جو اُس کے جوان ہو جانے کے بعد اُس کے قدموں کی منتظر رہتی تھیں، اب دشمن ہو گئی تھیں، وہ اب وہاں غاصب جانا جاتا ہوگا۔ اُس نے ایک لمبی سانس لے کر مایوسی کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا؛ اُسے وہی آسمان نظر آیا جو وہ اب تک ماڑی بوچیاں میں دیکھتا آیا تھا۔

"نزدیک ہی ہیں۔ تحصیل دار نے ایک فوجی گھر کا بندوبست کر دیا ہے۔ ہم کچھ دن اور وہاں رہ سکتے ہیں۔ تب تک میں کہیں بندوبست کر لوں گا۔ پورا شہر خالی پڑا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔" عبدالرشید کی آواز کے اعتماد نے اُسے ایک طرح احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ تھوڑے دنوں میں ہی خود مختار اور باخبر ہو گیا تھا؟ کیا ایسے تو نہیں کہ وہ کماد میں اُگے ہوئے پیپل کی طرح

رہا ہو اور اب کماد کٹ جانے کے بعد پیپل کی شاخوں نے پھیلنا شروع کر دیا ہے۔ اُسے ایک دم اپنی زمین کا خیال آیا۔ صدیوں سے جمع کیے ہوئے مرلے، کنالیں، بیگھے، ایکڑ اور مربعے، جو منتقل نہیں ہو سکتے تھے اور جو اُس کے تھے، اب نہیں رہے۔ کیا وہ بے زمینا ہو گیا تھا؟

ایلگین روڈ پر بیرکوں کی ایک لمبی قطار تھی جس میں آخری بیرک کے چار کمرے اُن کے تھے۔ دو کمروں کو ایک غسل خانہ ملائے ہوئے تھا جس میں لوہے کی بالٹی اور ٹب، دو مگے، دھات کا لوٹا اور دو لکڑی کے کرسی نما کموڈ پڑے تھے۔ غسل خانے میں ایک ٹوٹی لگی تھی جس کے نیچے ٹب رکھا ہوا تھا اور جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا۔ عارضی رہائش کے اِن کمروں کے سامنے ایک وسیع لان تھا جہاں پڑوسیوں کے بچے کھیل رہے تھے اور عورتیں جو تعلیم یافتہ لگتی تھیں، ہاتھوں میں سلائیاں لیے، گو سردی ابھی بہت دور تھی، کھیلتے ہوئے بچوں پر رائے دیتے ہوئے، سلائیاں چلانے میں بھی مصروف تھیں۔ گھاس کے لانوں کے پرے سڑک تھی اور سڑک کے پار کھلا علاقہ تھا جسے دیکھ کر محمد مالک نے سوچا: یہ میرا علاقہ ہے۔

حاجرہ اور حسنات ایک کونے میں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ اُسے آتے ہوئے دیکھ کر دونوں جلدی سے اُٹھیں، حسنات نے پیٹ پر ڈوپٹہ سیدھا کیا تو وہ جان گیا کہ بہو کا پاؤں بھاری ہے۔ حاجرہ جھجکتے ہوئے اُس کی طرف بڑھی اور بڑھتے ہوئے جھجکتی رہی، وہ اُس کے سامنے کھڑی مسکراتے ہوئے روتی رہی اور روتے ہوئے مسکراتی رہی، دھوپ میں بارش ہو رہی تھی۔ وہ خون آلود قمیص دیکھ کر خوف زدہ تھی اور محمد مالک کو چلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے زخم کا اندازہ لگا رہی تھی؛ اُسے چال میں کوئی تبدیلی نہ نظر آئی، صرف گھس کے ٹوٹنے کے قریب جوتی تھی، اُس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکلی۔

''حقہ ہوگا؟ واری لگائے دس دن ہو گئے ہیں۔'' محمد مالک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''عبدالرشید کے میاں! میں حقہ، تمباکو کا بورا اور دس پیسیاں گُڑ لے کر آئی تھی، میں نے سوچا کہ پتا نہیں یہاں تمبا کو تمھاری پسند کا ہو کہ نہیں۔'' حاجرہ نے اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

محمد مالک چارپائی پر بیٹھتے ہی لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ حاجرہ نے اُس کے جوتے اُتارے، نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اُس کے پیروں پر ٹکور کرنے لگی۔ سلائیاں چلاتی عورتیں بھی اُن کے نزدیک آ کھڑی ہوئیں اور آنسو بھری آنکھوں سے بے سدھ پڑے محمد مالک کو دیکھتی

رہیں۔ وہ حیران نہیں تھیں کہ محمد مالک سے بدتر حالت میں لوگ سڑکوں پر پڑے نظر آتے تھے اور اگر وہ اِس حالت میں انھیں کہیں باہر نظر آتا تو شاید دیکھتیں بھی نا۔

محمد مالک تمام رات ایک ہی کروٹ سویا رہا۔ وہ تینوں چارپائی ساتھ بچھا کر اُسے سوئے ہوئے دیکھتے رہے، اُن کے درمیان میں کوئی بات نہ ہوئی، ایسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ بولے تو محمد مالک کی نیند ٹوٹ جائے گی۔ حاجرہ بیٹھی خاموش آنسو بہاتی اور ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی، اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ محمد مالک اُس آگ میں سے زندہ بچ کر نکل آیا ہے جس کو ہر جگہ آزادی کہا جا رہا ہے یا وہ جو کبھی بے بس نہیں ہوتا تھا اِس طرح بے بس ہو کے سو سکتا تھا؟

کہیں دور کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دی اور اُس کے ساتھ ہی محمد مالک نے بھی کروٹ لی۔ حاجرہ نے حسنات کو نماز کے لیے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر عبدالرشید کی طرف غور سے دیکھا:

''میں جانتی ہوں کہ بوچہل کی روح ادھر ہی کہیں آس پاس ہے، کچھ نہیں کہے گی۔ آج تم بھی نماز پڑھ لو، تمھارا باپ خیریت سے آیا ہے۔''

عبدالرشید نیم اندھیرے میں منہ دوسری طرف کر کے مسکرایا اور اُٹھ کر نماز کے لیے چلا گیا۔ حاجرہ نے محمد مالک کی پیشانی کو چھوا، اُسے قدرے تسلی ہوئی کہ وہ رات کو ارد گرد گرنے والی شبنم کی وجہ سے ٹھنڈی تھی اور وہ بیمار نہیں تھا۔ محمد مالک ہاتھ کے لمس کی وجہ سے یا پھر یہ اُس کا روز جاگنے کا معمول تھا، آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا۔ اُس نے خالی سی نظر ارد گرد دوڑائی، وہ کچھ لمحوں کے لیے طے نہ کر سکا کہ ماڑی بوچیاں میں ہے، یا کسی گنے کے کھیت میں چھپا ہوا ہے اور یا پھر اُس جگہ جہاں کل شام اُسے عبدالرشید لے کر آیا تھا۔ پھر اُس کی حاجرہ کے ساتھ نظر ملی اور وہ جان گیا کہ کہاں پہنچ گیا ہے۔

''عبدالرشید کی ماں! میں اِس نئی اور ناواقف زمین پر بے ما لکا جاگا ہوں۔'' محمد مالک کی تکلیف میں ڈوبی ہوئی آواز نے اُس کے دل پر کھنڈی چھری چلا دی۔

''یہاں ساتھ کے کمروں والوں کی عورتیں بتاتی ہیں کہ وہاں سے آنے والوں کو اُتنا ہی ملے گا جتنا وہ پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔'' حاجرہ نے اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی آواز میں یقین کی کمی لگی، اُس نے خوف زدہ سا محمد مالک کی طرف دیکھا، وہ اُس کے خوف کو کہیں جان تو

نہیں گیا! لیکن وہ سیدھا لیٹا آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ حاجرہ جانتی تھی کہ ایک آدھ دن میں محمد مالک نے اپنے آپ کو مجتمع کر کے اپنی زمین کے لیے کوشش شروع کر دینی تھی۔ وہ مایوس تھا، اُس نے شکست نہیں کھائی تھی، ایک گاؤں جو اُنھوں نے آباد کیا تھا وہاں سے نکالے جانا..... یہ قدرتی سی بات تھی..... ایک صدمے سے کم نہیں تھا اور اُسے حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔

"حقے کی واری مل جائے گی؟ جنگل پانی بھی جانا ہے۔" محمد مالک نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا، "یہاں کوئی اولا نظر نہیں آ رہا۔"

"یہاں کرسی جیسی کھڈی ہے جو تمھیں پسند نہیں آئے گی۔ عبدالرشید کہیں باہر جاتا ہے۔ سامنے دور تک جگہ کھلی ہے، وہاں چکر لگا آؤ۔ میں لوٹے میں پانی لا دیتی ہوں۔" محمد مالک ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا، "تم اب جاؤ تب تک میں حقہ چالو کر لوں گی۔" وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔ عبدالرشید نماز ادا کر کے آ گیا۔ اُس نے اپنے باپ کو غور سے دیکھتے ہوئے اُس کی طبیعت کا اندازہ لگایا، وہ رات کے آرام کے بعد اُسے صحت مند لگا۔

"ماں جی لوٹا لینے گئی ہے۔ آپ سامنے سڑک پار کر جائیں تو دور تک خالی علاقہ ہے۔ تھوڑا اور آگے ایک رہٹ بھی چل رہا ہوتا ہے، وہاں میں کسی دن آپ کے ساتھ چلوں گا۔" محمد مالک کو عبدالرشید کو اتنا پُراعتماد دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

"ایسے ہی چکر لگانا ہے۔ کھایا ہی کچھ نہیں تو نکلنا کیا ہے۔"

عبدالرشید سر نیچے کر کے مسکرانے لگا۔ حاجرہ لوٹا لے کر آئی تو محمد مالک اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب روشنی ہونا شروع ہو گئی ہے۔ جانا تو ہے ہی لیکن بے پردگی ہو گی۔"

محمد مالک جب آیا تو حقہ چل رہا تھا اور حسنات پراٹھا تھالی میں لیے کھڑی تھی۔

"حقہ دیکھ کر میری حالت تو اُس بھینس کی طرح ہو گئی جسے بہت عرصے کے بعد چھپڑ یا نہر نظر آئے۔" محمد مالک ہاتھ ملتے ہوئے حقے کی طرف بڑھا۔

"پہلی واری ہلکی لینا، تمبا کو چھاتی میں نہ لگ جائے۔" حاجرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ محمد مالک نے چھوٹا سا کش لے کر دھوئیں کی کڑواہٹ بھری مٹھاس کو اپنے پھیپھڑوں میں جذب ہونے دیا اور پھر آنکھیں بند کر کے تمباکو کے سرور سے کچھ دیر لطف اُٹھایا۔ حسنات نے پراٹھے والی تھالی اُس کے سامنے رکھ دی۔ محمد مالک نے دوسرا کش لیا اور کسی قدر ناگواری کے ساتھ پراٹھے کی

طرف دیکھا:

''سوکھا پراٹھا ہی؟'' کسی نے جواب نہ دیا۔ ''پانی کا گلاس ہی پلا دو۔ ویسے بھی کئی دنوں سے پانی نہیں پیا۔ میں تو لوٹے کو ہی منہ لگا جا چاہتا تھا۔'' حاجرہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

''چائے بنائی ہے، تھوڑی ٹھنڈی ہو جائے تو میں خود لا دوں گی۔ اُس میں ابھی میٹھا نہیں ڈالا اور نمک کی چٹکی بھی ڈالنی ہے۔ بہوا بھی تک نمک حساب کا نہیں ڈال سکی۔ اور ہاں.....'' وہ رُکی، ''کھا کر نہا لو، تب تک میں تمھارے کپڑے دھو دوں گی۔ تمھیں ایک چادر دوں گی، تم وہ لپیٹ لینا۔ کپڑے جلد ہی سوکھ جاتے ہیں۔ دھوپ کافی تیز ہے اور ہوا میں سلابا بھی نہیں رہا۔''

''میں نے دکانیں دیکھی ہیں۔ چادر کرُتے سلوانے کا بندوبست کروں گا۔ آپ کے پاس کچھ صاف جوڑے ہونے چاہئیں۔'' عبدالرشید نے کہا۔ ایک مرتبہ وہ صبح گھومتے ہوئے ایک فوجی بازار میں چلا گیا تھا جہاں لوگ ہندو دکان داروں کی کاروباری ایمان داری کو یاد کرتے ہوئے اُن کی جگہ لینے والوں کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ اُسے حیرت ہوئی تھی۔ ملک ابھی آباد ہی نہیں ہوا تھا اور دکان داروں سے گاہک مایوس ہو گئے تھے۔ جب اچھی طرح آباد ہو گیا تو یہاں بے ایمانی تو فصلوں کی طرح اُگا کرے گی۔ اُسے یہ بھی پتا چلا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے چھوڑے ہوئے کاروبار مقامی لوگوں نے سنبھال لیے اور اُجڑ کر آنے والوں میں جو ہوشیار تھے، اُنھوں نے بھی قبضے کرنے شروع کر دیے، اِسی طرح کسی نے اُن کی زمین، گھر، حویلی اور دیوان خانے پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ وہ اِس طرح، کسی کی وساطت سے ملی عارضی رہائش میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ اُس نے ماں جی کے ضد کرنے پر اُس کی ایک انگوٹھی بیچ کر گھر کا نظام چلایا ہوا ہے جو ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ اُس نے سوچا کہ میاں جی آ گئے ہیں اور اُسے اب اپنے خاندان کو آباد کرنے کا سوچنا شروع کرنا چاہیے۔

''ٹھیک ہے۔ تم میرے کپڑے دھو دینا اور جب یہ سوکھ جائیں تو مجھے،'' اُس نے عبدالرشید کی طرف دیکھا، ''کل والی جگہ لے جانا جہاں ہمارے دیس سے آنے والے ٹھہرتے ہیں۔ یہاں میں کیا کروں گا سارا دِن؟ وہاں باتیں ہو جائیں گی'' عبدالرشید نے جواب نہیں دیا۔ حسنات نے برتن اُٹھا لیے اور ہاجرہ محمد مالک کو غسل خانے کی طرف لے گئی۔

اب یہ اُن کا معمول بن گیا۔ وہ ہر صبح عبدالرشید کو ساتھ لے کر کیمپ کی طرف چل پڑتا، اُن کے پاس حقہ ہوتا۔ محمد مالک کیمپ میں ماڑی والوں کے پاس بیٹھ جاتا اور وہاں اردگرد کے لوگ بھی آکر بیٹھ جاتے اور شام تک محفل جمی رہتی۔ وہ سب اپنے گھروں، مارے گئے رشتے داروں اور دوستوں اور کیمپ تک پہنچنے کی صعوبتوں کا ذکر کرتے، کیمپ میں اپنی بے سروسامانی اور سرکار کے نمائندوں اور رضا کاروں کی بے حسی کا رونا روتے۔ جہاں وہ نسل در نسل رہتے چلے آئے تھے اُسے راتوں رات بھول جانا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ اُنھیں اب فکر تھی کہ جو وہ چھوڑ آئے تھے اُس کے بدلے میں اُنھیں کیا ملے گا؟ جن کے پاس وہاں کچھ نہیں تھا اُن کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ اُن پر سبقت لے جائیں جن کے پاس وہاں بہت کچھ تھا، وہ یک دم ایک نظر نہ آنے والے نظام کا حصہ بن گئے اور جعل سازی کے ذریعے گھروں، جائیدادوں اور زمینوں پر قابض ہونے لگے۔ وہاں یہ باتیں ہوتیں، ہر روز کوئی نیا تعلق قائم ہوتا، ہر روز کوئی تعلق دار بننے والا کیمپ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاتا۔ وہ غیر مطمئن سے دن تھے، صرف محمد مالک مطمئن تھا۔ اُسے اب اپنی کھوئی ہوئی زمینوں کی فکر نہیں رہی تھی، وہ جان گیا تھا کہ عبدالرشید اتنا سمجھ دار ہو گیا ہے کہ وہ یہاں زمین الاٹ کروا لے گا۔ عبدالرشید اُسے کیمپ میں چھوڑ کر فیروز پور جانے والی سڑک پار کرتا اور ماڈل ٹاؤن کے چکر لگانا شروع کر دیتا۔ وہاں بڑے بڑے گھر تھے جو دو سڑکوں پر کھلتے تھے اور جن میں پھولوں کی کیاریاں تھیں، کیاریوں کے ساتھ لان تھے، نوکروں کی رہائش کے دو کمروں، باورچی خانہ اور غسل خانوں والے گھر تھے، کمرے سامان سے بھرے ہوئے تھے اور پھاٹکوں پر اُن کے پرانے مالکوں کے نام لکھے تھے یا ناموں کی تختیاں لگی تھیں۔ وہ اِن گھروں کے چکر لگاتا رہتا اور ایک گھر اُسے پسند آ گیا۔ اُس گھر میں ایک اناج گھر بھی تھا جس میں گندم اور چاولوں کی بوریاں پڑی تھیں اور جنھیں ابھی تک کسی نے اُٹھایا نہیں تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں سبزیوں کی کیاریاں تھیں اور ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا جو چلتا تھا اور پھولوں، لانوں اور سبزیوں کو پانی دیتا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی

ایک گھوڑے والا اصطبل تھا۔ وہ گھر میں رہنے والے چوکیدار کے ساتھ جو باورچی اور مالی بھی تھا، روز بیٹھتا اور اُس کے لیے محمد مالک سے چوری تمباکو کا ایک رسہ بھی لایا۔ چوکیدار اُسے ماڈل ٹاؤن کے لوگوں کی زندگیوں کے متعلق بتاتا۔ عبدالرشید کی عقل دنگ رہ گئی جب چوکیدار بخش نے اُسے بتایا کہ اِن سڑکوں پر لڑکیاں بائیسکل چلاتی تھیں اور راتوں کو دیر تک گھومتی تھیں۔ اُن کے درمیان میں ایک میٹھا سا تعلق بن گیا تھا اور بخش روز اُس کے انتظار میں ہوتا اور وہ اکٹھے چائے پیتے اور مختلف گھروں کا چکر لگاتے۔

''چودھری صاحب!'' ایک دِن بخش نے اُسے مخاطب کیا۔ عبدالرشید کو آج تک کسی نے چودھری نہیں کہا تھا اور اِس طرح مخاطب کیے جانے سے اُسے ایک برتری کا احساس ہوا اور اُس نے طے کر لیا کہ وہ اپنے آپ کو میاں جی کے بجائے چودھری کہلوائے گا۔ ''یہ باخلے صاحب کا گھر تھا۔'' وہ دونوں اُس گھر کے لان میں آم کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے جس کی شاخوں میں طوطوں نے شور مچایا ہوا تھا۔

''ہوں!'' عبدالرشید طوطوں کی آواز میں گم تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اُس نے کئی سال پہلے طوطوں کی یہ آواز کسی اور ملک میں سنی تھی۔

''باخلے صاحب بہت امیر آدمی تھے۔ اُن کے پاس کاریں تھیں، ہوائی جہاز تھے، سنا ہے کہ اُن کی اپنی ریل گاڑیاں تھیں اور سمندر کے جہاز بھی تھے۔ وہ بہت دیالو آدمی تھے، اُن کے دستر خوان چلتے تھے، ہندو، سکھ اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ گھر اُس نے بہت شوق اور محبت سے بنایا تھا اور جس صبح اُنھوں نے جانا تھا وہ تمام رات کمروں میں پھرتا رہا۔ اُس کا خاندان پوری رات وہاں''، اُس نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا، ''بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ باخلے صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے آواز دیتے اور میں اُن کے لیے کافی لے جاتا۔ کافی کا پتا ہے نا؟''

عبدالرشید نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ ایک کالے رنگ کی کڑوی چیز ہوتی ہے جس میں دودھ اور چینی ملا کے پیتے ہیں، جس طرح ہم لوگ چائے پیتے ہیں۔ کئی لوگ چینی اور دودھ نہیں ڈالتے۔ اُس رات باخلے صاحب بغیر چینی اور دودھ کے کافی پی رہے تھے۔ وہ آواز دیتے اور میں کتے کی طرح بھاگتا ہوا پہنچ جاتا۔ پتا ہے کافی کیوں پیتے ہیں؟''

عبدالرشید نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"یہ دماغ کو تیز اور چوکنا رکھتی ہے اور نیند بھی نہیں آنے دیتی۔" اُس نے خود ساختہ اہمیت کے ساتھ عبدالرشید کی طرف دیکھا جو اُسے غور سے سن رہا تھا۔ "باخلے صاحب کی آواز کسی کمرے سے آتی اور ہوتے کسی اور میں۔ وہ اِسی طرح کسی روح کی طرح کمروں میں پھرتے رہے اور میں چھلاوے کی طرح اُن کے پیچھے۔ صبح صبح، ابھی رات ہی تھی، اذانیں بھی نہیں ہوئی تھیں کہ باہر گاڑیوں کی آواز آئی اور پورا خاندان مجھے اور گھر والی کو مل کر چلا گیا۔ کاش کوئی طریقہ ہوتا کہ ہم بھی چلے جاتے۔ ہم چلے جاتے اگر مذہب راستے میں نہ آتا۔ چودھری جی! مذہب بھی چھوڑا جاتا ہے؟"

عبدالرشید نے اِس دفعہ بھی نفی میں سر ہلایا۔

"وہ چلے گئے اور ہم تمھارے آنے تک سوگ کی کیفیت میں تھے۔" بخش نے سگریٹ بجھاتے ہوئے ایک آہ بھری۔

"بخش!" عبدالرشید نے گھاس کی ایک پتی توڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں چودھری جی!" "یہ پتی دیکھ رہے ہو؟" اُس نے بخش کو گھاس کی پتی دکھائی، "اِسے میں نے توڑ لیا اور اب یہ اپنی ڈنڈی کے ساتھ کبھی نہیں جُڑ سکتی۔ ہم اور ہندو اور سکھ بھی ڈنڈی اور پتی کی طرح ہیں۔ بس ٹوٹ گئے اور اب جُڑ نہیں سکتے۔ ماڑی بوچیاں کے اردگرد تمام لوگ ہمیں پچھلے چار سو سالوں سے جانتے تھے لیکن وہ ایک رات ہی میں ہمارے دشمن ہو گئے۔ وہ ہمیں جان سے مار دینا چاہتے تھے لیکن ہم بچ کر نکل آئے۔ باخلے صاحب بھی بچ کر نکل گیا۔ کئی مارے گئے اور کئی بچ گئے۔ ایک بات یاد رکھنا!"

"کیا جی!" بخش کی آواز میں مرعوبیت اور ایک احترام تھا۔

"کسی نہ کسی دِن لوگوں نے آپس میں دوستی کر لینی ہے۔"

"سچ چودھری جی!" بخش کی آواز ایک فریاد لیے تھی۔

"ہاں! سچ!" عبدالرشید نے اعتماد سے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو میں باخلے صاحب کو ضرور ملنے جاؤں گا۔ گھر والی نے سنا تھا کہ وہ دلی جا رہے تھے۔"

''بخش!'' عبدالرشید نے اُسے ایک مرتبہ پھر مخاطب کیا۔

''ہاں چودھری جی!''

''اِس گھر نے اِس طرح خالی تو نہیں رہنا، کسی نہ کسی نے تو آباد ہونا ہے تو کیوں نا میں اپنے ماں باپ اور گھر والی کو لے آؤں؟'' عبدالرشید کے لہجے میں نرمی کے ساتھ ایک سختی بھی تھی جس نے بخش کو خائف کر دیا۔ وہ ایک دم اُس کی طرف دیکھنے آیا کہ اُسے سننے میں کہیں غلطی تو نہیں لگ رہی۔

''لے آؤ!'' بخش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں دونوں پھاٹکوں کو باہر سے تالا لگا دوں گا تا کہ کسی کو گھر خالی نہ لگے۔''

اُس شام محمد مالک کے ساتھ ایلگن روڈ کی طرف جاتے ہوئے عبدالرشید سارا راستہ چُپ رہا۔ وہ اپنے خاندان کو وہاں منتقل کرنے کا سوچ رہا تھا۔ باخلے کا گھر بڑا تھا اور وہ اُن کا اپنا ہوگا۔ وہ کسی دِن چودھری کے دفتر جا کر اُس سے ملاقات کر کے گھر میاں جی کے نام الاٹ کروا لے گا۔ اُس نے حقہ اُٹھایا ہوا تھا اور محمد مالک برابر میں چلتے چلتے اُس کے ہاتھ میں پکڑے حقے کے کش لیتا جاتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گھر والوں کو باخلے کے گھر میں منتقل کرنے کے بعد اُسے سات سو ایکڑ زمین کا ایسا رقبہ تلاش کرنا تھا جو ایک ہی جگہ پر ہو۔ کوئی پانچ یا چھ مہینے تک حسنات ماں بننے والی تھی، تب تک اُسے اپنے خاندان کی پوری جائیداد کا بندوبست کر لینا چاہیے۔

محمد مالک آج بھی روز کی طرح ایسی باتیں کر رہا تھا جن میں اُسے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ ماڑی بوچیاں سے آنے کے بعد محمد مالک اپنی سوچ اور گفتار میں توازن کھو چکا تھا۔ اُس نے اپنی زمین، گھر اور گاؤں کو خیر آباد کہنے کے بعد وہ اُن کا اپنا نہ ہونے سے سمجھوتا نہیں کر سکا تھا۔ وہ تھا بھی حق بجانب، وہ گاؤں جس میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہاں سے وہ اپنی جان بچا کر بھاگا تھا۔ باخلے بھی یہاں سے بھاگا تو تھا لیکن ایک شان کے ساتھ گیا۔

رات کو حسنات جب کھانے کے برتن اُٹھا چکی اور ہاجرہ حقہ تازہ کر کے اُن کے پاس بیٹھ گئی تو عبدالرشید نے بات شروع کرنے کا سوچا۔

''میاں جی! میں سوچ رہا تھا کہ اب آنے والے وقت کے بارے میں سوچیں۔ ہم یہاں اِس طرح تو بیٹھے نہیں رہ سکتے۔'' محمد مالک کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک سی آئی لیکن وہ

جلد ہی اُسے چھپا گیا۔ وہ عبدالرشید کو ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''ایک تو میں لائل پور جاؤں گا، وہاں میرے دو سوتیلے ماے بھی ہیں۔ وہ ضرور کوئی مشورہ دیں گے۔ منٹگمری بھی جانا ہوگا اور گوجران والا تو ساتھ ہے، سنا ہے وہاں سکھ زیادہ تھے اور کافی رقبے خالی پڑے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم رقبہ پسند کر کے مجھے دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے جانا۔ اگر مجھے اردگرد پسند آ گئے تو الاٹ کروا لینا۔ سنا ہے اُس کے لیے ہندوستان سے ملکیت کے کاغذوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' محمد مالک نے اپنی اہمیت بھی قائم رکھی اور وہ عبدالرشید کی سوچ سے خوش بھی تھا۔

''کاغذ آتے رہیں گے۔ اُس میں چاچا تحصیل دار بھی ہماری مدد کرے گا اور پھر وہ ضمانت دے سکتا ہے کہ ہم وہاں بڑے مالک تھے۔'' اُس نے کاغذوں کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ جگہ،'' اُس نے کمروں کی قطار کی طرف اشارہ کیا، ''ہمیں چاچے تحصیل دار نے عارضی طور پر لے کر دی ہے۔ میں نے ایک گھر دیکھا ہے جہاں ایک نوکر بھی ہے۔ کل ہم وہاں چلے جائیں گے، یہاں اگر کوئی فوجی آ گیا تو اُنھوں نے ہمیں ایک بار پھر مہاجر کر دینا ہے۔''

ہاجرہ اور محمد مالک نے ایک دوسرے کو بے یقینی کے ساتھ دیکھنے کے بعد ایک ہی وقت میں عبدالرشید کو دیکھا جس کی آنکھوں میں اُنھیں ارادے کی پختگی نظر آئی۔ محمد مالک کو گھر کا انتظام اپنے بیٹے کے ہاتھوں میں منتقل ہوتے لگا، وہ خوش تھا کہ اُس نے آخری معرکہ لڑ کر کمان بیٹے کے حوالے کر دی ہے۔ اُس نے یک دم اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔

''ہم وہاں جائیں گے کیسے؟'' ہاجرہ نے پوچھا۔

''میں صبح فوجی بازار سے تانگہ لے آؤں گا۔ ہمارے پاس سامان کون سا اتنا زیادہ ہے اور جانا بھی دور نہیں۔ چاچے تحصیل دار کا دفتر وہاں سے دور نہیں کل اُسے بھی مل آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے ہم دونوں فجر کی نماز کے بعد تیار ہوں گی، دیر تمھارے میاں کی اور تمھاری ہونی ہے۔''

اگلی صبح نئی تھی، معمول کے خلاف۔ وہ تانگے میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن گئے۔ سڑکیں ابھی خالی تھیں اور کاتک کی شفاف اور ہلکی ہلکی دھند میں موسم کی تبدیلی کے آغاز کا پیغام تھا۔ ہاجرہ کو کھیسوں اور لحافوں کی فکر لاحق ہو گئی۔ ابھی سردی آنے میں تھوڑا عرصہ تھا لیکن تیاری ہونی چاہیے

اور اُن کے پاس تو بستر تک نہیں تھے۔ ماڈل ٹاؤن کا گھر اُن کی توقع سے بڑا تھا اور وہاں اُنھیں احساس ہوا کہ دنیا کتنی مختلف ہے۔ محمد مالک بار بار گروا کر گھر کی پیائش کرتا اور ہاجرہ کو آ کر بتاتا: ''عبدالرشید کی ماں! پورے چار کنال ہیں۔''

وہ بھی حیرت میں مسکرا دیتی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ماڑی بوچیاں سے باہر فوجی ٹرک میں نکلی تھی اور اُس کے لیے لاہور جو اُجڑنے کے بعد آباد ہونے کے عمل میں تھا، ایک خواب کی تصویر تھا۔ وہ درختوں کی قطاروں والی کھلی سڑکوں، عالی شان گھروں اور اپنی سوچوں میں گم مختلف قسم کے لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھتی تو اُسے لگتا کہ یہ کوئی نئی دنیا ہے جو ماڑی بوچیاں سے الگ اور خوب صورت ہے۔ وہ کسی کو اپنے احساسات بتاتی نہیں تھی اور یہی ظاہر کرتی کہ جو وہ دیکھ رہی ہے وہ معمول ہی تھا۔ باخلے کے گھر میں اُسے وہ سب مل گیا جو اُسے گھر چلانے کے لیے چاہیے تھا۔ وہاں اتنے بستر تھے کہ ایک بارات کو سلایا جا سکتا تھا، ہر طرح کے، کچے اور کانچ کے برتن تھے۔ اناج گھر میں گندم اور چاول کی بوریاں، دالیں اور بہت سا نمک سک پڑا ہوا تھا اور اُسے گھر کی مالکن کے سگھڑپن پر حیرت ہوتی۔ وہ آتے ہوئے اپنا قران شریف لے آئی تھی جو اُسے پڑھنا نہیں آتا تھا۔ حسنات قران شریف پڑھ سکتی تھی، اُس نے اُس سے ہر کمرے میں ایک سیپارہ پڑھوایا اور پھر بخش کی بیوی کے ساتھ مل کر ہر کمرے کو دھو کر پاک کیا اور پھر حسنات اور بخش کی بیوی نے تمام برتن پاک کیے اور باخلے کے گھر کو مسلمانوں کے رہنے کے قابل کیا۔

بخش اِن لوگوں کے آنے سے مطمئن تھا، باخلے کی جگہ لینے والے سادہ اور کھلے دل کے لوگ تھے، اُس نے کبھی اُنھیں کسی کی بُرائی کرتے یا کسی کا بُرا چاہتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ لوگ اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔ عبدالرشید ناشتہ کر کے کسی طرف نکل جاتا اور محمد مالک یا تو چارپائی بچھا کر آم کے نیچے لیٹ جاتا اور یا حقہ لے کر کیمپ جا کر وہاں کے حالات معلوم کر کے رات دیر تک اُسے دِل ہلا دینے والے قصے سناتا۔ دونوں عورتوں کے اُس کی بیوی کے ساتھ اچھے تعلقات بن گئے تھے اور وہ بھی اُسے عام عورتوں سے الگ لگیں۔ بہو سارا دن گھر کے کام کرتی یا ساس کے پاس خاموش بیٹھی اُس کی باتیں سنتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی رہتی۔ شروع شروع میں بہو کام میں اتنی دل چسپی نہیں لیتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس نے ساس کو ہر کام سے فارغ کر دیا؛ وہ صفائی کرتی، برتن دھوتی، کھانا بناتی، سسر کا حقہ تازہ رکھتی اور اُس کے پاس ساس کے پاس بیٹھنے کا

بھی وقت ہوتا۔ اِسی وقت میں وہ تلاوت بھی کرتی۔ جب کبھی ساس اُس کی حالت کی وجہ سے اُسے کام سے منع کرتی تو وہ ہمیشہ جواب دیتی:

''چاچی جی! میں ڈاکٹر کی بیٹی ہوں اور میرا باپ امرتسر سے جب کبھی دو یا تین دن کے لیے ماڑی بوچیاں آتا تھا تو یہاں سے دوا کی پڑیاں بنوا کر لے جاتا تھا۔ وہ پڑیاں میں بناتی تھی، کسی اور کو نہیں بنانے دیتا تھا۔ میں نے اُسے کئی عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ ایسی حالت میں زیادہ زیادہ کام کرنا چاہیے۔''

ساس ایک لمبی سانس لے کے چُپ ہو جاتی۔ وہ اگلی بات جانتی تھی۔ اُس کی بہو نے کہنا تھا کہ وہ ایک چمچ چینی، بالکل تھوڑا سا نمک اور چٹکی راکھ کی ڈالتا تھا اور شام کو علاج کروانے کے لیے آنے والے مریضوں کو بیچتا جو اِن پڑیوں کو پانی یا دودھ کے ساتھ کھا کے صحت مند ہو جاتے کیوں کہ اُس کے ہاتھ میں شفا تھی اِس کے علاوہ وہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا سونا بن جاتی؛ اُس کی دولت اور جائیداد کا کسی کو اندازہ ہی نہیں۔ وہ تو بس کمائے جا رہا ہے۔

اُسے دونوں میاں بیوی میں تبدیلی نظر آئی، یہاں آنے کے بعد اُنھوں نے گھر کے معاملات سنبھال لیے تھے، محمد مالک سارا دِن چارپائی پر لیٹا رہتا، اُسے کوئی فکر نہیں رہی تھی کہ کھانا پینا کیسے چل رہا تھا، وہ خود بھی بہو کے فارغ ہونے کے انتظار میں رہتی کہ وہ فارغ ہو کے اُس کے پاس آجائے اور باتیں سنیں۔ وہ جب تک باتیں نہ کر لیتی اُسے ایک اُلجھن گھیرے رہتی کہ کچھ غلط ہو رہا ہے جس کا اُسے پتا چلانا چاہیے۔ اُسے باتیں کیے جانا پسند تھا، سنتے ہوئے اُلجھن ہوتی۔

محمد مالک آم کے نیچے لیٹا ماڑی بوچیاں کو یاد کرتا رہتا۔ اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اور ماڑی بوچیاں کبھی دو ہو جائیں گے۔ آج وہ لاہور میں بے یارومددگار اپنے خاندان کے ساتھ کسی کے گھر میں ٹھگوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جس کے گھر سے کتنے لوگوں کو رزق ملتا تھا آج اُس کا کھا رہا تھا جو یہاں سے دور کسی اجنبی شہر میں اُسی حالت میں ہوگا جس میں کہ وہ ہے۔ اُسے اپنے آپ پر ترس آیا، اُن پر ترس آیا جو اُس کی طرح تھے، اُن پر ترس آیا جنھیں نفرت کے نام پر مارا گیا اور اُن پر بھی ترس آیا جو اپنی نفرت کی پیاس بجھانے کے لیے بے گناہوں کو اِس لیے مار رہے تھے کہ شاید اُنھیں جان کی قیمت یاد نہیں رہی تھی۔

وہ معمول کے مطابق ایسی باتیں سوچ رہا تھا کہ اُسے پھاٹک سے ایک تانگہ اندر آتا

دکھائی دیا۔ اُس نے تانگے کے نزدیک آنے پر دیکھا کہ اُس میں تحصیل دار اور عبدالرشید بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹاپوں کی آواز سن کر بخش اپنے گھر میں سے بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے گھوڑے کو سرپوش سے پکڑ کر روکا۔ تحصیل دار نے اُسے داد بھری نظر سے دیکھ کر گھر کا جائزہ لیا اور پھر عبدالرشید پر تعریفی نگاہ ڈالی۔ محمد مالک آم کے نیچے سے شور کرتا ہوا اُٹھا کہ چیونٹی کے گھر سلطان آیا ہے۔ وہ اِس شور میں اپنی بے بسی کے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے، خاموش، پریشان، دکھی اور محبت سے بھرے ہوئے۔

''چودھری صاحب! اچھے وقت میں آپ کے گھوڑے کو چنے اور تازہ چارہ ملتا تھا۔'' محمد مالک نے بغیر مصافحہ کیے دل گیر آواز میں کہا۔

محمد بخش پاس ہی کھڑا گھوڑے کو تانگے میں سے نکال رہا تھا۔ اُس نے فخریہ لہجے میں کہا:

''چودھری صاحب! آدھی بوری دَلے ہوئے چنوں کی ہے اور اصطبل میں ڈیڑھ یا دو بوریاں توڑی سے بھری پڑی ہیں۔ میں ابھی گھوڑے کی سیوا کا بندوبست کرتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''تم گھوڑے کو دانہ ڈال کر بازار سے گوشت، مرغیاں اور سبزی لے کر آؤ۔'' اُسی وقت عبدالرشید تحصیل دار کے لیے کرسی اُٹھائے لے آیا۔ ''چاچا جی بیٹھیں!'' اُس نے سائے کے کونے پر کرسی رکھتے ہوئے کہا جہاں دھوپ کی شدت نہیں تھی اور سایہ بھی ٹھنڈا نہیں تھا۔

''گھر بتاؤ کہ کھانا تیار کریں۔''

حقہ آ گیا اور دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے، عبدالرشید نے اپنے لیے ایک طرف موڑھا رکھ لیا۔

تحصیل دار کو اِن چند مہینوں میں محمد مالک کے اندر تبدیلیاں نظر آئیں، اُس کی کمر میں کسی حد تک جھکاؤ آ گیا تھا، اُس کے ماتھے کی لکیریں گہری اور واضح ہو گئی تھیں اور آنکھوں میں لاچاری تھی۔ اُسے لگا کہ اُس کے سامنے ایسا آدمی کھڑا تھا جس کی چودھری محمد مالک کے ساتھ مشابہت تھی۔ اُس نے اپنے تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ اُس نے گھر کو ایک بار پھر تعریفی نظر سے دیکھا اور اِس کا انتخاب کرنے پر عبدالرشید کو دل ہی دل میں داد دی۔ اُسے محمد مالک کو دیے ہوئے تمام مشورے یاد تھے جو درست ثابت ہوئے۔ وہ مہاجروں کی اکثریت سے کافی مایوس ہوا جو آتے ہی جعل سازی میں ملوث ہو گئے جو وہ مقامی لوگوں کی تقلید میں کر رہے تھے۔ مقامی لوگ

شہری جائیدادوں کو سنبھالے جا رہے تھے اور دیہات میں مہاجروں کا ایک ایسا گروہ بن گیا تھا جو بین الاضلاعی جعل سازی میں مصروف تھے۔

وہ دونوں خاموش بیٹھے حقے کی واری لیتے رہے۔ تحصیل دار کو لگ رہا تھا کہ محمد مالک کسی ذہنی اور نفسیاتی ناہمواری میں سے گزر رہا تھا؛ اُسے دکھ ہوا۔

''چودھری صاحب! کسی سے ملاقات ہوئی؟'' تحصیل دار نے بات شروع کرنا ضروری سمجھا۔

''سڑک کے پار ہی کیمپ ہے، وہاں جاتا رہتا ہوں۔ دل خراب ہوتا ہے۔ اپنے لوگ بھی ہیں۔'' محمد مالک نے اپنے تاثرات بتائے۔

''ہم لوگ کوشش تو کر رہے ہیں کہ جتنا جلد ہو سکے زمین الاٹ کر دی جائے۔ قبضہ لینے کی بھی مشکلات ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' محمد مالک نے دل چسپی سے پوچھا۔

''مقامی لوگوں نے قبضے کیے ہوئے، دوسرا یہ کہ مزارعے جو زمین کاشت کر رہے تھے وہ اُن زمینوں کو خالی نہیں کر رہے۔''

محمد مالک کو اِس بات سے کافی حیرت ہوئی کہ زمین مالکوں کے حوالے کیے جانے میں رکاوٹ کیوں تھی؟ کیا حکومت غیر موثر تھی یا نا تجربہ کار؟ پچھلے ملک میں جہاں انگریز کی حکومت تھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتی تھی اور یہاں مالکوں کو اُن کی زمینوں کا قبضہ نہیں مل رہا تھا!

''اِس کا حل کیا ہوگا؟'' محمد مالک نے قدرے درشتی سے پوچھا، ''ایسے حالات میں تو لوگ ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیں گے۔'' اُس نے اب قدرے متوازن لہجے میں کہا لیکن اُس کی پریشانی جوں کی توں قائم تھی۔

''وقت لگے گا۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو مزارعوں کی حمایت کر رہے ہیں۔'' تحصیل دار نے یقین دہانی والے لہجے میں کہا۔

''ہم تو انگریزوں کا نظام دیکھے ہوئے ہیں جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔''

''اتنا انصاف تو یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ ہم نے ملک کو سیدھے راستے پر ڈالنے کے بجائے روڑے اٹکانا شروع کر دیے ہیں۔''

”کیسے؟“ محمد مالک نے پریشانی سے پوچھا۔

”کچھ ایسی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو مزارعوں کو اُکسا رہی ہیں کہ وہ مالکوں کو حصہ نہ دیں یا قبضہ واپس نہ کریں۔ اور اگر کوئی چارہ نہ ہو تو آدھا حصہ دینے کے بجائے تیسرا دیں کیوں کہ پیداوار اُن کی محنت کی وجہ سے ہی ہو رہی ہے۔“ تحصیل دار کی اِس اطلاع سے محمد مالک پریشان ہوا۔ اُس نے ایک نظر عبدالرشید کی طرف دیکھا جیسے اُس کی تائید چاہتا ہو۔ پھر اُس نے حقے کا ایک کش لیا:

”سچی بات ہے کہ بہت دنوں کے بعد حقے کا لطف آ رہا ہے۔ میں تو یہاں ارد گرد کے گھروں کے ملازموں کو اکٹھا کر کے بس وقت گزاری کے لیے محفل لگا لیتا ہوں۔“ وہ ایک تلخ سی ہنسی ہنسا: ”کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ مالکوں کو اُن کی جائیدادوں سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”آج کل ایک نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ دنیا بھر کے مزدورو اکٹھے ہو جاؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملک میں ہر ایک برابر کا حصے دار ہو، کسی کی ذاتی جائیداد یا ملکیت نہ ہو۔“

”یہ تو خون خرابہ کرنے والی بات ہے۔“ اُسی وقت بخش ایک میز اُٹھائے ہوئے آیا اور محمد مالک نے اُسے حیرانی کے ساتھ دیکھا۔ وہ میز کو چودھری کی چار پائی اور تحصیل دار کی کرسی کے درمیان رکھ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ٹرے اُٹھائے ہوئے آیا۔

”وقت بدل گیا چودھری صاحب! ہم چار پائی پر آلتی پالتی مار کے کھانا کھاتے تھے اور اب میزیں رکھی جانے لگی ہیں۔ زمینوں پر قبضوں کے منصوبے بن رہے ہیں۔ ہم قتل ہوتے ہوئے اِسی لیے یہاں آئے تھے۔ میرے گاؤں کی کتنی عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو مار دیا گیا، شکر ہے کہ کسی کی عزت نہیں لُٹی جو آپ نے نہیں ہونے دیا۔“

تحصیل دار نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا، تینوں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ عبدالرشید کو احساس ہوا کہ دونوں آدمی اپنے اپنے مزاج سے ہٹ کر گفتگو کر رہے تھے، اُن کی باتوں میں پرانے وقتوں والی بے ساختگی نہیں تھی۔ وہ خود بھی اپنے آپ میں ایک تبدیلی محسوس کر رہا تھا، یہاں آنے کے بعد وہ چیزوں کو اُس طرح نہیں دیکھ رہا جس طرح دیکھنے کا عادی تھا۔ اُسے اپنے ہر عمل میں ایک خود غرضی کا احساس ہوتا، جیسے وہ کسی کو شکست دینا چاہتا ہو۔ اُسے حیرت ہوتی کہ کیا اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد انسان تبدیل

ہو جاتا ہے؟ کیا یہ تبدیلی صرف اُس کے اندر ہی آئی تھی یا اُس کی طرح تمام آنے والے متاثر ہوئے تھے؟

تحصیل دار گلاس ہاتھ میں لیے ایک طرف جا کے کُلی کرنے لگا اور جیسے کوئی اشارہ ہو، بخش اُسی وقت حقہ لے آیا۔ ٹوپی میں دہکتے ہوئے کوئلوں میں سے گرمی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ بخش نے ایک لمبا کش لے کر نے تحصیل دار کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے ایک چھوٹا سا تجرباتی کش لے کر تعریفی نظر سے بخش کی طرف دیکھا:

"تمھیں چلم بھرنا آتی ہے۔" تحصیل دار نے لمبا کش لے کر نے محمد مالک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ خود تو تمباکو سے سخت پرہیز کرتے تھے لیکن اُن کا کہنا تھا" وہ رکا اور ایک ہلکی سی مؤدبانہ ہنسی ہنسا، "کہ مجھے لاہور میں سب سے اچھی چلم بھرنی آنی چاہیے۔ میں کئی دوپہریں، جب وہ سو رہے ہوتے، بھاٹی جا کر حقے کے ساتھ محفلیں لگانے والوں کی صحبت میں بیٹھتا اور اُن کے لیے ایک آدھ چلم بھر کے واپس چل پڑتا۔" بخش نے ایک آہ بھرتے ہوئے فخریہ انداز میں سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کون؟" تحصیل دار اِس چھوٹی سی کہانی سے مرعوب نظر آیا۔

"باخلے صاحب، جن کا یہ گھر ہے۔" عبدالرشید کو بخش کی آواز میں یہ گھر کہتے ہوئے ہلکے سے طنز کا سایہ نظر آیا جیسے باخلے کو تحصیل دار کی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑا ہو۔

"یہ باخلے کا گھر تھا؟" تحصیل دار نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ اُسے جانتے ہیں؟" عبدالرشید پہلی دفعہ بولا۔

"نہیں، لیکن وہ ایک مشہور آدمی تھا، لاہور میں رہنے والے ہر آدمی نے اُس کا نام سُن رکھا تھا۔"

"ہر شام اُن کے ملنے والے آتے اور دیر تک محفل جمتی۔ میں حقہ تازہ رکھتا، گلاس اور چائے کی پیالیاں خالی نہ ہونے دیتا۔" بخش نے اطلاع دی۔

"اُدھر وہ بھی اب ہماری طرح ہی ہوگا۔" محمد مالک نے تلخی سے کہا۔ تحصیل دار کے ہونٹوں پر ایک بجھی ہوئی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور بخش نے ایک آہ بھر کر برتن اُٹھانا شروع

کر دیے۔ تحصیل دار خاموشی سے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا، وہاں بدستور خاموشی تھی، لگ رہا تھا کہ دونوں بخش کے کام ختم کر کے چلے جانے کے انتظار میں تھے۔ تمام برتن اُٹھائے جا چکے تو بخش میز اُٹھا کر چلا گیا جو اشارہ تھا کہ کام ختم ہو گیا ہے۔

''چودھری جی! چند ایک تجویزیں ہیں جو آپ کو دینی ہیں۔'' تحصیل دار نے محمد مالک کے جواب کا انتظار کیا اور اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بات جاری رکھی، ''ہم نے یعنی رشید اور میں نے اِن تجویزوں پر تفصیل سے بات کی ہوئی ہے۔ ہمیں صرف آپ کی ہاں چاہیے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ ماڈل ٹاؤن کا یہ گھر جس میں آپ رہ رہے ہیں آپ کو الاٹ کر دیا جائے، دوسری تجویز یہ کہ اِس گھر کے علاوہ جی پی او کے سامنے ایک چار منزلہ عمارت ہے جو آپ کو الاٹ کر دی جائے گی......''

محمد مالک کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔ تحصیل دار اپنی بات بیچ میں چھوڑ کر خوف زدہ سا خاموش ہو گیا۔ عبدالرشید نے بھی بے چینی سے موڑھے پر اپنی جگہ بدلی۔ وہ اپنے باپ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا، اُس نے اُسے ایسی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُس کے کندھے دبانے کے لیے اُٹھنے ہی والا تھا کہ محمد مالک کا ساکت جسم ایک جھٹکے سے بیدار ہوا، ''چودھری صاحب! میں آپ کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ یہ گھر دے کر آپ مجھے بے عزت کرنا چاہتے ہیں اور وہ عمارت دے کر مجھے بنیا بنانا چاہتے ہیں کہ میں حقہ ہاتھ میں لیے دکان داروں سے کرائے وصول کرتا پھروں۔ آپ نے نا صرف میرے ساتھ زیادتی کی ہے میرے بیٹے کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔''

تحصیل دار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا، عبدالرشید کو شرم ساری ہو رہی تھی اور وہ تحصیل دار سے اپنے باپ کے رویے پر معذرت بھی کرنا چاہتا تھا، پھر اُسے خیال آیا کہ تحصیل دار اور وہ دونوں دوست ہیں وہ خوامخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ ممکن ہے اگلے لمحے تحصیل دار ہی کوئی ایسی بات کر دے، جس سے اُس کے باپ کی دل آزاری ہو جائے۔

''آپ کو اگر اتنی ہمدردی ہے تو یہ گھر بخش کو الاٹ کر دیں۔'' اِس دفعہ محمد مالک کی آواز میں غصہ نہیں تھا۔ ''وہ بغیر کسی معاوضے کے ہماری خدمت کر رہا ہے۔''

''میرا وعدہ ہے کہ اُسے اُس کی حیثیت کا کوئی گھر الاٹ کر دوں گا، یہ والا گھر آپ رکھ

لیں۔ آنے والے وقت میں اِس نے آپ کی پوری زمین سے مہنگا ہو جانا ہے۔'' اِس بار تحصیل دار تجویز دینے کے بجائے التجا کر رہا تھا۔

''میں نے شہر میں نہیں رہنا۔ یہ دو دنوں میں آپ کے بہکاوے میں آ گیا، جب یہاں پکا رہے گا تو جائیداد بیچ کر منڈ دوں پر لگائے گا۔ مجھے تو کسی گاؤں میں جانا ہے جہاں بوچہل رائے کی زمین محفوظ رہے۔''

''گاؤں میں زمین لیں، کیوں نہیں لینی اور یہ بھی رکھیں۔'' تحصیل دار نے آخری کوشش کی۔

''آپ لگا تار مجھے بے عزت کر رہے ہیں۔ جو گھر میں بغیر کسی معاوضے کے کام کرنے والے کو دینے کی سفارش کر رہا ہوں، اُس کی اہمیت کا آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔''

تحصیل دار نے جواب دینے کے بجائے مایوسی سے عبدالرشید کی طرف دیکھا جو سر جھکا کر اپنے تاثرات چھپائے ہوئے تھا۔ وہاں ایک پریشان کن خاموشی چھا گئی۔ بخش تھوڑی دیر بعد دور سے کسی چیز کی ضرورت کے لیے ایک نظر دیکھ جاتا تھا اور اب آیا تو تحصیل دار نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بلا کر سامنے بیٹھنے کو کہا۔ بخش گھاس پر بیٹھ گیا۔

''چودھری محمد مالک پچھلی چھ پشتوں سے ایک بڑے گاؤں کے مالک چلے آ رہے تھے۔ تم اِن کی بغیر کسی معاوضے کے خدمت کر رہے ہو۔ اُنھوں نے سفارش کی ہے کہ یہ گھر تمھیں الاٹ کر دوں۔'' تحصیل دار نے آہستہ آہستہ ایسے کہا کہ بخش ہر لفظ سمجھتا رہے۔ اِس بار وہاں خوف زدہ کر دینے والی خاموشی چھا گئی۔ بخش کا رنگ فق ہو گیا اور وہ لگا تار تھوک نگلے جا رہا تھا جیسے اُس کا گلا دبایا جا رہا ہو۔ محمد مالک بھی کچھ بے چین سا ہو گیا تھا، جیسے اُس کا کوئی راز فاش ہو گیا ہو، عبدالرشید بے یقینی کی حالت میں سب کے چہرے دیکھے جا رہا تھا، صرف تحصیل دار اُس حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا، وہ شرارت بھری آنکھوں سے بخش کو دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔

''چودھری جی! بہت مہربانی۔ غریب کے دن پھر جائیں گے لیکن اگر باخلے صاحب آ گیا تو میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ میری ایک کتے جتنی عزت نہیں ہوگی۔'' بخش کی آواز میں ممنونیت، خوف اور ایک احترام تھے۔ وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا، لگا کہ کوئی فیصلہ کر رہا ہے۔

''تم نے ثابت کرنا ہے کہ لدھیانے میں تمھارا اتنا بڑا گھر تھا۔ دوسرا باخلے اب یہاں

کدھر آئے گا۔ تم دو گواہ لانے کا سوچو جو بتائیں کہ تمھارا وہاں گھر تھا، اتنا ہی بڑا۔"

تحصیل دار نے اُس کی مشکل حل کر دی۔ "چودھری صاحب بٹالہ کے بڑے زمینداروں میں سے تھے، اب انھوں نے وہاں اپنی پرانی زمینیں دیکھنے جانا ہے یا یہاں آباد ہونے کا سوچنا ہے؟"

"یہ جعل سازی ہے اور میں زندگی میں کبھی کسی جعل سازی کا حصہ نہیں رہا لیکن اس کے لیے تیار ہوں۔ یہاں کام ہی ایسے ہو رہے ہیں۔ کیمپ میں پتا چلا کہ ماڑی کے لوہاروں نے کچھ بسوں پر قبضہ کر کے اپنی کمپنی بنا کر راجپوتی کا اعلان کر دیا ہے۔ میں بخش کے لیے جعل سازی کروں گا۔ میں اِس کا گواہ ہوں۔ ہم تھوڑے دنوں میں یہاں سے چلے جائیں گے، پھر یہ گھر اِسے دے دیں۔"

"گھوڑا جوتو!" بخش پریشان سا، بے یقین سا، گھبرایا گھبرایا اور زیرِ لب مسکراتا ہوا تانگہ تیار کرنے چلا گیا۔ تحصیل دار بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور تینوں اصطبل کی طرف چل پڑے۔

اُس رات محمد مالک نے صریح والے جانے کا فیصلہ کیا، لائل پور میں حسنات کے سوتیلے بھائی بھی تھے۔

"میاں جی! کب چلیں؟"

"تم یہاں اپنی ماں اور گھر والی کے پاس ٹھہرو، میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ لائل پور میں تمھارا سارا سسرال آباد ہے، اُن سے بھی مل کر مشورہ کر لوں گا۔ تم یہاں کی خبر رکھنا اور تحصیل دار کے لالچ میں نہ آنا۔ وہ اچھا آدمی ہے، ہمارا محسن ہے لیکن ہم نے وہی کرنا ہے جو ہمارے لیے موزوں ہے۔"

عبدالرشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اِن چند دنوں میں تحصیل دار کو جان گیا تھا، وہ ایک ہمدرد اور مدد کرنے والا شخص تھا اور اُس نے گھر اور عمارت الاٹ کرنے کی بات اپنا تعلق نبھانے کے لیے کی تھی نا کہ اُنھیں اُن کے اصولوں سے ہٹانے کے لیے! اُس نے اپنے باپ کو بھی قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں سمجھا؛ اُس نے اپنی زندگی خود ہی طے کیے ہوئے سخت، ناقابلِ سمجھوتہ اصولوں کے تحت بسر کی تھی اور اُسے اپنے مؤقف سے ہٹنے کو کہنا بیوقوفی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کو اڈے تک چھوڑ آؤں گا۔'' اُس نے ہمیشہ کی طرح نظر جھکا کے کہا۔

''مجھے بخش چھوڑ آئے گا، تم ابھی شہر سے اتنے واقف نہیں ہو۔''

''میں نے اِن دنوں میں سارا شہر گھوم لیا ہے، لاری اڈے بھی ہو آیا ہوں۔''

''اِسی لیے میں کسی دور کے گاؤں میں آباد ہونا چاہتا ہوں جس کے پاس سے نہر بہتی ہو جیسے وہاں بیاس تھا۔'' محمد مالک نے غصے سے بات شروع کر کے ایک آہ پر ختم کی۔ ''گاؤں میں بہت فائدے ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں بہت سے اندازے لگائے ہیں، اُن میں ایک اپنے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی زمین کی حفاظت کرنا ہے اور میرے بعد یہ چوکیداری تم کرو گے۔'' محمد مالک نے پھر آہ بھری۔

عبدالرشید خاموش رہا، اُسے ہمیشہ اپنے باپ کی باتوں میں منطق اور ایک ربط نظر آیا تھا اور اب اُسے اُس کے ماڑی بوچیاں میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سمجھ آئی۔ وہ بعض اوقات اپنے آپ کو اُس کے سامنے بے بس محسوس کرتا۔ وہ بعض اوقات اُس سے اتفاق نہیں بھی کرتا تھا لیکن اُس سے اختلاف کبھی نہیں کیا۔ وہ سوچتا کہ اب جب کہ اُس کے اپنا بچہ ہونے والا تھا، کیا وہ اپنے باپ یا دادا جیسا ہوگا؟ اور اگر وہ لڑکی ہوئی تو؟ عبدالرشید نے آگے سوچنا بند کر دیا۔ کیا لڑکی کی پیدائش خاندان کا اختتام ہوگا؟ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ بطور خاندان کا اہم فرد اُسے فیصلہ کرنا ہوگا کہ لڑکی کے پیدا ہونے پر اُس کا کیا ردِعمل ہوگا؟ کیا دوسری شادی تو نہیں کرنا پڑے گی؟ اُس نے حسنات کو دیکھنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا۔

وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ اُسے اپنے باپ کے اکیلے جانے پر بھی پریشانی تھی، اُس نے سن رکھا تھا کہ صریح والا جانے کے لیے لاٹھیاں والا اُتر کر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ پیدل چلتے ہوئے اُس کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی تھی، پھر اُسے خیال آیا کہ جو آدمی دس راتیں لگاتار پیدل چلتا آیا ہو، وہ تھوڑا سے چلنے سے کیا تھک سکتا ہے؟ اُس کے ہونٹوں پر پیار بھری میٹھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی بیوی کے بھائی لسوڑی شاہ کے دربار کے اردگرد رہتے تھے، کیا وہ وہاں تک پہنچ پائے گا؟ اُس کا دل قہقہہ لگانے کو کر آیا کیوں کہ دربار کا علاقہ تو اُس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اگلی صبح وہ ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ اُسے اپنے باپ کی تازہ اور بارعب آواز سُنائی

دی۔ اُسے حیرت ہوتی کہ اُسے اُس کی آواز میں کبھی تھکاوٹ یا نیند یا اُکتاہٹ کا احساس نہیں ہوا تھا، وہ اُسے ہر وقت تازہ دم محسوس ہوتا۔ کیا یہ اُس کا مزاج تھا یا تربیت کا حصہ کہ وہ ہر وقت تازہ دم ہی محسوس ہوتا۔ وہ اُٹھ کر باہر نکلا تو محمد مالک جانے کے لیے تیار تھا، دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے شاید آم کے پیڑ پر چڑیوں کے شور سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو وہاں شب بسری کے بعد چہچہاتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے خواب سنا رہی تھیں۔ اُسی وقت بخش بھی آ گیا اور دونوں باہر کو چل پڑے۔

ہاجرہ پریشان تھی کہ اُن کے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں، آج پھر کوئی زیور بیچنا پڑے گا جس کے لیے وہ عبدالرشید کے ساتھ مشورہ کرے گی۔ وہ تھوڑا سا زیور پہلے ہی بیچ چکی تھی لیکن اُنھوں نے زندہ رہنا تھا۔ اُس نے عبدالرشید کو یہ بھی کہنا تھا کہ اُنھیں اپنے کام کے بارے بھی سوچنا ہے، جلد از جلد زمین الاٹ کروائی جائے تا کہ کچھ آنا شروع ہو۔ وہ پریشان تھی کہ کب تک اِس طرح چلتا رہے گا، ایسے تو کنوؤں کا پانی بھی ختم ہو جاتا ہے جب تک بارشیں نہ ہوں۔ اُنھیں بھی بارش کی ضرورت تھی۔

عبدالرشید نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا، اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہے۔ اُس کا چہرہ جھریوں سے بھر گیا تھا، نرم نرم جھریاں، جو اُس کے چہرے کو بوڑھا کرنے کے ساتھ ایک وقار بھی دیے جا رہی تھیں۔ اُسے اپنی ماں پر پیار آیا اور اُس نے اُسے چومنے کا سوچا لیکن وہ جھجک گیا کہ اُس نے اپنی ماں کو کبھی چوما ہی نہیں تھا۔ شاید چومنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، وہ شاید ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ اُنھیں چومنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کی جھریوں کو چھوا اور ہلکا سا قہقہہ لگایا:

’’اچھی لگتی ہیں، دیکھنے میں بھی اور چھونے میں بھی۔‘‘

’’کیا؟‘‘ اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

’’جھریاں۔‘‘ وہ پیار سے مسکرا دیا۔

’’یہ بھی کوئی اچھا لگنے والی چیز ہیں۔ بیوقوف نا ہو تو!‘‘ وہ بھی پیار سے مسکرا دی۔

’’ہمارے پیسے ختم ہو گئے ہیں، کچھ بیچنا پڑنا ہے۔‘‘ عبدالرشید کے دل پر ہاتھ پڑا۔

’’ابھی تو ہمیں گندم، چاول اور دالیں خریدنا نہیں پڑ رہیں۔ شہر میں زندگی مہنگی ہے، میں تو ماڑی

سے کبھی کہیں گئی نہیں تھی۔ تم لوگوں کو کچھ کرنا پڑے گا۔''

''میاں جی لائل پور سے ہو آئیں تو زمین کہیں پر لے لیں گے۔'' وہ اُسے محمد مالک کی شرائط نہیں بتانا چاہتا تھا کہ جس گاؤں میں وہ جائیں شہر سے دور اور نہر کے کنارے ہو۔

وہ پریشان سا آم کے درخت کے نیچے آگیا؛ دن کی روشنی پھیل گئی تھی، چڑیوں کا شور ختم ہو گیا تھا اور وہ وہاں خاموش کھڑا صبح کی نرماہٹ کو اپنے اندر بھر رہا تھا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے محمد مالک کے اصولوں کا پتا تھا، اُس نے وہی لینا تھا جو اُس کا تھا اور یہاں وہ کامیاب ہو رہے تھے جن کے پاس کچھ نہیں تھا اور وہ سب کچھ لے رہے تھے۔ وہ اِس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا لیکن پیچھے بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ صرف اپنا جلد از جلد لینا چاہتا تھا، جتنی دیر ہوگی، اُن کا اُتنا ہی نقصان تھا۔ اگر محمد مالک وہاں کہیں آباد ہونے کا فیصلہ نہ کر آیا تو وہ اُس کے اگلے دن ہی گوجرانوالا کی طرف چل پڑے گا۔ وہاں کے لیے اُس کے پاس تین جگہوں کی خبر تھی اور وہ اُنھیں دیکھنے کے بعد واپس آ کر محمد مالک کو لے جا کر اُس سے آخری منظوری لینا تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ گوجرانوالا میں جھونا بہت بویا جاتا ہے اور ماڑی بوچیاں میں تو جھونا بہت کم لگایا جاتا تھا، اُنھیں اِس کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔

روشنی اب زیادہ تیز ہو گئی تھی اور وہ اُسی طرح گم سم، حیران اور کچھ پریشان، غیر مطمئن سا آم کے نیچے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر لائل پور میں زمین نہ ملی تو کیا وہ اکیلا یہ سب کچھ کر سکے گا؟ اُسے یہ سب کرنا ہی ہوگا۔ جیسے وہ سنتا آیا تھا کہ اُنھوں نے آج تک کبھی شکست قبول نہیں کی، جس کی تازہ ترین مثال اُس کا باپ تھا جو ماڑی بوچیاں چھوڑنے سے پہلے، جان کی پروا کیے بغیر، ایک جنگ لڑ کے آیا تھا۔ بوڑھا باپ بیوی کے ساتھ دریا پار کر کے ویران اور اجنبی علاقے میں آن بسا تھا، اُس کی پشت پر تو اُس کا باپ تھا جو اُس کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

عبدالرشید کو ایک دم بھوک کا احساس ہوا۔ وہ جتنے بھی لوگوں سے ملا، اُن کی اکثریت شہری جائیداد بھی الاٹ کروانا چاہتی تھی۔ اُن کے نزدیک مستقبل بعید میں ایک وقت آنا ہے جب زندگی نے شہروں کا رُخ کرنا ہے اور دیہات سکڑ جانے ہیں۔ اگر وہ کسی دور دراز گاؤں میں، نہر کے کنارے آباد ہو گئے تو کیا آنے والے وقت میں ہونے والی ترقی کا حصہ بن سکیں گے؟ اب جب کہ اُس کا اپنا بچہ بھی پیدا ہونے والا تھا، وہ چاہے گا کہ بڑا ہو کر وہ اُس سے مختلف ہو اور اُسے

اجنبیوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں کوئی جھجک نہ ہو۔ اُس نے یہاں لڑکیوں کو سڑکوں پر گھومتے ہوئے دیکھا تھا، اگر اُس کے بیٹی پیدا ہوئی تو وہ اُسے اسی طرح سڑکوں پر بے نیازی سے گھومتے ہوئے دیکھنا چاہے گا نا کہ گھر کے کسی کونے میں شادی تک بیٹھی رہے اور شادی کے بعد دوسرے گھر کے کسی کونے میں اپنی زندگی گزار دے۔

اُس کے پیٹ سے بھوک کی ایک کراہ نکلی تو وہ اندر چلا گیا جہاں اُس کی بیوی منتظر تھی!

چار دن کے بعد اُس کا باپ واپس پہنچا تو وہ اُسے تازہ دم نظر آیا۔ اُسے اُس میں پرانے محمد مالک کی جھلک نظر آئی اور اُسے باپ کے بارے میں تمام خدشات ختم ہوتے محسوس ہوئے۔ اُسے لگا کہ وہ اُن چند دنوں میں ماڑی بوچیاں سے لاہور تک کے خطرات سے بھرے ہوئے سفر کو بھول چکا تھا۔ محمد مالک اُس خنک سی رات میں، کھانا کھانے کے بعد، کھیس کی بکل میں، حقہ سامنے رکھے، چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے سامنے عبدالرشید، ہاجرہ اور حسنات کرسیاں رکھ کے بیٹھ گئے۔ وہ تینوں اُس کے سفر کی روداد سننا چاہتے تھے۔ محمد مالک نے ایک کش لیتے ہوئے اُن کے انہماک کا اندازہ لگایا اور بات شروع کی:

''میں نے لائل پور جانے والی تمام سواریوں کو بتا دیا تھا کہ مجھے لاٹھیاں والے کا بتا دیں، کئی تو میری طرح کے تھے،'' وہ ہنسا، حسنات، عبدالرشید کی طرف دیکھتے ہوئے شرمیلا سا مسکرائی اور وہ بھی جواب میں مسکرا دیا۔ ''کلینڈر کا تو پتا نہیں ہوتا کہ کس کو کہاں اُتار دے۔ لاٹھیاں والے سے میں سیدھا صرتج والے گیا، مجھے کسی نے بتایا کہ اُسی ڈنڈی پر چلتا جاؤں۔ کسی کو خبر ہوئی کہ ماڑی والا پہنچ آیا ہے تو کئی لوگ مجھے اپنے گھر لے جانے کو آ گئے۔ میں نے کہا کہ چوک میں منجی بستر لگا لیتے ہیں سب آ جاؤ اور باتیں کریں گے۔ چارپائیاں آ گئیں، میرے لیے کھیس اور سرہانہ، حقے آ گئے۔ گھروں سے کھانا آ گیا۔ وہاں کئی گاؤں کے راجپوت آ کر آباد ہوئے ہیں، کوئی جلال پور سے، ابریھم وال سے، حبیب وال سے، چوگاواں سے، اپنی ماڑی سے۔'' اُس نے چارپائی پر جگہ بدلی، ''وہاں جتنے لوگ تھے اُتنے ہی چودھری۔ میں نے جو اندازہ لگایا سب ابھی سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ وہاں کوئی کسی کو بڑا ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا کیوں کہ میں اُن سب سے بڑا مالک ہوں۔ وہاں پانی کی باری کے جھگڑے، زمین میں سے گزرنے پر اختلاف، گلی میں سے چلتے ہوئے گلا صاف کرنے پر اعتراض، جانور اگر

کسی کی فصل میں چلا جائے تو قیامت: مجھے تو وہاں جا کے لگا کہ میرے ارد گرد تمبوڑیاں چھڑی ہوئی ہیں۔ میں نے کئی جھگڑے طے کروائے اور اُنھیں سمجھایا کہ اب تم لوگوں کو ایک جگہ رہنا ہے اِس لیے آپس میں اتفاق رکھو۔ سب نے وعدہ تو کیا ہے لیکن، دیکھو، کیا بنتا ہے۔ میرے خیال میں اب تک کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہوگا۔'' محمد مالک نے سب کے چہرے دیکھے، اُسے خوشی ہوئی کہ وہ اُس کی بات توجہ سے سن رہے تھے۔ اُس نے گلا صاف کیا، ایک کش لیا اور بات جاری رکھی، ''پھر وہاں ایک اور خرابی ہے۔'' وہ رکا۔

''کیا؟'' ہاجرہ نے جلدی سے پوچھا۔

''صبر!'' وہ ہنسا، ''پانی کھارا ہے، نا پیا جاتا ہے اور نا ہی صابن اُتارتا ہے۔ میں بڑی مشکل سے نہایا۔ اگر کسی صحن میں دو گھر ہیں تو ایک کا پانی میٹھا اور دوسرے کا کھارا۔ مسجد کے کنویں کا پانی میٹھا ہے اور بولے ماشکی کا خاندان پورے گاؤں کے گھڑے صبح شام مشکوں سے بھرتا ہے۔ وہاں ابھی کافی بنجر زمین ہے جو الاٹ ہونے کے بعد آباد ہو سکتی ہے لیکن وہاں ہمارے لیے سکون سے زندگی گزارنا مشکل ہے۔'' پھر اُس نے حسنات کی طرف دیکھا، ''وہاں سے میں لائل پور گیا۔ اُن لوگوں نے میری بہت خاطر کی۔ دعوتیں ہوئیں، اپنے گھر ہمارے رہنے کے لیے پیش کیے گئے لیکن ڈاکٹر والا میں بھی صریح والے والا ہی معاملہ ہے۔ مجھے پتا چلا کہ لائل پور اور منٹگمری میں تقریباً ہر جگہ ایسے ہی ہے۔ وہاں زمین بے آباد ہے اور دیہات ابھی مکمل طور پر بسے نہیں۔ مجھے یہی مشورہ دیا گیا کہ ایسے علاقے میں جاؤں جو پہلے سے آباد ہو کیوں کہ مہاجر ہو کے آنے والوں کا اُس طرف رُخ کم ہے۔'' اُس نے پھر گلا صاف کیا، ایک کش لیا اور سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ ''لائل پور اور منٹگمری ہم نہیں جائیں گے۔'' اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا، ''اور عبدالرشید دو تین دنوں میں اب فیصلہ کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تلاش شروع کرو۔''

''ٹھیک ہے! میں کل ہی گوجرانوالا نکلتا ہوں۔''

''جب ہم اپنی زمین الاٹ کرانا شروع کریں تو بخش کا کام بھی کر دینا ہے۔'' محمد مالک نے اُسے اپنا وعدہ یاد کرایا۔

اگلی صبح محمد مالک معمول سے جلدی اُٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ صبح کے تارے کے ساتھ جاگتا آیا تھا؛ اُس رات شاید وہ سویا ہی نہیں، جب عبدالرشید تیار ہو کر باہر نکلا تو وہ برآمدے میں بیٹھا ہوا

تھا۔ عبدالرشید کو اُسے دیکھ کر حیرت ہوئی، وہ قدرے خوش بھی ہوا اور اُسے تسلی بھی ہوئی۔ وہ اس اُلجھن میں تھا کہ جانے سے پہلے اپنے ماں باپ سے مل لے یا خاموشی سے نکل جائے۔

''میاں جی! حقہ نہیں ہے؟'' اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے سوچا کہ آدھی رات کو کسے جگاؤں! وقت ہونے پر سب جاگ جائیں گے۔''

''میں ابھی آیا۔'' عبدالرشید بخش کے گھر کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں آئے۔ بخش کی آنکھیں نیند میں ڈوبی تھیں اور اُس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سر کھجاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ''میاں جی! آواز دے دیتے۔ آپ کی آواز تو دوسرے بلاک میں سونے والوں کو بھی جگا دیتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ویسے حقے کا یہی وقت ہے۔ بھر لاؤ۔ عبدالرشید تم بھی نکلو۔ جلدی میں کچھ نہ کرنا اور شتابی آنے کی کوشش کرنا۔''

''آپ فکر نا کریں میاں جی۔'' اور وہ پھاٹک کی طرف چلا گیا۔

عبدالرشید پانچ دنوں کے بعد واپس آیا تو وہ تھکا تھکا سا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد پہنچا تھا اور اُسے لگا کہ محمد مالک اُس کے انتظار میں تھا۔ اُسے اپنے اہم ہونے پر خوشی بھی ہوئی جس کا اُس نے اظہار نہیں کیا۔ اُسے اپنے باپ کے مزاج کے بارے میں معلوم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُسے مطمئن کرنا آسان نہیں تھا۔ اُس نے دل چسپی کے ساتھ سوچا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح کبھی کبھار غیر منطقی اور تلخ ہوتا جاتا تھا۔ ہاجرہ بھی جلدی سے باہر نکل آئی، حسنات نے اُسے دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو کسی کام میں مبتلا کر دیا۔

''کچھ کھاؤ گے؟ میں پانی لاتی ہوں۔'' ہاجرہ اندر گئی اور حسنات کو بھی بلا لائی اور ساتھ ہی پانی کا گلاس بھی لیتی آئی۔

''بیٹھو!'' محمد مالک نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عبدالرشید کو لگا کہ وہ اُس ملزم کی طرح تھا جس کی تفتیش کا آغاز ہو رہا تھا۔

''اب بتاؤ؟ کہاں کہاں گئے؟''

''میں چاچے تحصیل دار سے ملتا رہتا تھا۔ اُس نے مجھے گوجرانوالا میں دو جگہوں پر ایسے رقبے کے بارے میں بتایا تھا جو کسی کو الاٹ نہیں ہوا تھا اور جسے اُس نے کہہ سن کر الاٹ کیے جانے

سے رکوایا ہوا تھا۔ اُسے اِس لیے بھی پتا تھا کہ وہ خود حافظ آباد کا رہنے والا ہے۔ چناں چہ میں اُس سے رقعہ لے کر گوجران والا میں تحصیل دار کے دفتر پہنچا۔ وہاں ضلعے دار، تحصیل دار، نائب تحصیل دار اور قانون گو کے دفتروں کے چکر لگا تا پٹواری کے پاس پہنچا۔ پٹواری راجپوت تھا اور ہمیں جانتا تھا۔'' محمد مالک نے پٹواری کے متعلق جاننے کے لیے بولنا چاہا تو عبدالرشید نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''پٹواری ہمیں جانتا نہیں ہے لیکن اُس نے ہمارے متعلق سن رکھا تھا۔ وہ گرم جوشی سے ملا اور محبت سے پیش آیا۔ اُس نے مجھے دو جگہوں پر رقبہ بتایا؛ ایک گوجران والا سے حافظ آباد کو جانے والی سڑک پر شہر کے نزدیک اور دوسرا کئی میل آگے اُسی سڑک کے جنوب میں۔ وہ نہر کے کنارے ایک چھوٹا سا ڈیرہ ہے جہاں سکھ خاندان رہتا تھا۔ میں دونوں جگہوں کا چکر لگا کے آیا ہوں۔'' عبدالرشید خاموش ہو گیا، اُس نے خود کو جرح کے لیے تیار کر لیا تھا۔

''شہر کے نزدیک کس جگہ پر؟'' محمد مالک نے پوچھا۔

''وہاں ایک گاؤں ہے لدھے والا وڑائچ، اُس کے مشرق اور شمال میں۔''

''لدھے والا وڑائچ کتنا بڑا گاؤں ہے؟'' عبدالرشید کو اِس سوال کی توقع تھی۔

''کافی بڑا۔''

''وہاں ہندوستان سے آنے والے آباد ہوئے ہیں؟''

''جی، کافی۔''

''راجپوت بھی ہیں؟''

''جی!''

''کہاں کے ہیں؟''

''ہماری طرف کے نہیں۔''

''تو پھر کس طرف کے ہیں؟'' محمد مالک نے مایوسی سے پوچھا۔

''زیادہ تر پٹیالہ اور کرنال کے ہیں۔''

''شہر سے کتنا فاصلہ ہے؟'' عبدالرشید کو اِس سوال کی بھی توقع تھی۔

''چار یا پانچ میل ہو گا۔''

''اور دوسرا گاؤں؟ اُس کا نام نہیں بتایا!''

''پندرہ بیس میل ہوگا۔'' عبدالرشید نے سوچتے ہوئے جوب دیا۔

''اور اُس کا نام؟''

''قلعہ جے سنگھ۔ اُس سے دور ایک اور گاؤں ہے، یہ اُس کا حصہ ہے۔''

''گاؤں میں کوئی تھا؟''

''سکھ تو چلے گئے تھے، وہ ایک ہی خاندان تھا اور اُن کے سربراہ کا کٹا ہوا سر روہڑی پر پڑا تھا۔'' عبدالرشید نے ایک جھرجھری لی، اُسے اپنی وہ حالت یاد آ گئی جو اُس کی سر کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی طبعیت بحال رکھنے کے لیے ایک لمبی سانس لی۔

''میں نے گیدڑ، کتوں، کوؤں اور چیلوں کو لاش کو کھاتے دیکھا ہے۔'' محمد مالک نے کش لے کر اپنی حالت کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ ''تمام گھر خالی تھے؟''

''بھٹنی میں دو چوہڑے رہتے ہیں جو پورے گاؤں پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس ایک گھوڑی اور ایک پکی رفل ہے، جسے وہ لیے پھرتے ہیں۔'' عبدالرشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بھینسیں بھی اُنھوں نے سنبھالی ہوئی تھیں اور گندم پر بھی اُن کا قبضہ تھا۔ کہہ رہے تھے کہ وہ سب جانے والوں کی امانت تھی اور اُنھوں نے جلد ہی واپس آ جانا ہے۔''

''تم کل کا دن آرام کرلو، پرسوں چلیں گے۔'' محمد مالک نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ چاچے تحصیل دار نے کہا تھا کہ بتا کر جانا، وہ پولیس کا ایک آدھ سپاہی بھی ساتھ کرے گا تاکہ ہم جہاں بھی جائیں لوگ ہمیں ایسے ہی عام سے مہاجر نا سمجھیں۔'' وہ رکا، جھجکا اور پھر کہا، ''بخش کا کیا کرنا ہے؟''

''وہی ہوگا جو اُس کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ شاباش اچھا کام کر کے آئے ہو۔ اب آرام کرو، کل تم تحصیل دار سے بھی مل آنا۔''

باخلے کی کوٹھی کے دونوں پھاٹکوں پر ''یہ بنگلہ الاٹ ہو چکا ہے'' کی تحریر لگا دی گئی تھی اور محمد مالک تانگے میں بیٹھ کر والٹن کیمپ کے باہر منتظر چند خاندانوں سے جا ملا تھا، ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور فضا میں مگھر کی خنکی تھی جو رہ رہ کر جسموں میں ایک خوش گوار سی جھرجھری پیدا کرتی تھی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ جس میں چار گھر راجپوتوں، دو تیلیوں، دو ترکھانوں، دو ارائیوں، تین جولاہوں اور ایک کنبہ میوں کا تھا، قلعہ جے سنگھ کی طرف چل پڑا۔ پولیس کا ایک دستہ اُن کے ساتھ

تھا۔ عبدالرشید بنگلے کو بخش کے حوالے کرنے کا بہانہ کر کے اُن کے ساتھ نہیں گیا۔ اُس نے نواڑی اور سپرنگوں والے پلنگ، ایک مکمل صوفہ سیٹ، کھانے کی میز اور کرسیاں، ٹین کے تین ٹرنک، برتنوں کی الماریاں اور سنگھار میزیں ایک چھکڑے میں لادیں اور قلعہ جے سنگھ کی طرف چل پڑا۔ وہ جب وہاں سے چلا تو بخش اور اُس کی بیوی سکتے کے عالم میں تھے۔ اُن کی حالت اُس بچے کی تھی جسے کنچوں کی ایک تھیلی مل گئی ہو اور اُسے وہ کھیلنے نہ آتے ہوں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ہونٹ سیے اُسے دیکھے جا رہے تھے۔

آدھی رات کے بعد جب قافلہ قلعہ جے سنگھ پہنچا تو عبدالرشید اُن کے انتظار میں تھا۔ دیگیں پکی ہوئی تھیں جو گرم نہیں رہی تھیں۔ چوک میں مردوں کے سونے کا انتظام تھا اور عورتوں کے لیے چھتوں پر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ رات ٹھنڈی تھی لیکن ہر کوئی خوشی کے نگھ میں اتنا مطمئن تھا کہ کسی نے سردی محسوس نہ کی۔ وہاں ایک جشن کی کیفیت تھی۔ اپنی تکلیفوں کو بھول کر مرد قہقہے لگا رہے تھے اور عورتیں تمام رات خوشی کے گانے گاتی رہیں۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے آس پاس کے دیہات سے دودھ، دہی، لسی، پراٹھے، اچار، سالن، مکھن، شکر، گڑ اور تمبا کو پہنچ گئے۔ خوش آمدید کہنے والے اپنے حقے ساتھ لائے تھے۔ دن ڈھلے تک اپنے اپنے تجربات کی ساجھے داری ہوتی رہی اور وہاں اُداسی اور خوشی کی کیفیات دھوپ اور سائے کی حالت پیدا کرتی رہیں۔ مقامی لوگ سکھوں کی طاقت سے چھٹکارا پانے پر خوش تھے تو آنے والے درختوں پر بسیرا پا جانے والے پرندوں کی طرح چہچہا رہے تھے۔ سوڈھی کی کھوپڑی ابھی تک روہڑی پر پڑی ہوئی تھی اور کسی نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ اگلے دن عبدالرشید سوڈھی کی شکل کو غور سے دیکھتا رہا۔ اُس کی گردن کی جلد ڈھیلی ہو گئی تھی، سر کے بال اور ڈاڑھی سفید تھی، ہونٹ باریک، بند آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بادامی تھیں، پیشانی کشادہ، ٹھوڑی چوڑی اور کھوپڑی سے اندازہ ہوتا تھا کہ قد دراز تھا۔ گاؤں کے جنوب میں ایک یادگار تھی جس میں دیا جلنے کے لیے ایک آلہ تھا اور مقامی لوگوں نے بتایا کہ وہ ماتا رانی کی سمادھی تھی۔ عبدالرشید نے غفور میو کو ساتھ لیا اور سوڈھی کی کھوپڑی کو ماتا رانی کے مغرب میں دو ایکڑ پرے دفن کر دیا۔ کئی سالوں کے بعد یہ مشہور ہو گیا کہ وہاں بابا ڈھولن کے نام کا کوئی بزرگ دفن ہے، چناں چہ ہر جمعرات کو دیے جلائے جانے لگے اور جیٹھ کی دسویں تاریخ کو بابا ڈھولن کا عرس منایا جانے لگا۔ عرس پر قوالی ہوتی، دیگیں پکتیں، گاؤں کی

لڑکیاں دیے ہاتھوں میں لیے آتیں، کبڈی ہوتی، شراب اور بھنگ پی جاتی، زنانے مجرا کرتے اور مرد ناچتے۔ اِن ناچنے والوں میں غفور پیش پیش ہوتا اور تین دہائیاں ہر میلے پر متواتر ناچتے ہوئے ایک دسویں جیٹھ کو ناچتے ناچتے مر گیا۔

قلعہ جے سنگھ دوبارہ آباد ہو گیا تھا لیکن ابھی زمین الاٹ نہیں ہوئی تھی۔ عبدالرشید نے ایک بائیسکل حاصل کر لی تھی۔ وہ اُس کے پیچھے ایک ٹرنک باندھتا جس میں دھلا ہوا جوڑا ہوتا۔ وہ سیدھا گوندلہ والا چوک پہنچتا جہاں ایک حمام تھا۔ وہ وہاں نہا کر لباس تبدیل کرتا، ٹرنک وہیں رکھتا اور کچہری چلا جاتا جہاں جلیل احمد خاں، محمد انور بھنڈر اور محمد رفیق تارڑ کے چیمبروں میں درخواستیں لکھواتا اور اُن سے مشورے کرتا۔

بیساکھ میں اُنھوں نے باہر سونا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات جب وہ تھکا ہوا آیا تھا اور محمد مالک کو دن کی روداد سنا کر گرتے ہی سو گیا تھا تو اُسے نیند میں احساس ہوا کہ کوئی اُسے گھور رہا ہے۔ صحن میں اندھیرا تھا اور اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی پائنتی کی طرف کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ بیٹھنے والا اچانک ایک گم سی گہرائی میں کھو گیا، عبدالرشید کو لگا کہ اُس آدمی کے گرد ایک روشنی سی تھی اور اُس روشنی میں اُسے وہ آدمی بیٹھا نظر آیا جس کا سر کئی دن روہڑی پر پڑا رہا تھا۔ وہ بظاہر آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا لیکن خوف زدہ سا اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ سوڈھی اُٹھا، اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''ماں جی! رات ایک عجیب بات ہوئی۔'' ہاجرہ اور محمد مالک چھت پر سوتے تھے اور حسنات اور عبدالرشید صحن میں۔ ہاجرہ چاٹی کے پاس بیٹھی مکھن نکال رہی تھی۔ عبدالرشید پیڑھی کھینچ کر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا؟'' ہاجرہ نے مکھن کے پیڑے کو ہتھیلی میں آہستہ آہستہ دباتے ہوئے، اُس میں سے لسی نکالتے ہوئے اور گولائی دیتے ہوئے، پوچھا۔

''رات میں نے سوڈھی کو دیکھا۔ میں سو رہا تھا کہ آنکھ کھلی اور میں نے اُسے اُس چارپائی کی پائنتی پر بیٹھے دیکھا۔'' اُس نے سامنے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا، مجھے لگا کہ اُس نے آہ بھری ہے، پھر اُس نے چاروں طرف دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔''

ہاجرہ دل چسپی سے اُسے دیکھتی رہی، جیسے اُس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر

رہی ہو اور پھر پیڑے کو سامنے پڑے تھال میں رکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور کہا، ''ڈرے تو نہیں؟ دو دن پہلے ہم جب رات کا کھانا کھانے لگے تھے تو میں نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ اُس نے دالان سے نکل کر اُس پیل پائے کے پاس کھڑا ہو کر ہمیں دیکھا اور پھر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ میں تمھارے میاں کے لیے روٹی چوپڑ رہی تھی جب اُسے دیکھا۔ میں نے روٹی چھابے میں رکھ کر فوراً آیت الکرسی پڑھ کر دوبارہ روٹی چوپڑنا شروع کر دی۔ تمھارا میاں بھی اُسے دیکھ چکا ہے۔ ہم کل ہی بات کر رہے تھے۔ تم نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ ہمیں تو گھر کا فرد ہی لگ رہا ہے، رہتا رہے، ہمارا کیا لیتا ہے۔'' اُس نے چاٹی میں ہاتھ مارتے ہوئے نیا پیڑا بنانا شروع کر دیا۔ ''بیٹا! بانگر میں دریا سے کئی روشنیاں چلتی تھیں، ہم اُنھیں گاؤں کی طرف آتا ہوئے دیکھتے تھے۔ جہاں سے ہماری زمین شروع ہوتی تھی، وہ وہاں تک آتیں اور پھر دریا کی طرف پلٹ جاتیں۔ صبح کا تارا نکلنے تک وہ ساری رات سفر کرتی رہتیں۔ جن راتوں میں بادل ہوتا وہ نظر نہیں آتی تھیں۔'' اُس نے پیڑے کو ہاتھوں میں محسوس کرنے کے بعد اُسے تھال میں رکھ دیا، ''پریشان مت ہو۔ ہم اُس کے گھر میں رہ رہے ہیں، کیا پتا تمھارا دادا اپنے گھر میں رہنے چلا گیا ہو اور وہاں آباد ہونے والے بھی ہماری طرح آج ایسی ہی بات کر رہے ہوں۔'' اُس نے تھال پر پونا ڈالتے ہوئے کہا۔

''سوڈھی کو ناحق قتل کیا گیا تھا، بڑے میاں جی تو اپنی موت مرے تھے۔'' عبدالرشید نے اتنا آہستہ کہا کہ ہاجرہ بمشکل سن سکی۔

''نیک روح کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سنا ہے کہ سوڈھی نیک اور ہمدرد آدمی تھا، وہ ہمیں تنگ نہیں کرے گا۔ وہاں تمھارا دادا بھی اپنے گھر میں آباد ہونے والوں کو دیکھ کر آہ بھرتا ہوگا۔''

اور پھر وہ سوڈھی سے بابا سوڈی بن گیا!

زندگی معمول پر آ گئی۔ پہلی مرتبہ جب پاوندے آئے تو محمد مالک نے حویلی کی دیوار بنوانا شروع کر دی جو سردیوں میں مکمل ہو گئی اور ساتھ ہی کڑیں بھی تعمیر کر لیں۔ چوہڑوں کے قبضے میں جانوروں اور گندم کو گھر کے افراد کے مطابق تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جب تک یہ طے نہیں ہوا تھا، بھینسوں کا ایک ہی جگہ پر دودھ نکال لیا جاتا اور پھر پورے گاؤں میں تقسیم ہوتی۔ جھوٹیوں اور بھینسوں کو ہلوں میں جوتا جانے لگا اور اور جوگوں سے ہر روز، جب ابھی روشنی بھی نہ پھیلی ہوتی، ایک ہی کھیت میں ہل چلانا شروع کر دیا جاتا اور دوپہر تک یہ سلسلہ چلتا اور کئی ایکڑوں میں ہل چلا دیا جاتا۔ گندم کی فصل بیجی گئی، سکھوں کے لگائے کماد پیڑے گئے اور گھروں میں گڑ اور شکر آ گئے۔ سب نے محسوس کیا کہ یہاں ماڑی سے جھاڑ زیادہ تھا۔ باڑی کی فصل بھی اچھی رہی اور پھر ساونی کاشت کرنے کا وقت آیا تو یہ لوگ اُلجھن میں پڑ گئے، وہاں جھونے کی قسم یہاں سے مختلف تھی اور اِن کے پاس پنیری بھی نہیں تھی۔ مقامی جھونے کو مونجی کہتے جو آنے والوں کے لیے دلچسپی سے کم نہیں تھا اور اِسی طرح مقامیوں کے لیے جھونا۔ اب لوگوں میں آنے والوں کے لیے پہلے والا جذبہ بھی نہیں رہا تھا اور مقامی اور مہاجر دو الگ الگ شناخت بن گئیں۔ مقامی، آنے والوں کو مہاجر کے بجائے طنزیہ سے لہجے میں پناہ گزین کہنے لگے اور اِسی طرح مہاجر اُنھیں جانگی یا جاہل کہتے۔

پنیری ڈھونڈنا ناممکن بھی نہیں تھا۔ بیل گاڑیوں میں دور دور کے دیہات سے پنیری لائی جانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیتوں میں کدو ہونے لگے اور لادے ڈھونڈ کر پنیری لگانے کا کام شروع ہو گیا۔ پانی کی کمی نہیں تھی، بلکہ پانی فالتو تھا اور اُنھیں چاولوں کی فصل کے لیے بھی بعض اوقات موگھے بند کرنا پڑتے۔ وہاں جھونے کے پودے قد میں چھوٹے اور مضبوط ہوتے تھے جو تیز ہوا میں بھی کھڑے رہتے جب کہ یہاں باسمتی کی مونجی قد آور اور اُس کے پودے کا تنا قدرے نازک تھا جو ہوا کی تیزی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اور فوراً گر جاتا۔

مہاجر اپنے ساتھ وہاں کی زندگی کا صدیوں پرانا دستور لائے جس کی بنیاد محنت پر تھی

اور یہاں اُنھوں نے مویشیوں کو ایک نئے طریقے سے سنبھالنا اور افزائش سیکھی۔ یہاں مویشی ایک کاروبار بھی تھا جب کہ وہاں صرف دودھ اور کاشت کے لیے استعمال ہونے والی ایک جنس۔ جب مویشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو چارے کے لیے زیادہ زمین رکھی جانے لگی جس سے فصل کم ہوگئی اور اُس مالی خسارے کو جانوروں کے کاروبار سے پورا کیا جاتا۔ اُس طرف سے آنے والوں نے گڑ اور شکر بنانا سکھائے اور کھانے کو لذیذ بنانے کے لیے مصالحوں کا استعمال بھی مقامی لوگوں نے سیکھا۔ ایک مرتبہ محمد مالک کو ساتھ والے گاؤں سے دوپہر کے کھانے کی دعوت ملی، وہ ابھی نئے نئے آئے تھے اور اُس نے انکار کرنا مناسب نا سمجھا۔ اُسے چار قسم کے کھانے پیش کیے گئے جو تمام میٹھے تھے۔ محمد مالک نے درخواست کر کے اچار کے ساتھ روٹی منگوائی جو میزبان کے لیے حیران کن بات تھی۔ اگلی مرتبہ اُسے کھانے کے ساتھ اچار اور روٹی بھی دی گئی۔

دو علاقوں کی تہذیبوں کے ملاپ نے فصلوں اور مویشیوں کو بہتر بنایا۔ پٹیالہ اور کرنال کی طرف سے آنے والے گوجر زندگی کا نیا ڈھنگ لے کر آئے۔ اُنھیں چراگاہوں کی تلاش تھی جہاں وہ اپنے ریوڑ پال سکتے۔ وہ صرف بھینسیں پالتے اور دودھ بیچتے۔ کٹا پالنا اُن کے لیے ایک طعنہ تھا جو بھوکا ہی مر جاتا یا چند دنوں کے بعد قسائی کو بیچ دیا جاتا۔ اُنھیں کھیتی باڑی سے اِتنی دلچسپی نہیں تھی، جو تھوڑی زمینیں اُنھیں ملیں وہ چارہ لگانے کے کام آتیں۔

ہر ضلع میں کسی منصوبے یا نظریہء ضرورت کے تحت ایک ایسا گروہ وجود پا گیا جو زمینوں کی الاٹ منٹ کی ہیرا پھیری میں ملوث تھا۔ وہ جعلی کلیم بنواتے اور یہاں زیادہ یونٹوں کا دعویٰ کر کے اپنے نام الاٹ کرواتے۔ بعد میں یہی لوگ، جو اپنے آبائی علاقوں میں بے نام سے یا بے مالکے تھے، یہاں اِس جعل سازی میں جاگیروں کے مالک بن گئے اور بعد میں اِن لوگوں نے آپس میں رشتے داریاں بھی کر لیں اور ملک کی سیاسی باگ ڈور سنبھال بیٹھے۔ اُن کے اندر کا بے ایمان ہر نسل میں زندہ رہا۔

میں نے اپنے اندر کے بے ایمان کا گلا گھونٹ دیا ہے!

میرا دادا کرنال کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اپنے خاندان کے ساتھ، بے بسی کی حالت میں پاکستان آیا اور جس گاؤں میں آباد ہوا وہ شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ کسی طرح ایک تانگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اُسے چلا کر گزر اوقات کرتا۔ اُس کا گاؤں سے نکلنے والا پہلا تانگہ ہوتا تھا اور اِسی طرح شہر سے گاؤں آنے والا آخری۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایسا کسی منصوبے کے تحت کرتا یا محض اتفاق تھا، اِس بات کا پتا نہیں چل سکا کیوں کہ خاندان کے اندر یہ ایک ایسا راز ہے جس کی سختی کے ساتھ حفاظت کی جاتی، جیسے خزانے پر سانپ بٹھا دیا جاتا ہے۔ ایک شام ایک نوجوان عورت گاؤں جانے کے لیے تانگے میں سوار ہوئی اور میرے دادا نے حسبِ معمول کسی اور سواری کا بھی انتظار کیا۔ اتفاق یہ تھا کہ کوئی اور سواری نہیں آئی اور دادا اُس عورت کو لے کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ تانگے کی رفتار کافی سست تھی اور وہ عورت کسی حد تک مطمئن تھی کہ جن عزیزوں کے پاس جا رہی تھی تانگے والا اُن کا جاننے والا تھا۔ جب منزل کے درمیان میں پہنچے تو میرے دادا نے اُس عورت کو وہاں سے پکڑ لیا جہاں سے عموماً عورتوں کو پکڑا جاتا ہے۔ عورت نے مزاحمت کی، دادا نے زبردستی کی آخری کوشش کی اور کامیاب نہ ہونے پر منت سماجت پر اُتر آیا۔ وہ عورت بھی عجیب مخلوق تھی، یہی دھمکی دیتی رہی کہ گاؤں پہنچ لو اور میرا دادا یہی کہتا رہا کہ تم میری بہن ہو۔ دراصل وہ ہونے والا تھا جس نے ہماری زندگیوں میں انقلابی تبدیلی لے آنا تھی۔ گاؤں پہنچ کر عورت بین کرنے لگی، چھاتی پیٹنا شروع ہو گئی، ڈوپٹہ پھاڑ دیا، گاؤں والوں پر لعنت بھیجی جنھوں نے ایسے آدمی کو رکھا ہوا تھا جو واجب القتل تھا۔ گاؤں اکٹھا ہو گیا اور کسی نے میرے دادا کی نہیں سنی۔ وہ اپنا تانگہ چھوڑ چھاڑ کر کسی طرف بھاگ گیا۔

یہ واقعہ کوئی نہیں سناتا تھا، میری ماں نے مجھے اِس لیے سنایا کہ اُس نے اپنے آپ کو تبدیل نہیں کیا تھا۔ دادا اُسے کبھی پسند نہیں تھا، ہمیشہ کہتی کہ اُس کی آنکھ میں شرم نہیں۔ گاؤں سے

بھاگ کر وہ شہر چلا گیا اور یہی انقلاب کا آغاز تھا۔ ہم راجپوت ہیں اور اُس نے وہاں ایک مہاجر راجپوت وکیل کے چیمبر میں بغیر تنخواہ کے چپراسی کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ موکلوں کے لیے چائے لاتا اور ٹپ وصول کرتا اور چینج بھی دبا جاتا۔ وہاں اُس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو جعلی کلیموں کا کام کرنے کا سوچ رہا تھا۔ میرا دادا ذہین اور اپنے اردگرد سے باخبر آدمی تھا۔ وہ وکیل کے چیمبر میں ہونے والی گفتگو سنتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ اردگرد ایسی جعل سازی زور پکڑ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ ایک دل چسپ قسم کی خبر یا ڈیویلپ منٹ تھی اور وہ ایسا سوچنے والوں یا کرنے والوں کی عقل کی داد دیتا اور جب اُسے جعل سازی کا حصہ بننے کا کہا گیا تو اُس کے لیے انکار کرنے سے بڑی کوئی حماقت نہیں تھی۔ اُس کا ساتھی محکمہ انہار میں بیل دار تھا اور دونوں نے مل کر اپنے ضلع میں اِس کام کا آغاز کیا۔ وہ جائیداد کے جعلی کاغذات تیار کرتے، ایسے علاقوں کے یونٹ بنواتے جن کے بدلے میں یہاں زیادہ یونٹ ملتے اور وہ بے آباد زمینیں الاٹ کروانے لگے۔

میرے دادا نے کرنال سے آنے والے خاندانوں کے ساتھ رابطہ رکھا۔ اب وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ دوسروں کے کام آسکے۔ وہ مالی طور پر کافی مستحکم ہو گیا تھا اور کرنال والے اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اُس نے سواری کے لیے پہلے بائیسکل خریدا جسے وہ کچہری آنے اور شہر کے اندر ملاقاتوں کے لیے استعمال کرتا۔ بیل دار نے سول لائن میں ایک گھر پر قبضہ کیا ہوا تھا جس کی بنیاد بھی جعلی کلیم تھا۔ دادا اپنے بائیسکل کو شام وہاں کھڑا کرتا اور تالا لگا کر چابی ساتھ لے جاتا۔ وہ ایک کنجوس آدمی تھا یا جو اُس نے حاصل کیا تھا وہ کسی اور کے تصرف میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی رہائش شہر میں نہیں رکھی، وہ اپنے آپ کو وہاں غیر محفوظ سمجھتا تھا، چناں چہ وہ ایک قصبے میں رہنے لگا جو شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ بیل دار کی طرح اُس نے بھی جعل سازی کے ذریعے بڑا سارا گھر اپنے نام کروا کر اُس میں رہائش کر لی۔

میرا دادا اب اردگرد کے کرنالیوں کا سربراہ بن گیا تھا۔ وہ اُسے چودھری کہتے اور وہ چودھری ہی جانا جانے لگا۔ کرنال والے اُس سے اپنے جھگڑوں کے فیصلے کرواتے، اپنے رشتوں کی اُس سے منظوری لیتے اور جائیدادوں کی خرید و فروخت اُس کی معرفت کرتے۔ دوسرے ضلعوں میں یہ کاروبار کرنے والے گروہ اِن دونوں کے ساتھ رابطے میں تھے اور یہ بھی اُن لوگوں کے ساتھ ایک نازک سا تعلق رکھے ہوئے تھے۔ اب دادا کا ایک گروہ تھا، یہ سب اپنے اپنے کام الگ الگ

رہ کر کرتے، اُن میں کوئی ساجھے داری نہیں تھی، وہ صرف ایک تمام میں اکٹھے نہا رہے تھے۔ اُن میں کسی پر جب فراڈ کا مقدمہ ہوتا یا کسی عدالت سے وارنٹ نکلتے تو اپنے گروہ کے کسی آدمی کے پاس پناہ لیتے۔ یہ لوہے کے ایسے کناروں والا تالاب تھا جس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ اُن سب نے معاشرے اور سرکار میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا، باوجود اِس کے کہ وہ اُن کے صاحبِ حیثیت ہونے کے ذریعے کو جانتے تھے۔ وہ فراڈیے کے نام سے جانے جاتے، ہر کوئی اُنھیں ناپسندیدگی سے دیکھتا لیکن اُن کی بات ٹالنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ میرے دادا نے رشوت کو ہمیشہ کامیابی کا زینہ سمجھا۔ میرا باپ جب سرکاری ملازم ہوا تو اُسے پہلا سبق یہی دیا گیا کہ جتنی ممکن ہو رشوت لو، نقدی کی صورت میں، اور بینک اکاؤنٹ میں صرف ایک تنخواہ ہونی چاہیے۔ وہ خود بھی ہر کرنا لیے کا کام رشوت کے ذریعے کرواتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے کبھی رشوت نہیں دیتا تھا، جس کا کام ہوتا متعلقہ اہل کار کو وہ آدمی اپنے ہاتھ سے پیسے پکڑاتا اور پھر وہ اہل کار آدھی رقم لفافے میں ڈال کر چپکے سے دادا کو اُس کا حصہ دے دیتا۔ یہ کام کروانے والوں کے بھی علم میں تھا لیکن اُنھیں یہ قبول تھا۔

اپنے شہر میں گھر کا ہونا ضروری نہیں تھا، ایک گھر لاہور میں بنایا اور ایک اسلام آباد میں اور فوجی حاکم کا حلیہ اپنا کر اپنے پی آر کی ایسی مہم چلائی کہ اِدھر اُدھر تصویریں دیکھنے کے بعد آمر کو میرا دادا جانا پہچانا سا لگنے لگا۔ فوجی حاکم نے جب انتخابی پروسیس کا گلا گھونٹ کر غیر جماعتی انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو میرا دادا اُسے اپنا حاشیہ بردار لگا۔ میرے دادا کے لیے یہ اوپر سے بھیجا ہوا موقع تھا۔ اُس نے اِن انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے لیے الیکشن لڑا۔ اُس کے حلقہء انتخاب میں کرنال سے آ کر آباد ہونے والوں کی ایک بھاری تعداد تھی اور دوسرے علاقوں سے بھی کرنالیے اُس کی مدد کے لیے پہنچ گئے، اِس کے علاوہ اُسے زمینوں کی جعلی الاٹمنٹ کروانے والے گروہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ الیکشن کی مہم کو جارحیت کے ساتھ جاری رکھا گیا۔ جو لوگ میرے دادا کو ووٹ نہ دینا چاہتے یا خاندان کو مشکوک لگتے، میرا چچا اُنھیں دھمکی دیتا:

''الیکشن تو چند دنوں میں ختم ہو جانے ہیں۔ میں تم لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ ہر آدمی کو کئی مقدموں میں پھنساؤں گا اور پولیس کے ڈنڈے اِس کے علاوہ۔''

دادا اُسی شام اُن کے گھر پہنچ جاتا: ''میرا بیٹا کچھ سخت بات کہہ گیا ہے، اُس کی بات کا

برا نا ماننا۔ جوان خون ہے لیکن مجھے تم سے بہتر رویے کی توقع ہے۔'' دادا کی بات میں پکی عمر کی سنجیدگی ہوتی۔ یہ دھمکی اتنے سنجیدہ اور لاتعلق سے طریقے سے دی جاتی کہ سننے والا خوف زدہ ہو جاتا اور اُس کے پاس اُسے ووٹ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔

ہماری رشتہ داریاں فیوڈل سیاست دانوں کے ساتھ تھیں، ہم خود فیوڈل بھی تھے اور سیاست دان بھی۔ ہم مراعات یافتہ طبقے کے اُس حصے میں سے تھے جو مزید مراعات کے لیے ہر ناجائز کام کو جائز جانتا تھا۔ ہماری زندگی ائیر کنڈیشنڈ تھی، ہم جہاں بھی ہوتے وہاں ائیر کنڈیشننگ ضروری تھی ورنہ دادا کا قہر نازل ہو جاتا۔ میں واحد بچہ تھا جو غلطی کرنے والوں کو بچاتا اور یہاں سے مجھے غلط بیانی یا جھوٹ کی عادت پڑی۔ ہمیں بدلہ لینا اور معاف نہ کرنا سکھایا گیا۔ ہمارے دادا نے اپنے ہر مخالف سے بدلہ لیا اور کسی کو آج تک معاف نہیں کیا تھا سوائے اُس عورت اور اُن لوگوں کے جو اُس کی دیہہ بدری کا سبب بنے۔ وہ اگر گاؤں سے نہ نکالا جاتا تو کیا وہ، وہ ہوتا جو آج ہے؟ یقیناً نہیں! وہ کہیں غیر معروف سا چاند گاڑی ڈرائیور ہوتا۔ اُس نے اپنے پہلے گاؤں کے اُن تمام لوگوں سے بدلہ نہیں لیا اور اُنھیں معاف بھی کر دیا لیکن کسی کو بھولا نہیں۔ شاید مجھے یا میرے بھائی یا کسی چچازاد کو بدلہ لینے کا کہا جاتا۔ لیکن اب ہمارے اِس طرح کے بدلے وہ لوگ لیتے ہیں جو اِسی کام کے لیے رکھے گئے ہیں۔ میرا دادا اپنے آخری دنوں میں تھوڑا ہمدرد یا خدا ترس ہو گیا تھا، وہ شاید اگلے انصاف سے بچنے کے لیے صفائی دے رہا تھا لیکن اُس کا یہ کام میرے چچا نے سنبھال لیا تھا۔

میرے باپ کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ہمارے پاس رشوت کا جمع کیا ہوا کافی پیسہ تھا جسے علاج پر پانی کی طرح بہایا گیا۔ دادا بہت پریشان تھا اور اُس نے سرکاری خرچ پر لندن کے ایک بڑے ہسپتال میں اُس کے علاج کا بندوبست کیا لیکن میرے باپ کی صحت روز بروز گرتی گئی۔ اُس کی گرتی صحت کا دادا کی صحت پر بھی اثر پڑا اور وہ بھی کمزور ہونا شروع ہو گیا۔ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا اور وہ سارا دن لوگوں کے ساتھ جھگڑتا رہتا۔ میرا باپ ملازمت چھوڑ کر زندگی کے آخری ایام اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا جس کی دادا نے اجازت نہ دی۔ وہ کہتا کہ ملازمت چھوڑنے سے پنشن میں کمی رہے گی، چناں چہ ملازمت جاری رکھنا سب کی بہتری میں تھا۔ یہی میری ماں اور دادا کے درمیان میں اختلاف کی بھی ایک وجہ بنی۔

ایک دن، بغیر کسی کو پتا چلے، میرے باپ نے چپکے سے اپنی آخری سانس لے لی!

میرے باپ کے سوگ کے دنوں میں چچا کے لیے رشتہ آیا۔ ہمارے ہاں کچھ ہندو رسمیں ابھی تک زندہ تھیں جس میں بیوہ کی دوسری شادی نہیں کی جاتی تھی اور وہ پورا ایک سال خاوند کی موت کا سوگ کرتی۔ چچا کا جب رشتہ آیا تو میری بیوی نے احتجاج کیا کہ ابھی تک اُس کے خاوند کا سوگ ختم نہیں ہوا تو یہ رسوم بعد میں کر لی جائیں لیکن میرے دادا نے اماں کے احتجاج کو کوئی اہمیت نہ دی اور دھوم دھام سے منگنی کرنے کے بعد اُس کی شادی طے کر دی۔ بارات کے لیے سرکاری خرچ پر ہیلی کوپٹروں کا بندوبست کیا گیا، لڑکی والوں نے تین ہیلی پیڈ بنائے جن پر چھ ہیلی کوپٹر باری باری اُترے۔ اِس طرح کی بارات ملک کی تاریخ میں پہلے نہیں آئی تھی۔ دادا کا سمندھی بھی یونٹوں کا کاروبار کرتے کرتے رئیس اعظم بن گیا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی اور داماد کو ایک ایک لینڈ کروزر دی اور بھینسوں اور گایوں کا ایک ریوڑ جوٹرکوں میں لاد کر بھجوایا گیا۔ دادا نے اُن جانوروں کے لیے جدید خطوط پر حویلی بنائی جہاں اُن کے لیے ہر سہولت موجود تھی جب کہ اُنھیں سنبھالنے والوں کی زندگیاں ڈگ کتوں سے بھی بدتر تھیں۔

میرے ناپختہ ذہن میں دادا اور اُس کے نظام کے خلاف پہلی نفرت پختہ ہو گئی!

میں نے اپنی تمام توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ مجھے اب دادا کے مقام اور اپنے خاندان کے وقار میں کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ جو نظام انسانوں سے زیادہ جانوروں کو ترجیح دیتا ہے مجھے اُس کا حصہ نہیں بننا۔ میرے اندر کی بغاوت مجھے کتابوں کے اتنا اندر لے گئی کہ میں اُن کے باہر کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ دادا کو میرے باپ کی موت کا بہت دکھ تھا اور یہ افواہیں بھی اُس تک پہنچتی رہتیں کہ یہ اُسے کسی حقدار کو محروم کرنے کی سزا ملی تھی؛ شاید اُس کے ضمیر نے کوئی کروٹ لی ہو یا ممکن ہے کہ اُس نے ایسے ہی مرنا تھا، ایک دن اُس نے صبح سے چیخنا شروع کیا اور شام تک چیختے چیختے مر گیا۔ سسر کے مرنے کا بھی ایک سال سوگ منایا جاتا ہے اور بہوئیں اُس عرصے میں گھر سے نہیں نکلتیں۔ میری ماں نے احتجاجاً اِس رسم کی خلاف ورزی کی اور مجھے ساتھ لے کر ہفتے میں ایک بار لاہور جانے لگی۔ وہ وہاں کسی کام سے نہیں جاتی تھی، مجھے کسی کتابوں کی دکان میں لے جاتی یا کسی اچھے ریستوراں میں کھانا کھلا کر سورج غروب ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاتی۔ ایک شام میرے چچا نے اُس پر الزام لگایا کہ وہ کسی بدنیتی کے تحت لاہور جاتی ہے، مجھے تو

ساتھ لے کر جانا ایک دکھاوا تھا۔ اُس دن ماں ہم دونوں بھائیوں کو لے کر دادا کے گھر سے چلی گئی۔
یہ ایک طویل سفر کا آغاز تھا۔ ہمیں بدلہ لینا سکھایا گیا تھا اور میں نے اپنے خاندان سے بدلہ لینے کا سوچا۔ اُس وقت اُن کے بہاول پور میں بیس مربعے، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پندرہ، پانچ اپنے قصبے میں، ایک گھر لاہور میں، ایک گھر اور فارم ہاؤس اسلام آباد اور لندن میں فلیٹ تھا۔ یہ سب کہاں اور کیسے آیا۔ کیا ایک کوچوان اتنا بنا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ ایک ٹیکسی بنا سکتا تھا۔ میں نے پولیس میں جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنانا شروع کر دیا۔

مجاہد نے قلعہ دیدار سنگھ میں اُس گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا جس میں وہ اپنی سوتیلی ماں اور بہن کے ساتھ طالب علمی کے زمانے میں رہا کرتا تھا۔ چھوٹا سا وہ گھر محلہ موری گیٹ میں تھا اور اب اُس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ اُن نے گھر کی تعمیر نو کے لیے ایک آرکیٹیکٹ سے رابطہ کر کے کام شروع کر دیا۔ گھر ایک تنگ سی گلی میں واقع تھا اور دو گھروں کے درمیان میں ایسے سینڈوچ ہوا تھا کہ اُس کا صحن نہیں ہو سکتا تھا۔ گلی سے ایک ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے بعد چھتا ہوا صحن تھا جس کا ایک حصہ ٹی وی لاؤنج اور دوسرا بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ ڈیوڑھی میں سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں، پہلی منزل پر باورچی خانہ، کھانے کا کمرہ، خواب گاہ اور ملحقہ غسل خانہ تھا اور یہاں سے دوسری منزل پر مہمان کمرہ، لائبریری اور دونوں سے ملحق غسل خانہ اور اوپر چھت تھی۔

گوجرانوالہ سے آنے پر پرانے بازار سے پہلے پولیس سٹیشن آتا ہے جہاں مجاہد نے کار کھڑی کرنے کے لیے جگہ کا بندوبست کیا اور وہاں سے گھر تک کا تھوڑا فاصلہ پیدل چلنا پڑتا۔ نزہت کو وہ تھوڑا سا پیدل چلنا سخت ناپسند تھا کیوں کہ اُن گلیوں میں ہر کوئی اُسے یا اُن دونوں کو ایسے دیکھتا کہ اُن کا تعلق اِس دنیا یا قصبے سے نہیں۔ ایک وقت آیا کہ اُسے بھی احساس ہونے لگا کہ کم از کم وہ یہاں کا حصہ نہیں۔ وہ حیران، کسی حد تک افسردہ ہو جاتی کہ مجاہد لاہور اور اسلام آباد جیسے شہر چھوڑ کر اِس دور اُفتادہ آبادی میں آن بسا! اُس نے یہاں بسنے کی اِس لیے حامی بھر لی تھی کہ مجاہد نے اتنے برسوں میں اُس سے بہت کم تقاضے کیے تھے اور مجاہد کو اِس قصبے، اپنے محلے، اپنی گلی اور اِس چھوٹے سے بے ڈھنگے گھر سے پیار تھا اور وہ اِس پیار میں کسی طرح رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے دِن یہاں کس طرح گزاریں گے؟ نزہت ہر وقت یہی سوچتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ مجاہد نے اپنے لیے کوئی نا کوئی مصروفیت نکال لینی ہے۔ اُس کی لائبریری تھی جہاں وہ کئی دن متواتر بیٹھ سکتا تھا، اُس نے پورے ضلع کی نرسریاں کھنگال کر ڈیوڑھی کے بعد آنے والے چھتے ہوئے صحن کو گملوں سے بھر دینا تھا اور چھوٹا سا مچھلی گھر بنا کر گھنٹوں مچھلیوں کو ایک دوسرے کے پیچھے

مجاہد نے قلعہ دیدار سنگھ میں اُس گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا جس میں وہ اپنی سوتیلی ماں اور بہن کے ساتھ طالب علمی کے زمانے میں رہا کرتا تھا۔ چھوٹا سا وہ گھر محلّہ موری گیٹ میں تھا اور اب اُس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ اُس نے گھر کی تعمیر نو کے لیے ایک آرکیٹیکٹ سے رابطہ کر کے کام شروع کر دیا۔ گھر ایک تنگ سی گلی میں واقع تھا اور دو گھروں کے درمیان میں ایسے سینڈوچ ہوا تھا کہ اُس کا صحن نہیں ہو سکتا تھا۔ گلی سے ایک ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے بعد چھتا ہوا صحن تھا جس کا ایک حصہ ٹی وی لاؤنج اور دوسرا بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ ڈیوڑھی میں سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں، پہلی منزل پر باورچی خانہ، کھانے کا کمرہ، خواب گاہ اور ملحقہ غسل خانہ تھا اور یہاں سے دوسری منزل پر مہمان کمرہ، لائبریری اور دونوں سے ملحق غسل خانہ اور اوپر چھت تھی۔

گوجرانوالہ سے آنے پر پرانے بازار سے پہلے پولیس سٹیشن آتا ہے جہاں مجاہد نے کار کھڑی کرنے کے لیے جگہ کا بندوبست کیا اور وہاں سے گھر تک کا تھوڑا فاصلہ پیدل چلنا پڑتا۔ نزہت کو وہ تھوڑا سا پیدل چلنا سخت ناپسند تھا کیوں کہ اُن گلیوں میں ہر کوئی اُسے یا اُن دونوں کو ایسے دیکھتا کہ اُن کا تعلق اِس دنیا یا قصبے سے نہیں۔ ایک وقت آیا کہ اُسے بھی احساس ہونے لگا کہ کم از کم وہ یہاں کا حصہ نہیں۔ وہ حیران، کسی حد تک افسردہ ہو جاتی کہ مجاہد لاہور اور اسلام آباد جیسے شہر چھوڑ کر اِس دور اُفتادہ آبادی میں آن بسا! اُس نے یہاں بسنے کی اِس لیے حامی بھر لی تھی کہ مجاہد نے اتنے برسوں میں اُس سے بہت کم تقاضے کیے تھے اور مجاہد کو اِس قصبے، اپنے محلے، اپنی گلی اور اِس چھوٹے سے بے ڈھنگے گھر سے پیار تھا اور وہ اِس پیار میں کسی طرح رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے دِن یہاں کس طرح گزاریں گے؟ نزہت ہر وقت یہی سوچتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ مجاہد نے اپنے لیے کوئی نا کوئی مصروفیت نکال لینی ہے۔ اُس کی لائبریری تھی جہاں وہ کئی دن متواتر بیٹھ سکتا تھا، اُس نے پورے ضلع کی نرسریاں کھنگال کر ڈیوڑھی کے بعد آنے والے چھتے ہوئے صحن کو گملوں سے بھر دینا تھا اور چھوٹا سا مچھلی گھر بنا کر گھنٹوں مچھلیوں کو ایک دوسرے کے پیچھے

بھاگتے دیکھتے رہتا تھا۔ اُس کے مطابق خون کے دباؤ سے بچنے کا یہ موثر ترین طریقہ تھا۔

وہ اِس گھر میں فاطمہ اور گڈو کے ساتھ کئی سال رہا تھا۔ وہ ملک کے بڑے شہروں میں ایک مصروف، شان و شوکت والی اور کامیاب زندگی گزارتے ہوئے بھی اُن دونوں کے ساتھ اِس گھر میں گزاری زندگی کو نہیں بھولا تھا۔ وہ اپنے باپ کی یادوں کو ریت کی آندھیوں میں کہیں گم کر چکا تھا لیکن اُسے دونوں سوتیلی عورتیں کبھی نہیں بھولی تھیں۔ نزہت کو بعض اوقات اپنا آپ اُن کے مقابلے میں غیر اہم محسوس ہوتا لیکن پھر اُسے اپنے ایک اُستاد کی بات یاد آتی کہ کبھی مختلف حالتوں میں زندگی گزارتے ہوئے لوگوں کے ساتھ اپنا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ایک وقت آنے پر وہ اپنی کمزوری پر اختتام پذیر ہوگا۔ اُن دونوں عورتوں کے ساتھ وہ اپنی زندگی کا ایک حصہ گزار چکا تھا اور اُس کے ساتھ سفر کے دوسرے حصے کا ابھی آغاز ہوا ہی تھا، ابھی تو اُسے اُس سفر میں اپنے رُخ کا ہی نہیں پتا تھا۔ بیچ والا حصہ اُس نے ملازمت کی نذر کیا ہوا تھا۔

مجاہد اُس گھر میں اُسے جتنا خوش نظر آیا، اتنا خوش کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اُس کی چال میں ایک لچک اور سیٹی کی دھنوں میں شوخی کا عکس محسوس کرتی تھی۔ وہ ناشتہ کر کے لائبریری میں بیٹھ کر اخبار پڑھتا اور دس بجے کے قریب چائے پی کر باہر نکل جاتا۔ وہ لوگوں سے ملتا، اُن کی باتیں سنتا، خیالات کی ساجھے داری کرتا اور اُنھیں اُس چھوٹے سے قصبے میں بہتر زندگی گزارنے کے راستے بتاتا۔ اُس کا ملنا جلنا زیادہ تر اُن لوگوں کے ساتھ تھا جو قلعہ دیدار سنگھ میں اپنی عادات، رویوں، اطوار اور اخلاقی بگاڑ کی وجہ سے رد کیے جا چکے تھے؛ اُن میں نشہ کرنے والے، جیب کترے، لڑکیاں تاڑنے والے اور جنسی طور پر مفعول لڑکے شامل تھے۔ اُس کے گھر کے قریب ایک مسجد تھی اور گلی کے لوگ اُس کے مستقل نمازی تھے۔ وہ سب اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنا پہلو بچاتے اور اُسے شک کی نظر سے دیکھتے۔

وہ گلی کے نکڑ پر ایک عادی نشئی کی بیٹھک میں روز اکٹھے ہوتے تھے۔ اُس کا نام فضل ہوا کرتا تھا، وہ ایک با اثر کاروباری خاندان کا فرد تھا اور اپنے کاروبار میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا کہ اُس کا ایسے لوگوں سے ملنا ہو گیا جنھوں نے اُسے سگریٹ کے ذریعے کیے جانے والے تمام نشوں کا عادی بنا دیا۔ وہ چرس اور ہیروین پیتے پیتے فضل سے پھجا بن گیا۔ فضل کی بیوی کو اُن کا اپنی بیٹھک میں بیٹھنا پسند تھا کہ وہاں اُن لوگوں کو سدھارنے کی بات ہوتی تھی۔ فضل کا خاندان فضل کی بیوی کو

گھر چلانے کے لیے ماہانہ خرچ دیتا تھا اور وہ اُنھیں دن میں دو دفعہ چائے پلا سکتی تھی۔ وہ سب اُس کے گھر میں جمع تھے کہ منڈلی نے متفقہ طور پر مجاہد سے درخواست کی:

"سر جی! آپ ہم سے نہ ملا کریں۔"

"کیوں؟" مجاہد کو کچھ شک تھا اور کسی حد تک اُسے حیرانی بھی ہوئی۔

"ہم تو بُرے ہیں ہی لیکن آپ کو ہمارا سر پرست کہا جا رہا ہے۔" نتھو جیب کُترے نے اُسے اطلاع دی۔ نتھو تقریباً اٹھارہ سال کا دبلا سا لڑکا تھا جو اپنے ہنر کی وجہ سے تعریفی الفاظ میں یاد کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُس کے دائیں ہاتھ کی دو اُنگلیوں میں ایسا ہنر تھا کہ بٹوے کے اندر سے بھی پیسے نکال سکتا تھا۔

مجاہد اب سنبھل چکا تھا۔ اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور جیب میں سے پیسے نکال کر بشیرے کو دیے جو ہر وقت اپنے پالش کیے ہوئے ناخنوں کو چمکاتا رہتا تھا۔ "جاؤ اور لالے کی جلیبیاں لاؤ! اور دودھ اور پتی کے ڈبے بھی۔ آج سے چائے میرے ذمے۔ اور کیا کہتے ہیں؟"

"سر جی! کہا جاتا ہے کہ ہمارے سب کاموں میں آپ کی پتی ہے۔" نتھو کی آواز میں غصہ تھا۔

"تو کیا ہے نہیں؟" مجاہد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "میں تم سے جیب کاٹنے کے طریقے سیکھتا ہوں، فضل سے سگریٹ بھرنا اور ..... اور ..... ب شیرے ..... سے کچھ بھی نہیں....." بشیرا چائے اور دودھ لینے گیا ہوا تھا، اُس کی غیر حاضری میں سب نے بلند قہقہہ لگایا۔

"پولیس بھی ہم پر آنکھ رکھے ہوئے ہے۔ بشیرے کا تھانے میں ایک مخبر ہے، اُس نے بتایا ہے کہ ہمارا ایک نیا پولیس کا افسر آیا ہے، بہت سخت اور امیر آدمی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ آپ کی عزت کرتا ہے۔" نتھو نے کہا۔

"جانتے ہو کہ وہ کون ہے؟" مجاہد نے دل چسپی سے پوچھا۔

"چودھری شکیل خاں کا پوتا۔" فضل نے فوراً کہا۔ مجاہد نے ایک دزدیدہ سی نظر سب پر ڈالی۔

"میں ایک بار یہاں، اپنے ہی شہر میں ڈی سی بن کر آیا تو شکیل خاں مجھے ملنے کے لیے آیا۔ ہم دونوں راجپوت ہیں، میرا خاندان پرانا اور اُس کا نودولتیا۔ اُسے کئی قسم کی جھجکیں اور رکاوٹیں ہوں گی، مجھے نہیں تھیں۔" اُس نے سوچتے ہوئے کہا، "کوئی کام تھا اُسے جو میں نے نہیں

کیا۔ وہ میری تبدیلی کے لیے کوشش کرتا رہا لیکن نہیں کروا سکا۔" اُن ٹھکرائے ہوئے لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے۔ مجاہد کو اُن کی معصومیت پر حیرت ہوئی۔ یہ نشئی، جیب کترے اور جنسی بے راہ روی کے مارے ہوئے لوگ اتنے معصوم تھے کہ اِس غیر اہم سی بات پر، جسے وہ اپنی جیت سمجھے، اُن کے چہرے کِھل اُٹھے۔

"تم لوگ اگر میرے دوست ہو تو اپنے موجودہ دھندے چھوڑ دو۔ اگر تم نہیں بھی چھوڑ سکتے تو تمھیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم لوگوں کا ضامن ہوں۔" وہ رکا، اُس نے سب کے چہروں پر بے یقینی دیکھی، "جو لوگ تمھارے یہاں مخالف ہیں، میں اُن سے ملاقات کے لیے تیار ہوں۔"

"سر جی! میں جیب ماری چھوڑنے کو تیار ہوں۔" نھّو نے اعلان کیا۔ "پر میں کھاؤں گا کہاں سے؟"

"تم نے کبھی کوئی شریفانہ کام کیا ہے؟" وہاں ایک دم قہقہہ گونج اُٹھا۔

"اِس کے باپ نے بھی کبھی نہیں کیا۔"

"تم لوگ کون ہوتے ہو؟ میری مراد ذات سے ہے۔"

"نائی۔" کسی نے کہا۔

"کام آتا ہے؟" مجاہد نے سب کی دل چسپی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"اِس سے بہتر کوئی بال بنا ہی نہیں سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ چائے پی کے تمھیں کسی کے پاس لے کے چلتا ہوں۔" مجاہد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اِس کے باپ کی دکان ہے۔ اُسے جیب مارنے کے پیسے دینے کے بجائے اُس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سر جی! ہے تو مشکل کام لیکن چلا جاؤں گا۔ میری ایک شرط ہے۔" نھّو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" مجاہد نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ایک دفعہ مجھ سے اپنے بال بنوائیں گے!" نھّو شرمائے جا رہا تھا۔ مجاہد نے

پنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''میرا خیال ہے کہ کافی لیٹ ہو گئے ہیں۔ کل آؤں گا۔''

''وعدہ سر جی؟'' نھو کے لہجے میں خوشی تھی۔

''وعدہ!''

چائے بن کر آ گئی۔ وہ اپنا اپنا پیالہ ہاتھ میں لیے چسکی لینے لگے۔

مجاہد سوچتا کہ وہ اکیسویں گریڈ کا افسر رہا ہے اور اُس کے پرانے ساتھیوں کے اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں جب کہ وہ دھتکارے ہوئے لوگوں کے ساتھ دن گزارتا ہے۔ کیا اُسے ایسا کرنا ترک کر دینا چاہیے؟ کیا وہ کہیں باسی تو نہیں ہو جائے گا؟ اگر اُس نے اِن لوگوں سے کنارہ کشی کر لی تو وہ دن کیسے گزارے گا؟ اُس نے سوچا کہ وہ لاہور کے اشاعتی اداروں کے ٹیلی فون نمبر حاصل کرے گا اور اپنے پسندیدہ موضوعات کی نئی کتابیں منگوانی شروع کر دے گا۔

اُسے اپنے گھر کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ کیا وہ بشیرے کو اپنے ہاں رکھ لے؟ اُسی وقت وہاں چھدری ڈاڑھی، لاغر سے جسم، درمیانے قد کا آدمی داخل ہوا جس کے منہ میں پان تھا اور مجاہد اُس کے ہونٹ، دانت، مسوڑھے اور زبان سرخ رنگ میں رنگی ہوئی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آدمی جب داخل ہوا تو مجاہد کے ساتھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ اُن کے کھڑے ہونے کی وجہ کوئی خوف تھا یا احترام؟ اُس نے محسوس کیا کہ اُن سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بشیرے نے بیٹھنے کے لیے اپنی جگہ پیش کی۔ آنے والے نے اردگرد بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھی اور پھر فضل کے صحن میں جا کر اپنے لیے کرسی اُٹھا لایا جس سے مجاہد کو اندازہ ہو گیا کہ اُسے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اُس نے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھی اور جھجکتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

''سر جی! یہ میرا دوست فضیل ہے۔ اِس کا تعلق شہر کے پرانے خاندانوں میں سے ہے۔'' فضل نے اپنے بے ربط سے لہجے میں تعارف کرایا۔

''جن دنوں کی فضل بات کر رہا ہے، تب پرانے تھے۔'' فضیل کے منہ میں پان نہ ہوتا تو یہ بات کرتے ہوئے ہنس رہا ہوتا لیکن وہ مسکرایا بھی نہیں۔ ''اب تو ہم نئے بھی نہیں رہے۔'' مجاہد نے اندازہ لگایا کہ فضیل کچھ بے چین سا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُس کی بے چینی کی وجہ

وہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجاہد کے سامنے ایک طرح سے غیر محفوظ سمجھ رہا تھا، اُسے وہ وہاں بیٹھے ہوئے پُر اعتماد لوگوں میں سے نہیں لگا۔

فضیل نے آدھا پیا سگریٹ بجھا کر نیا سلگایا۔ وہ جانتا تھا کہ سب اُس کی طرف دیکھ رہے تھے جو شاید اُس کی بے چینی کا سبب بن رہا تھا۔ ''سر!'' اُس نے سگریٹ کو انگلیوں میں گھمایا، ''میں ایک بلڈ بنک چلا رہا ہوں۔'' مجاہد کو لگا کہ وہ جسم جھلسا دینے والی آندھی میں گھر گیا ہے۔ ''آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔''

مجاہد نے فضیل کی اطلاع کو اپنے اندر جذب ہونے کا وقت دیا۔ ''آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' وہ جاننا چاہتا تھا کہ فضیل کہیں خون بیچتا تو نہیں!

''میں پچھلے سولہ سالوں سے سٹیل کے ایک کارخانے میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔'' مجاہد کچھ مطمئن ہو گیا۔

''خون سٹور کرنے کا انتظام ہے؟'' مجاہد کے اندر افسر جاگ رہا تھا، وہ باریک سے باریک تفصیل تک پہنچنا چاہتا تھا۔

''فریزر ہے لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ جسے خون چاہیے تازہ ہی دیا جائے۔'' فضیل اب پُر اعتماد ہو گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجاہد کے اگلے متوقع سوال کو روکا، ''ہم ایک طویل مشق کے عمل سے گزر رہے ہیں، ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا ہے جس کے مطابق ہمارے پاس اٹھارہ سال سے زیادہ کے ہر مرد و زن کے خون کا گروپ ہوگا۔ ہمارے پاس کافی ڈیٹا اکٹھا ہو گیا ہے اور ہم خون دینے والے کو ایک آئس کریم اور جوس کا گلاس دیتے ہیں جو خون لینے والے کی ذمے داری ہے۔'' مجاہد نے محسوس کیا کہ فضیل اپنی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ ''ہم خون کا دوسری تنظیموں کے ساتھ تبادلہ بھی کرتے ہیں لیکن بہت کم ہوا ہے کہ ہم کسی سے لیں۔''

مجاہد، فضیل کی بات پر غور کرتا رہا، اُسے یہ دعویٰ مشکل ضرور لیکن ناممکن نہیں لگا۔ وہ اپنی حیرت کو چھپائے ہوئے تھا کہ فضیل کو اُس کے ساتھ کیا کام ہو سکتا تھا؟ وہ، جہاں تک ممکن ہو، فضیل کو باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا تا کہ اُس کے پوچھنے سے پہلے اُس کا مقصد جان جائے۔

''نتھو! فضیل صاحب کو چائے پلاؤ۔'' مجاہد نے بات کا رُخ موڑنے کے لیے کہا۔ ''جلیبی بھی پیش کرو۔''

فضیل نے جلدی سے منہ میں ڈالے پان کو کسی کو پتا چلے بغیر، حلق سے نیچے اُتارنے کی کوشش کی اور چائے کا پیالہ ایک ہاتھ میں لے کر دوسرے سے جلیبی کھانے لگا۔

"آپ یہ..." فضیل نے مناسب لفظ کے لیے وقفہ دیا، "خدمت کب سے کر رہے ہیں؟"

"کافی سال ہو گئے۔ یہ سب،" اُس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اور قلعے کے بہت سے نوجوان میرے ساتھ ہیں۔ ہم بلا تفریق ضرورت مندوں کی،" اِس بار فضیل نے وقفہ دیا، "خدمت کرتے ہیں۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ چھوٹی جگہوں پر بھی ایسے کام ہو رہے ہیں۔" مجاہد کے اندر کا محتاط افسر اب دلیر ہو گیا تھا، "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں آپ کی سرپرستی کی ضرورت ہے!" فضیل نے پیالہ رکھ کے نیا پان منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نوجوانوں کا کام ہے، میں تو ایک چلا ہوا کارتوس ہوں۔" وہاں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مجاہد نے اپنے آپ کو اتنا پُراعتماد محسوس نہیں کیا۔

"ہم ایسے نہیں سمجھتے۔ آپ نے یہاں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر کے اِس قصبے کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔" فضیل نے کسی بھی وقت مجاہد کی آنکھوں میں نہیں دیکھا، وہ نظر جھکائے ہوئے تھا۔

"اِس قصبے کے ساتھ میری بہت یادیں جُڑی ہوئی ہیں۔ میں نے چونگی والے ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا اور یہیں سے روز شہر کالج جایا کرتا تھا۔" مجاہد نے اپنے آپ کو کھینچ کر ریوری سے باہر نکالا، اُس کے ذہن میں ایک دم یادوں کی طویل فلم چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اُسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ یہاں غفور میو کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اُس کے والدین کبھی کبھار ایک یا دو راتوں کے لیے آتے۔ اُس کے باپ کا اُس تنگ سے گھر میں دم گھٹتا تھا اور وہ سردیوں میں بھی دو چارپائیوں جتنے صحن میں باہر سوتا۔

"باخلے صاحب کا گھر کھلا تھا لیکن میرا وہاں بھی دم گھٹتا تھا۔ شاید میں دریا کی خوشبودار ہوا کا عادی تھا۔" اُس کے لہجے میں تازہ تازہ زخم کا درد محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مجاہد کو ایک دم گاؤں میں پڑا باخلے کے گھر سے اپنے باپ کا لایا ہوا سامان یاد آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایک آدھ دن

میں جا کے سارا سامان یہاں لے آئے گا اور نزہت کے ساتھ ایک رات وہاں گزارے گا۔ فیصل تاش کے کھلاڑی کی طرح مجاہد کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔

''آپ کچھ وقت ہمارے پاس گزارا کریں۔ یہ ہمارے مشن کے لیے ایک طاقت کا ٹیکہ ہوگا۔'' فیصل نے یہ بات ایسے کہی جس طرح خزاں میں سفیدے کے پتے گرتے ہیں۔ وہ شاید اپنے مقصد سے آگے نکل گیا تھا یا اُسے اپنے کہے کے بوجھ کا علم نہیں تھا۔ ''آپ نے کچھ دیر روزانہ ہمیں وقت دینا ہوگا تاکہ لوگ جان جائیں کہ یہ غیر سنجیدہ لوگ ہی اِسے نہیں چلا رہے۔'' مجاہد کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میٹھا اُتنا ہی ہوگا جتنا گُڑ ڈالا جائے۔'' مجاہد نے پُرانی کہاوت دہرائی۔

''کل شام آپ وہاں آئیں گے۔ میں آپ کو گھر سے آکے لے جاؤں گا۔''

مجاہد رات بے چین سا رہا۔ اُسے نزہت کی پریشانی تھی کہ اُس کی زندگی یہاں بے رنگ ہو کے رہ جائے گی۔ کیا وہ خود غرض تو نہیں ہو گیا؟ اُس نے سوچا کہ وہ ہمیشہ نزہت کے لیے جیا تھا، اُس نے اپنے باپ، سوتیلی ماں اور بہن کے فوت ہو جانے کے بعد زندگی اپنے گھر تک محدود کر کے رکھ دی تھی، وہ اپنے دفتر کے بعد ہمیشہ گھر آتا، اُس کے دفتر کے معاملات کے علاوہ کسی سے تعلقات نہیں تھے اور اب جب وہ اِس قصبے میں آگیا تھا تو نزہت کو اُس کا ساتھ دینا چاہیے۔ وہ فیصل اور دوسرے لوگوں سے مشورہ کر کے نزہت کے لیے کوئی مصروفیت نکالے گا۔

''نزہت! بات سننا۔'' مجاہد نے خوش گوار سے لہجے میں آواز دی۔ نزہت نے زندگی کا زیادہ حصہ مجاہد کو سمجھنے میں گزار دیا تھا۔ وہ جان گئی کہ مجاہد اُس کے ساتھ کوئی ضروری بات کرنی چاہتا تھا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی مجاہد کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُسے یہ کچھ عجیب سا بھی لگا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں کسی سماجی بھلائی کے کام میں involve ہو جاؤ۔'' مجاہد نے غالباً پہلی مرتبہ کوئی تمہید نہیں باندھی۔

''مثلاً؟'' نزہت کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''کچھ بھی! ہم بڑی لڑکیوں کے لیے کوئی سکول کھول سکتے ہیں، اُن کی بہتری کے لیے کوئی ادارہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک بلڈ بنک کام کر رہا ہے جو فریش خون مہیا کرتے ہیں۔'' مجاہد کے ذہن میں فیصل کی تقریر گھوم گئی۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ''فوری طور پر تو مجھے ایک ملازم کی ضرورت ہے۔''

''کل ہو جائے گا۔'' مجاہد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ایک لڑکا آتا ہے، عورتوں کی طرح کا، اُسے کہوں گا کہ ہاتھ بٹا دیا کرے۔'' نزہت نے جھرجھری سی لی۔

''نہیں۔ مجھے عورت گھر میں چاہیے۔ ایسے لوگوں سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے، تیتر نہ بٹیر......''

مجاہد نے دل چسپ سا قہقہہ لگایا، اُس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی، ''اچھا لڑکا ہے، کام میں یقیناً تیز ہوگا۔''

''ہمارا کام ہی کون سا ہے۔'' نزہت نے کرسی پر جگہ بدلی، ''مجھے عورت چاہیے۔'' اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم نے ایک آدھ دن میں گاؤں جانا ہے، وہاں سے باخلے کا کچھ سامان یہاں لائیں گے اور اگر ممکن ہو سکا تو تمھاری مدد کرنے کے لیے کوئی لڑکی یا عورت لانے کی بھی کوشش کروں گا۔'' مجاہد کچھ سوچے بھی جا رہا تھا، اُسے شک سا تھا کہ نزہت گاؤں جا کر رات رہنے سے کترائے گی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہاں رات رہیں۔''

نزہت کے ماتھے پر لکیریں بن گئیں، وہ ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے اُن لکیروں کی تصدیق کر رہی ہو۔ ''رات رہ تو لوں گی لیکن سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا کاٹنے لگتا ہے۔ وہاں ایک رات تو قبر کی زندگی لگتی ہے۔''

''ایک رات گزر ہی جائے گی۔'' مجاہد نے ہنستے ہوئے کہا اور نزہت کے چہرے پر ایک بجھی ہوئی سی مسکراہٹ اُبھری۔

مجاہد، نزہت کے ساتھ اگلی رات گاؤں میں اپنے گھر تھا۔ وہ دوپہر کے بعد پہنچے، گھر کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ لپائی نہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے چھت میں سوراخ بن گئے تھے جن میں سے بارش کا پانی فرش پر بہتا رہا تھا اور کوٹھریوں کی دیوریں بھی بیٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجاہد نے ایک خاندان کو کہا کہ وہ گھر میں رہنا شروع کر دے اور گھر کی دیکھ بھال اُسی خاندان کے حوالے کر دی۔ ایک ٹرالی میں سپرنگ والے پلنگ، کھانے والی میز اور کرسیاں اور صوفے رکھوا کے اگلے دن بھجوانے کا بندوبست کیا۔ گھر میں بجلی نہیں تھی، کہیں سے بجلی کا تار آ گیا اور بلب روشن ہو گیا، کہیں سے پیڈسٹل پنکھا آیا جو ہوا دینے لگا۔ میوؤں نے کھانا پکایا جس میں وہ پرانا ذائقہ تھا جسے مجاہد بھول چکا تھا اور جس سے نزہت واقف نہیں تھی۔ اُن کی چائے میں پانی نہیں تھا، صرف دودھ تھا اور پتی کے چند ٹکڑے جن سے دودھ کا رنگ ہی تبدیل ہوا تھا ذائقہ نہیں۔ پہلی مرتبہ نزہت کو اپنا پیالہ ختم کرنے میں وقت ہو رہی تھی لیکن بعد میں اُسے چائے کی خوشبو والے دودھ کا مزہ آنے لگا۔

مجاہد دیوان خانے میں بیٹھا رہا جہاں گاؤں کے لوگ دیر تک آتے جاتے رہے۔ وہاں پرانی باتیں ہوتی رہیں، زیادہ تر اُن دنوں کی جب وہ ابھی گاؤں میں ہی تھا۔ عورتوں کے لیے نزہت ایک عجوبہ تھا، اِس لیے بھی کہ اُس نے اور مجاہد نے مرضی سے شادی کی تھی اور وہ اُسے غور سے دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ سوچتیں: کیا یہ گھر سے بھاگی تھی؟ کوئی اِسے موڑنے نہیں آیا؟ گھر سے بھاگنا خاندان کو بے عزت کرنا ہوتا ہے اور اگر خاندان والے لڑکی کو واپس نہ لائیں تو یہ اِن کی مزید بے عزتی ہوتی ہے۔ پھر عشق میں مبتلا ایک لڑکی نے پوچھ ہی لیا:

''چاچی! تم گھر سے بھاگی تھیں؟'' نزہت ایک دم لڑکی کی طرف مڑی اور پھر سوال میں چھپی معصومیت کو سمجھتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''نہیں بچی! ایسا تو کچھ نہیں تھا۔ ہماری شادی مرضی کی تھی۔ میں بھاگی کہیں نہیں تھی۔''

نزہت مسکرائی، لڑکی کے گال تھپتھائے، ''میرے سسر رشتہ مانگنے گئے تھے اور میرے گھر والوں نے اجازت دے دی تھی۔ بھاگنے کا تو تب سوچتی جب میرے والدین اجازت نہ دیتے۔''

لڑکی تھوڑا مایوس ہوئی، اُس نے زمین پر اپنی جگہ بدلی، ''یہ تو پسند کی شادی نہ ہوئی، اُس کے لیے تو گھر سے بھاگنا ہوتا ہے۔ تمھاری شادی تو گھر والوں نے کی ہے۔ ایسے ہی سب کہہ رہے تھے کہ چاچے چاچی نے پسند کی شادی کی ہے۔'' اُس کے لہجے میں بیزاری سی تھی۔

''پسند کی شادی تھی، بچی! مجھے تیرے چاچا شادی سے پہلے پسند تھے پھر ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور گھر والوں نے اجازت دے دی۔'' نزہت نے تحمّل کے ساتھ سمجھایا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''سمیرا۔''

''تمھاری ماں آئی ہے؟'' کسی نے ایک لمبی سانس لی اور کسی نے منہ سے افسردگی کی آواز نکالی۔ وہاں ایک عجیب بھاری سا ماحول پیدا ہو گیا۔

''مر گئی ہے بیچاری۔'' کسی نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور کسی طرف سے وہی افسردگی کی آواز نکالی گئی۔ نزہت خاموش بیٹھی برآمدے کے بیل پایوں کو دیکھتی رہی۔ ''باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' نزہت کو خیال آیا کہ اِسی گھر میں مجاہد اپنی سوتیلی ماں اور اُس کی پہلی شادی کی بیٹی کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

''کوئی اور بہن بھائی ہیں؟''

''یہ اکیلی ہی ہے۔ دوسری کے ہیں۔''

سمیرا گھٹنوں کے اوپر سر رکھے بیٹھی تھی۔ نزہت نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا سر تھپتھپایا۔ ''سب دِن گزر جاتے ہیں، ہمت مت ہار۔'' نزہت نے کچھ کہنے کے لیے کہہ دیا۔ اُسے سمیرا کا بات کرنا پسند آیا تھا، اُسے اُس کے اندر ایک ایسی معصومیت نظر آئی جو ناپید تھی۔ پھر وہ مسکرائی، ''سمیرا بچے! ایک کام کر، تیرا چاچا بھی بات کرے گا۔''

سمیرا نے پوری آنکھیں کھول کر نزہت کی طرف قدرے شک اور بے یقینی سے دیکھا، بولی کچھ نہیں۔ ''تو میرے ساتھ چل! میں بھی اکیلی ہوتی ہوں، چاچی بھتیجی لڑتی رہا کریں گی اور پھر تیری شادی بھی کروں گی۔ بارات کو چھوٹا گوشت اور نان کھلاؤں گی۔'' سب عورتیں ہنس

پڑیں۔ سمیرا مزید سکڑ کر بیٹھ گئی۔

''چودھری اِس کے باپ کو حکم کرے، کبھی نہیں ٹالے گا اور کیا چاہیے اُسے۔ فرض سے فارغ ہو گیا۔''

''کبھی کبھار ملنے بھیج دیا کرنا۔ گاؤں اِس کے بغیر سنجا ہو جائے گا۔''

''پہلے میں تو اجازت لے لوں۔'' نزہت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اجازت ہی اجازت ہے۔ اِس کی بھی جان چھوٹ جائے گی۔''

جب مجاہد آیا تو سب عورتیں جا چکی تھیں۔ نزہت نے سمیرا کا ذکر کیا۔

''کل میں اُس کے باپ کو بلاؤں گا۔''

نزہت اتنا تھک چکی تھی کہ اُس نے مزید کوئی بات نہ کی اور کروٹ لے کر سو گئی۔ مجاہد بھی اندھیرے صحن کو دیکھتے ہوئے، اپنی یادوں میں گم کسی وقت سو گیا کہ اُسے احساس ہوا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اندھیرے صحن میں اُس کی نظر کو دیکھنے کے قابل ہونے میں کچھ وقت لگا۔ جب پورا صحن اُس پر واضح ہو گیا تو اُسے اپنی ہی روشنی سے چمکتا ہوا ایک سایہ سا نظر آیا جو نزہت کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا لباس سفید اور لمبی ڈاڑھی بھی سفید تھی۔ وہ نظر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس سائے کی شناخت نے مجاہد کے جسم میں خوف کی کپکپی دوڑا دی، اُس نے آنکھیں بند کرنا چاہیں لیکن اُس روشن سائے میں ایسی کشش تھی کہ وہ اُسے دیکھتا ہی رہا۔ اُس نے بابے سوڈھی کو کم از کم چالیس برسوں کے بعد دیکھا تھا اور اچانک وہ اُسے اُتنا ہی اپنا لگا جیسے میاں جی۔ اُس نے محسوس کیا کہ بابا سوڈھی بالکل اُسی طرح تھا جب اُس نے اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ سب یہیں صحن میں کھانا کھا رہے تھے کہ وہ اچانک اُسے سب کے درمیان میں کھڑا نظر آیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں کے بعد باپ بیٹے میں اختلاف تھا۔ اُسے صرف اُن دونوں نے ہی دیکھا تھا، نہ سوتیلی ماں نے اور نہ ہی اُس کی بیٹی نے۔ شاید وہ محمد مالک کی نسل کو ہی نظر آتا تھا۔ میاں جی نے کہا تھا کہ سوڈھی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا جب کہ مجاہد کو وہ سیڑھیوں تک جاتا تو نظر آیا تھا اور پھر وہ اُسے نہیں دیکھ سکا تھا۔

بابا سوڈھی آج اُسی دن والا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مجاہد نے اپنے آپ کو پانچویں جماعت کا طالب علم ہی سمجھا اور وہ سوڈھی کے چہرے میں تبدیلی دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی

ڈاڑھی اُسی طرح تھی اور وہی کرتا اور تہبند لباس تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش مجاہد کے ذہن پہ نقش تھے اور آج اُسے اُن میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ اب تک سوڈھی کو مر جانا چاہیے تھا لیکن چالیس سال کے عرصے نے اُس کی عمر میں اضافہ نہیں کیا تھا، وہ اُسی طرح تھا۔ کیا قتل ہونے والے زندہ رہتے ہیں؟ اُس کے ذہن میں کئی ایسے فلم آ گئے جن میں سوڈھی کی طرح بھٹکتی ہوئی روح کو مرنے کے لیے اُسی جگہ ایک بار پھر مرنا ہوتا ہے تاکہ سکون پا سکے۔ اُس نے حال ہی میں ایک ناول پڑھا تھا جس میں مقتول کی روح، جس کا جسم کنوئیں میں پڑا تھا، فریاد کرتی تھی کہ جسم کو جلد از جلد دفن کر دیا جائے تاکہ اُس کی اذیت ختم ہو۔ کیا سوڈھی کو ایک مرتبہ پھر مارا جانا چاہیے؟ اُسی وقت سوڈھی نے مجاہد کی طرف دیکھا۔ مجاہد چاہتا تھا کہ سوڈھی وہیں بیٹھا رہے۔ ایک عرصے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر کے اندر کسی بزرگ کے پاس بیٹھا ہے، اُس کا دل کیا کہ اُٹھ کر سوڈھی کے پاؤں چھو لے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جیسے ہی اُٹھا سوڈھی نے غائب ہو جانا ہے۔ مجاہد نے دیکھا کہ سوڈھی رو رہا ہے، اُسے روتے دیکھ کر مجاہد کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے آنسوؤں کے دھندلکے میں سوڈھی کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سوڈھی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک نظر سوئی ہوئی نزہت پر ڈالی۔ مجاہد کو لگا کہ وہ خاموشی سے محوِ کلام رہے ہیں اور اب وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ مجاہد نے اپنی آنکھیں بھینچ کے آنسو گرا کے سوڈھی کو دیکھا، اب وہ برآمدے کی طرف دیکھ رہا تھا، مجاہد کو لگا کہ سوڈھی شاید آخری چکر لگانے آیا ہے۔ اُس کا اپنا بھی آخری چکر ہے، گھر اُس نے کسی کو رہنے کے لیے دے دیا ہے جو کسی وقت اُن کا ہی ہو جانا ہے۔ وہ کیوں آئے؟ اُس کی نسل کا اُس پر اختتام ہو گیا ہے۔ اُسے اچانک سوڈھی کے رونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وہ رائے بوچہ مل کی نسل کا آخری فرد تھا اور سوڈھی ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا، اُن کی یہ الوداعی ملاقات تھی۔ وہ کل سے یہاں آباد ہونے والوں کو گھر کا حصہ نہیں سمجھتا تھا۔

سوڈھی نے سیڑھیوں کی طرف قدم اُٹھایا اور پھر مڑ کے اُس کی طرف دیکھا۔ مجاہد کو لگا کہ سوڈھی کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی اور وہی مسکراہٹ لیے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا اور اُس کے جانے کے بعد دیر تک روشنی کا ہالہ اُسی جگہ کھڑا رہا جہاں سے سوڈھی پیل پایوں کو دیکھتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہالہ تحلیل ہو گیا اور صحن میں ایک اُداسی پھیل گئی۔ اُسے ایک دم خیال آیا کہ ایسے تو نہیں کہ سوڈھی کا میلہ بند کرا دیا گیا ہو اور میلہ نہ ہونے کی وجہ سے سوڈھی کی روح اپنے سر سے

رابطہ کھو بیٹھی ہو؟ صبح معلوم کرے گا۔ اُس نے موبائل پر وقت دیکھا، تین بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔ اُسے اُلجھن ہونے لگی کہ وہ اڑھائی گھنٹے کس طرح کاٹے گا؟

رات خاموش تھی، کبھی کبھار کسی گھر سے مرغ کی بانگ کی آواز آجاتی یا کسی بھینس کے کھرلی کے ساتھ جسم رگڑنے کی یا کہیں دور کسی کتے کے بھونکنے کی یا کسی بھوکے بچھڑے کے گھر والوں کو دودھ نکالنے کا وقت یاد کرانے کے لیے ڈکرانے کی آواز......اور وہ انہیں آوازوں کو سنتے ہوئے سو گیا۔ وہ دو گھنٹوں کے لیے ایک گہری نیند تھی، وہ سوڈھی سے ملاقات کر کے مطمئن تھا۔ سوڈھی اِس گھر میں اُس کے دادا، دادی، باپ، ماں، سوتیلی ماں اور اُس کے اپنے ساتھ رہتا رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں، محرومیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں میں اُن کا ساتھی رہا تھا۔ اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ اُس کے پیدا ہونے سے دو راتیں پہلے، جب وہ پریشان تھی اور جاگ رہی تھی تو اُسے سوڈھی صحن پار کرتے ہوئے نظر آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سوڈھی گھر کو چلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اور وہ گھر یہی پیغام دینے کے لیے آیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ مطمئن ہو کے سو گئی تھی۔

سوڈھی کا سرمانا رانی کے سامنے دفن تھا اور وہاں جیٹھ کی دس تاریخ کو میلہ لگا کرتا تھا، اب پتا نہیں، لگتا بھی ہے کہ نہیں۔ اگر بند ہو گیا ہے تو شروع ہو جائے گا، ابھی بیساکھ ختم نہیں ہوا۔ اُس نے صبح زمین کے ٹھیکے کی تجدید کی بھی بات کرنی ہے۔ وہ نرم سی سپیدی میں جاگا، بہت عرصے کے بعد اُس نے سپیدے کی یہ نرماہٹ دیکھی تھی، اُس نے نزہت کو جگایا تا کہ وہ بھی اِس کی خوب صورتی سے اپنی آنکھیں سیر کر لے۔ نزہت نے جاگ کے جس طرح آنکھیں بند کر کے اُس نرماہٹ کا مذاق اُڑایا، اُسے یہ فطرت کی توہین لگا۔

''چودری جی! بابے کا میلہ نہیں ہوتا۔ وہ کافر تھا اور اُسے یاد کرنا کفر ہے۔'' اُس کے پرانے ملازم حسینو نے اُسے اطلاع دی۔ وہ اپنا مٹی کا حقہ لیے اُس کے سامنے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجاہد کو بھی کچھ ایسا ہی شک سا گزر رہا تھا، اُس کے تجربے نے یہی بتایا تھا ورنہ یہ لوگ تو میلوں ٹھیلوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ اُس کا بابا سوڈھی کے ساتھ ایک خاموش عہد تھا کہ اُس کا میلہ جاری رکھا جائے گا۔ مجاہد نے ہر برادری کے سربراہ کو بلایا اور جب سب اکٹھے ہو گئے تو اُس نے میلے کی بات کی۔ ایک احتجاج ہوا جس کے لیے وہ تیار تھا۔ وہ اُن سب کو گاؤں سے نکالنے کے لیے تیار تھا۔ زیادہ تر گھر اُس کے خاندان کی زمین پر تعمیر کیے گئے تھے جو اُس کی ملکیت تھی۔ بابے کا

میلہ گاؤں کی تاریخ کا حصہ تھا اور اس میں مذہب کی اجازت شامل تھی۔ میلے میں دعا کی جاتی تھی، قوالی میں نعتیہ اور صوفیانہ کلام گایا جاتا تھا، ناچ گانے والے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے مولا کا نام لیتے تھے، یہاں تک کہ میلے میں آیا ہوا کوئی جیب کترا اگر جیب کاٹنے لگے تو وہ بھی پروردگار کو یاد کرتا تھا۔ جیب کترے کا ذہن میں آتے ہی اُسے نتھو یاد آ گیا اور ثمیرا کی بات کرتا بھی، اُس کا باپ بھی نائی تھا۔ اُس نے کہا کہ بابا اِس تمام بکھیڑے میں کہاں آتا ہے؟ اور جو بابے کو کافر کہتا ہے وہ اُن سب کو کافر کہتا ہے اور وہ یقیناً کافر نہیں تھے، اگر کوئی ہے تو بتائے۔ پھر اُس نے حکم دیا کہ سب میلے کی تیاری شروع کریں اور وہ خود بھی چادر چڑھانے آئے گا۔ وہاں کھسر پھسر ہوئی، حقے تیزی کے ساتھ گھومے، سگریٹ سلگائے گئے، گلے صاف کیے گئے، نگاہوں کے دزدیدہ سے اشارے ہوئے اور تیزی سے اثبات میں سر ہلائے گئے۔

مجاہد کو سوڈھی کا آنسو بہانا یاد آ گیا! اُس نے سوچا کہ شاید اِس وقت اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہوں، مجاہد کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنے اردگرد چارپائیوں پر بیٹھے لوگوں کو دیکھا، وہ ایک اطاعت کے ساتھ اُسے دیکھے جا رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ اُس کے باپ کے زمانے میں چند لوگ ہی چارپائیوں پر بیٹھتے تھے، باقی زمین پر بیٹھے اپنے اپنے مٹی کے حقے سامنے رکھے ہوتے۔ اُسے اُن کے چارپائیوں پر بیٹھنے کا ذاتی طور پر اعتراض نہیں تھا۔

وہ جب شام ہونے سے تھوڑا پہلے گاؤں سے نکلے تو مجاہد مطمئن تھا۔ سوڈھی سے اگر ملاقات نہ ہوتی تو وہ شاید مایوس اور شکستہ دل لوٹتا، اُس ملاقات نے اُسے زندگی کا ایک نیا رُخ دکھا دیا تھا۔ سوڈھی نے اُس کے آنسو اپنی آنکھوں سے بہائے تھے، وہ اپنی کم مائیگی پر کبھی نہیں رویا تھا لیکن سوڈھی کے آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آنسو بہاتے بہاتے اپنے اپنے دکھڑے ایک دوسرے کو دے کر شانت ہو گئے، اب مجاہد آزاد تھا اور شاید سوڈھی بھی مکتی پا گیا ہو۔ وہ اگر گاؤں نہ آتا تو اِس طرح کبھی محسوس نہ کرتا۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے کار چلانے لگا اور ثمیرا پچھلی سیٹ پر بیٹھی آنسو بہاتی تھی۔

اُس رات وہ بہت خوش تھا، اتنا خوش کہ اُسے اپنے بدن میں خواہشوں کی انگڑائیاں محسوس ہوئیں۔ نزہت نے پہلے اُسے لاتعلقی سے دیکھا کہ وہ اُس سرحد کو بند کر چکے تھے اور پھر

جب وہ سرحد سرک کر نزدیک آتے محسوس ہوئی تو پہلے گھبرائی، پھر شرمائی، اپنے آپ پر اترائی اور اک بے نیازی کے ساتھ مجاہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے، مستی میں ڈوبی لمبی سانس لے کے، اُس کے ساتھ لگ گئی۔ مجاہد کو دبے دبے احتجاج، گھٹی گھٹی سی مدافعت اور جارحیت سے بھری پسپائی کی اُمید تھی لیکن نزہت کا ردِعمل غیر متوقع تھا۔ اُسے اپنے اندر ایک نئی شکتی کا احساس ہوا، اُسے اپنے بازوؤں کی مچھلیوں میں مسلسل حرکت لگی جو جسم کے متحرک ہونے کی علامت تھی۔ وہ دونوں ہی ایک خیال کے تحت ایک دوسرے کے پاس آتے گئے اور مجاہد نے دل ہی دل میں سوڈھی کو سیلیوٹ پیش کیا۔

سمیرا کا جلد ہی دل لگ گیا۔ وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کے نزہت کے پاس آن بیٹھتی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی باتیں سنانا شروع کر دیتیں۔ نتھو جیب کترا بھی چکر لگاتا، بظاہر وہ روزانہ کا سودا سلف پہنچانے آتا لیکن باقاعدگی کی ایک وجہ سمیرا بھی تھی۔ وہ اپنے بال درست کر کے، آئینے کے سامنے کئی مرتبہ دیکھنے کے مختلف اندازوں کی مشق کرنے کے بعد ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور سمیرا کو سبزی والا تھیلا تھماتے ہوئے اُس کے ہاتھ کبھی انگلیوں، کبھی پوروں اور کبھی پیٹ کو چھو جاتے۔ شروع شروع میں سمیرا کو یہ ناپسند گزرتا تھا لیکن متواتر دہرائے جانے کے بعد اُسے اِن میں ایک اپنائیت، معمول اور قرب کا احساس ہوا اور جب اُسے معلوم پڑا کہ نتھو بھی نائی ہے تو اُسے اُس میں ایک مخصوص کشش نظر آئی اور وہ دس بجے کے قریب نتھو کے انتظار میں ہو جاتی۔

مجاہد کی مصروفیت میں فضیل کے بلڈ بنک کا اضافہ ہو گیا تھا، اُسے تنگ اور نیم تاریک کمرہ ایک کھڈی ہی لگی، وہاں ایک میز رکھی تھی جس کے دوسری طرف رکھی کرسی تک پہنچنے کے لیے میز کو کھسکانا پڑتا اور اِس طرف پڑی دو کرسیاں بھی رکاوٹ تھیں۔ اُس کا خون سٹور کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور ایمرجینسی کے استعمال والا خون دو میڈیکل سٹورز کے فریجوں میں رکھا رہتا جہاں سے ضرورت مند ساتھ استعمال ہونے والی دوسری ضروری چیزیں بھی خرید لیتے اور یہی اُن کے ساتھ طے تھا۔ اُس نے نتھو سے بال بنوائے جو اُسے پسند آئے۔ مجاہد نے فضیل کو بتایا کہ بشیرے کی شادی کا بندوبست کرے تاکہ وہ اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کی راہ پر چل پڑے۔ فضل اب خاندان کے کاروبار میں شامل ہو گیا تھا اور مجاہد نے اُس کے بھائیوں کو فضل کے سامنے بتایا

کہ اُسے ایک صبح اور ایک شام کو ہیروئن بھرا سگریٹ پینے کی اجازت دے دیں، زیادہ نہیں۔ اُس کی تحقیق کے مطابق ایک دم نشہ چھوڑنا نشئی کو اپنا نشہ جاری رکھنے کا ہی کہنا ہے، اُس کی قوت ارادی ابھی اتنی تعمیر نہیں ہوئی ہوتی کہ وہ اپنی عادت چھوڑ دے۔ وہ فضل اور فضیل کی موجودگی میں فضل کی بیوی سے بھی ملا جو اُسے سمجھ دار عورت لگی۔ اُس نے سر ڈھانپا ہوا تھا دوپٹہ سر پر لپیٹا نہیں ہوا تھا اور بات کرنے کے بعد آنکھ جھکا لیتی تھی تاکہ سر اُٹھائے بغیر بات کرے اور چور نظر سے دیکھتی جائے۔ اُس کی بات میں منطق اور رویے میں دلیری تھی۔

''اگر یہ تعاون کریں تو میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔'' اُس نے فضل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ فضل نے جواب میں گردن جھکا لی تھی۔ ''انکل جی! آپ جیسے چند اور لوگ آ جائیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہاں آپ کے خلاف ایک محاذ ہے اور میں اُن کے خلاف ہوں، لوگوں کے گھروں میں جا کے آپ کے حق میں آواز اُٹھاتی ہوں، سب کے سامنے آپ کی اچھائی رکھتی ہوں۔ یہاں منافقت ہے، اخلاقیات کے نام پر۔'' اُس نے فضیل اور مجاہد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مجاہد اِس تعریف سے کچھ شرما سا گیا، اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اُس نے اِس قصبے میں آ کے وہاں کی زندگی پر کسی طرح اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے؛ یہ اُس کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف چند راہ گم کردہ نوجوانوں کو زندگی کے سفر کی طرف موڑ رہا تھا۔ وہ نا تو کسی کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا اور نا ہی کسی کے ساتھ کوئی مقابلہ تھا، وہ تو اِن لوگوں پر زندگی کھولنا چاہتا تھا، کوئی اِسے اگر کوئی اور شکل دے تو یہ اُس کی کم عقلی ہے!

''جن لوگوں کو میرے رویے یا طریقے پر اعتراض ہے اُن سے مل نا لوں؟'' مجاہد نے فضیل اور فضل کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! آپ کسی سے نہیں ملیں گے۔ ہم آپ کی سرپرستی میں اچھے کام کر رہے ہیں، عام آدمی کو یہ احساس ہو رہا ہے۔ صرف اُن کو خطرہ ہے جو غریب کا ووٹ حاصل کرتے ہیں، وہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ اُن کے اور اُن کے ووٹر کے درمیان آ رہے ہیں۔ میں ایک سیاسی کارکن بھی ہوں، مجھے اُن سب کو سیاسی مار دینی ہے لیکن آپ کو بیچ میں لائے بغیر۔ فضل جب ٹھیک ہو جائے تو اِسے مقامی حکومت کے الیکشن میں ڈالنا ہے۔ اِس کے پاس سب کچھ ہے، پیسہ، خاندان اور

تعلقات۔'' یہ بات کرتے ہوئے فضیل کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور مجاہد کو محسوس ہو رہا تھا
کہ سگریٹ اور پان نے مل کر اُس کے پھیپھڑوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا ہے۔

''میں تیار ہوں۔ مجھے دو سگریٹوں کی جو اجازت ملی ہے میں اُسے بھی قبول نہیں کرتا۔'' فضل نے جیب میں سے ایک پُڑی نکال کے اپنی بیوی کو دی جس نے بُرا سا منہ بنا کے ہاتھ پر ڈوپٹے کا پلو رکھ کے ہتھیلی پر نکالی۔ پھر وہ مسکرانے لگی، اُس کی مسکراہٹ کانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

''انکل جی! ایک درخواست کروں؟'' فضل کی بیوی کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا اور مجاہد کی گھبراہٹ اُس کے چہرے پر لکھی گئی۔ مجاہد اُس کی درخواست سے خوف زدہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ ملاقات ختم ہو جائے۔ اُسے فضل کی بیوی کو کوئی جواب دینے کے بجائے وہاں سے چلے جانے کا خیال آیا۔ اُس نے تائید کے لیے فضیل کی طرف دیکھنا چاہا لیکن فضل کی بیوی کی آواز نے اُسے روک دیا:

''انکل جی! آپ رات کا کھانا یہاں کھائیں گے، آنٹی جی بھی آئیں گی۔'' مجاہد کو اُس کا دعوت دینے کے بجائے حکم دینا اچھا لگا۔ ''فضیل بھائی اور رخسانہ بھی آئیں گے۔'' اب وہ پُر اعتماد تھی۔ وہ خوشی سے ہنسے جا رہی تھی، ''انکل جی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ میری آج شادی ہوئی ہے۔'' پھر وہ ایک دم شرما گئی اور اپنا سر جھکا لیا۔ فضیل نے بھی سر نیچے کر کے مسکرانا شروع کر دیا، مجاہد کو لگا کہ وہ آواز نکالے بغیر ہنس رہا تھا اور وہ خود بھی اُسی طرح مسکرا رہا تھا۔ ''انکل جی! ضرور آنا ہے۔'' مجاہد اُس کے خلوص اور احترام کے جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اُس نے فضل کی بیوی کے سر پر پیار سے تھپکی دی اور چل پڑا۔

''کیوں نہیں آنا۔ ضرور آئیں گے۔ تم نے ہماری عزت افزائی کی ہے۔'' وہ پھر شرما گئی، ''بیٹا! تمھارا نام کیا ہے؟''

''رابعہ!''

''بہت پیارا نام ہے۔''

رات کو مجاہد، نزہت اور سمیرا کے ساتھ فضل کے گھر گیا۔ رابعہ نے شوخ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے آنگن میں تیرتے ہوئے پھر رہی تھی۔ صحن میں بیٹھنے کا بندوبست

تھا اور نحتو گھر میں رابعہ کا ہاتھ بٹانے آیا ہوا تھا۔ مجاہد کو پہلے تو اُسے وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی اور پھر اُسے یاد آیا کہ خاندانی نائی کھانا بنانا بھی جانتے ہیں۔ نحتو نے جب کیمرا کو دیکھا تو کھل اُٹھا، اُسے یہاں ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ وہ دونوں سے مجاہد کے گھر نہیں جا سکا تھا۔ اُن دونوں نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ فضل، کیٹرر سے تین میزیں اور دس کرسیاں لے آیا تھا اور تین سیٹ لگا دیے گئے۔ ایک سیٹ پر آدمی، دوسرے پر عورتیں اور تیسرے پر نحتو اور کیمرا بیٹھ گئے۔ نحتو اور کیمرا کھانا کھاتے کھاتے دوسروں کی میز پر جو ڈش خالی ہوتی اُسے بھرنے کے لیے اُٹھ جاتے۔ اسی آنے جانے میں نحتو نے کیمرا کا ہاتھ پکڑ کر چوما اور پھر اُسے ساتھ لگا لیا۔ کیمرا خوف زدہ سی اُس کے ساتھ لگی اُس کے بدن کی حرارت سے اپنے ڈر کو دور کر رہی تھی۔ اُسے نحتو نے اپنے ساتھ بھینچا ہوا تھا اور کیمرا اپنے گاؤں والے عاشق کے ساتھ نحتو کا موازنہ کر رہی تھی۔ اُس کے جسم سے پسینے کی سانس گھونٹنے والی بو کا اُسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ رات کو اُسے جب ملتی وہ کام سے آیا ہوتا اور نحتو تازہ دم اور خوشبوؤں کو اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ نحتو کے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر آ گئے اور وہاں رکنے کے بعد وہ اُس سے الگ ہو کے باہر اپنی میز پر آ گیا اور تھوڑی دیر بعد کیمرا بھی۔ وہ جیب کترا رہا تھا اور اُسے سب کی موجودگی میں اپنا کام کرنا آتا تھا۔ وہ سب کی نظر بچا کے کیمرا کے منہ میں لقمہ ڈالے جاتا اور وہ ہر بار اُس کی انگلیوں کو چوم لیتی۔ نحتو نے کیمرا کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھا ہوا تھا اور انگوٹھے کے ساتھ پاؤں کی انگلیوں کو محسوس کر رہا تھا۔ جب نحتو نے محسوس کیا کہ کیمرا اُس اُسترے کی طرح ہو گئی تھی جسے پٹی پر اتنا رگڑا گیا ہو کہ وہ اپنی دھار سے بھینسے کا گلا بھی کاٹ ڈالے تو اُس نے اپنے ہونٹ تر کیے اور تھوڑی سی زبان باہر نکال کے کیمرا کی طرف لہرائی۔ کیمرا کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور اُس کا تھوک گلے میں خشک ہو رہا تھا۔

''میں رات کو آؤں گا۔ بندوبست کر لو گی؟'' نحتو نے وار کیا۔ اُسے کیمرا کے تڑپتے ہوئے جسم کے ساتھ اُس کی معصومیت بھی پسند تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ اُس نے ایک بار پھر تھوک نگلنے کی کوشش کی:

''چاچا!'' وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

''سر جی، میرے محسن ہیں۔ میں اُن سے ڈرتا ہوں لیکن تمھیں ملنا ضرور ہے۔'' اُس نے پھر اپنے ہونٹ تر کیے۔ کیمرا نے سوچا کہ چاچی بھی چاچے کو پسند کرتی تھی اور اُنھوں نے مرضی

سے شادی کی تھی۔ عین ممکن ہے وہ بھی ایسے ہی ملتے ہوں۔ اُسے اپنی سوچ سے حوصلہ ہوا۔

"زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں۔ میں نیچے ہی سوتی ہوں۔" اِس مرتبہ اُس کے گلے میں سانس نہیں اٹکا۔

"بس اُتنی ہی دیر جتنی دیر میں جیب کاٹ لوں۔" اُس نے سمیرا کے پاؤں پر اپنا پاؤں رگڑا۔ "دروازے کا کیسے کرو گی؟"

"چاچا رات کو سونے سے پہلے اوپر جا کے جنریٹر دیکھتا ہے اُس کا بٹن دبا ہوا ہے کہ نہیں اور پھر وہ سو جاتا ہے۔" سمیرا نے سرگوشی کی۔ اُسے لگا کہ نتھو باہر گلی میں کھڑا ہے۔

"چابی کہاں ہوتی ہے؟"

"نیچے۔ گھر کی تمام چابیاں ٹانگنے کے لیے لکڑ کا چھوٹا سا گھر بنا ہوا ہے۔ وہاں لٹک رہی ہوتی ہے۔ اِن ساری چابیوں کی دوسری چابیاں چاچی کے پاس ہوتی ہیں۔"

"میں سامنے مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں گا۔" بات روک کر اُس نے تھوڑی دیر سوچا، "تم نے دروازہ دو بار کھول کے بند کرنا ہے اور بے خیالی میں تالہ نہ لگا دینا۔" سمیرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسی وقت مجاہد اپنی جگہ پر ہلا تو نتھو چیتے کی تیزی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ گھر جانا چاہتا تھا، نتھو اُس کے پیچھے کسی ہدایت کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ مجاہد نے صحن میں نظر دوڑائی، نزہت، رابعہ اور رخسانہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اُس نے مسکرا کر نتھو کی طرف دیکھا اور آنکھ سے نزہت کی طرف اشارہ کیا۔ نتھو تیزی سے نزہت والی میز کے پاس جا کر اُس کی بات ختم ہونے کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

"آپ کے پاس خون کا ریکارڈ ہونا چاہیے، دینے والوں کا اور لینے والوں کا بھی۔ شروع میں تو ایک رجسٹر رکھیں لیکن بعد میں ایک کمپیوٹر کا بندوبست کریں جس میں کسی وقت والنٹیر اینٹریاں کر جائے۔ یہ مزہ نہیں آتا کہ تکے سے پتا چلے کہ اُس دن فلاں فلاں نے خون دیا تھا یا فلاں فلاں کو لگا تھا۔ آپ کے پاس یہ ریکارڈ بنک کے کھاتے کی طرح مکمل ہونا چاہیے۔" مجاہد نے فضیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "فضل! بہت مہربانی، کھانے کا مزہ آیا اور شام بھی بہت اچھی رہی۔"

فضل سے کوئی جواب بن نہ پایا اور وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اُسی وقت نتھو، نزہت کے قریب گیا اور جھک کر سرگوشی کی:

''میڈم!'' اور اُس نے مجاہد کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ نزہت نے نتھو کی طرف ستائشی نظر سے دیکھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں عورتیں بھی۔ یمیرا بھی اُن کے ساتھ اِس طرح شامل ہوگئی کہ وہ نتھو کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے نتھو کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور نتھو نے اُن کے چلنے کے وقت پلکیں جھکا کے سلام کیا۔

سمیرا گاؤں میں اللہ کی چارپائی پر سوتی تھی، یہاں اُسے فوم والا پلنگ ملا، وہ اُس پلنگ پر لیٹی گھر کی رات کی آخری آوازیں سن رہی تھی۔ یہی آوازیں وہ ہر رات سنتی تھی اور چاہا کرتی تھی کہ دیر تک چلتی رہیں لیکن آج اُسے اُن کے جلد ختم ہو جانے کا انتظار تھا۔ وہ گلی میں ہر آواز کو نھتو کے ساتھ منسلک کر رہی تھی۔ اُسے اوپر مجاہد کے چلنے پھرنے کی آواز آ رہی تھی، اُسے اُس کا ہر قدم کئی گھنٹوں کے بعد پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ اب رات بالکل خاموش ہو گئی تھی اور اُسے مجاہد کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آنے لگی۔ اب تھوڑی دیر اور تھی، پھر مجاہد اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بھیڑ لے گا اور وہ اُن سے دور ہو جائے گی۔ یہ ایسی دوری ہو گی جو اُسے نھتو کے قریب کر دے گی۔ اُس نے نھتو کے انتظار میں ایک لمبی سانس لی، اُسے نھتو کی آنکھوں کا الوداعی سلام بے چین کیے دے رہا تھا۔ اُس نے کروٹ بدلی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کا جی چاہا کہ اوپر جو بھی کام ہیں وہ خود جا کے فوراً ختم کر آئے۔ اُسی وقت مجاہد نے سیڑھیاں نیچے اُترنا شروع کر دیں؛ صرف آٹھ سیڑھیاں اور اُن پر سے نیچے آتے ہوئے زندگی کا طویل سفر! اُسے اپنے چاچے پر غصہ بھی آیا لیکن بار بار اوپر دیکھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجاہد دروازے کے سامنے آ کے رُکا اور اب سمیرا دروازہ کھلنے کے انتظار میں تھی، اُسے لگا کہ وہ وہاں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا جب کہ نھتو مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا دروازے کے کھل کے بند ہو جانے کے انتظار میں تھا۔ پھر اُس کے لیے رات کا طویل سفر ختم ہوا؛ اوپر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور پھر چٹخنی لگنے کی مدھم سی، ایک مترنم سی آواز۔ سمیرا نے مجاہد کے غسل خانے میں جانے، لباس تبدیل کرنے اور چاچی کے ساتھ نیند میں جانے سے پہلے معمول کی چند غیر اہم باتوں کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ اُسے اوپر سے آوازیں آنا بند ہو گئیں اور گلی میں مکمل خاموشی چھا گئی، اُس نے سوچا کہ اتنی گہری خاموشی میں اُس کا وصال ہو سکے گا؟ اُس نے مجاہد کے نیند کی وادی کے طویل تر سفر کے آغاز کا انتظار کیا اور پھر آہستہ سے اُٹھ کر خوف اور خواہش سے بھرے ہوئے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز کو غور سے سنا اور دروازے کی طرف چل دی۔ نھتو

نے تاکید کی تھی کہ جلدی میں دروازہ بند کر کے وہ کہیں تالا نہ لگا دے!

وہ دروازے کے پاس جا کر رکی، اُسے چابی لانا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ لکڑی کے بنے ہوئے کھلونا گھر کے ساتھ لٹکتی ہوئی چابی لے کے دوبارہ دروازے کے پاس گئی۔ اُس نے چابی گھمائی اور چابی گھومنے کی ٹک سے ڈرتے ہوئے، جس کی آواز اُسے کان پھاڑتی لگی، اوپر سے کسی کے قدموں کی آواز سننے کے لیے اُس طرف کان لگا دیے؛ وہاں دو ہی آوازیں تھیں، ایک اُس کا دل دھڑکنے کی اور دوسری ہر سو پھیلی خاموشی کی۔ اُس نے گہری خاموشی کی آواز سے حوصلہ پا کے دروازہ کھولا، گلی کے دونوں طرف دور تک دیکھنے کی کوشش کی، اُسے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نظر نہ آیا، مسجد کی سیڑھیاں بھی خالی تھیں، اُسے یقین ہو گیا کہ نھو دھوکہ دے گیا ہے۔ اُس نے شہری لڑکوں کے بارے میں جیسے سُن رکھا تھا، نھو تو ویسا ہی نکلا۔ اُس نے دروازہ بند کر کے، اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے دروازہ ایک بار پھر کھول کے بند کیا، تالا لگائے بغیر، تھکے ہوئے بھاری قدموں کے ساتھ اپنے پلنگ پر آ رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسے دروازہ کھلنے، بند ہونے، چابی کے گھومنے اور اندر آتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ خوشی۔ خوف اور توقع سے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اُس کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو کے خواہش کے لعاب سے بھر گیا جسے اُس نے نگل لیا۔

نھو خاموشی کے ساتھ اُس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ سمیرا گاؤں میں اپنے عاشق کو کسی کھیت کی باٹ، کھنڈر بنے خراس کے چکر کو ڈھانپ رکھنے کے لیے بنائے گئے کھڈے کے اندر، پپا رکھنے والی جگہ سے داخل ہو کے اور موچیوں کی دکانوں کے اندر ملنے کے بجائے آرام دہ پلنگ پر نھو سے مل رہی تھی۔ اُس نے سرشاری میں ایک لمبی سانس لی اور نھو نے ٹٹول کر اُس کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا...... اب ہر رات سمیرا دروازہ کھول دیتی اور وہ اِسی طرح کسی کو نظر آئے بغیر اُس کے پہلو میں لیٹ جاتا۔

ایک دن سمیرا کو پہلے چکر آئے، جی متلایا اور پھر تے ہو گئی۔ نزہت کو شک سا ہوا، اُسے سمیرا اور نھو کا فضل کے گھر میں اکٹھے اندر باہر جانا مشکوک سا لگا تھا لیکن اُس نے اِسے ہم عمر لڑکے اور لڑکی کی ایک معصومانہ کھیل کے علاوہ کچھ اور سوچنا مناسب نہ جانا۔ اُس نے مجاہد سے بات کر کے اُس کا اُمید سے ہونے کا ٹیسٹ کروایا جو مثبت نکلا۔ نزہت نے ڈاکٹر سے مل کے اُس کا الٹرا ساؤنڈ کروایا، وہ دوسرے مہینے میں تھی اور اُسے یہاں آئے ابھی بیس دن ہی ہوئے تھے۔ وہ

گاؤں سے ہی پیٹ سے آئی تھی اور اُسے گھر کے صحن میں اُس کی پسند کی شادی کی بحث یاد آ گئی۔
سمیرا اپنے صحن نما کمرے میں ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اُس کی وجہ سے چاچا اور چاچی بے عزت ہو جائیں گے۔ وہ کیا کرے؟ نتھو سے مشورہ کرے؟ کیا نتھو اُسے ملے گا؟ وہ تو ایک بدکردار لڑکی تھی جس کا نتھو دوسرا عاشق تھا۔ وہ اُسے سچ سچ بتا دے گی۔ اُسے صرف چاچا چاچی کی عزت عزیز تھی۔ اُسے گاؤں والے کھیت مزدور سے بالکل محبت نہیں تھی، وہ اُسے صرف ایک مجبوری کے تحت ملتی تھی، اُس کے گھر کے معاملات میں اتنا کھچاؤ تھا کہ اُسے تو صرف چھٹکارا چاہیے ہوتا تھا، اِسی لیے وہ باتوں، خراس کے کھڈے اور موچیوں کی دکانوں پر بچھی چٹائیوں پر ملنے کا خطرہ مول لیتی رہی تھی جس کا صلہ آج اُسے مل گیا؟ یہ نتھو کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا؟

سمیرا نے نتھو سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا!

رات کو اُس نے ہمیشہ کی طرح تالا کھول دیا اور ہمیشہ کی طرح نتھو جھونکے کی طرح کسی درز سے اندر داخل ہوا اور اُس کے ساتھ لیٹ گیا اور سمیرا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور نتھو اپنی اُنگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو سہلانے لگا۔

''انسان غلطیاں کرتا ہے اور اچھے لوگ اُسے معاف کرتے ہیں۔'' سمیرا نے بات شروع کی، ''میں بھی ایک غلطی کر بیٹھی ہوں۔'' نتھو اُس کے ہاتھ کو سہلاتا رہا، ''میری ماں فوت ہو گئی تو باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے میری زندگی برباد کر رکھی تھی، میں ہر وقت ایک بوجھ تلے دبی رہتی۔ مجھے اُس بوجھ سے چھٹکارا پانا تھا اور ایک کھیت مزدور نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا، مجھے خوب مدھولتا اور ایک سکون دیتا۔ ہم راتوں کو ملتے، مجھے اُس سے پیار نہیں تھا لیکن اُس کی ضرورت بھی تھی۔ میں اُس سے ماں بننے والی ہو گئی ہوں۔'' نتھو کی انگلیوں نے اُس کے ہاتھ کو سہلانا بند کر دیا اور وہ ایک لاش کی طرح لیٹ گیا۔ ''میں تمھیں جب ملی تو کنواری نہیں تھی لیکن پھر بھی کنواری تھی۔ چاچا اور چاچی کے پلّے کچھ نہیں رہے گا۔ میری مدد کرو۔'' سمیرا کو اچانک نتھو کے جسم میں جان محسوس ہوئی۔ اُس نے نتھو کا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھتے ہوئے کہا، ''اِس کو ضائع کروا دو۔''

''کیا تم بہت مجبور تھیں؟'' نتھو نے زخم خوردہ آواز میں پوچھا۔

''بہت اکیلی تھی۔ کوئی سہارا چاہیے تھا۔ مجھے سنبھال لو۔'' اُس نے سسکی لی۔

''ہماری گلی سے اگلی میں ایک عورت یہ کام کرتی ہے۔ اُسے کہوں گا، تو اب پریشان نا ہونا، ہو جائے گا۔ اُس نے کافی کیس کیے ہوئے ہیں۔ میرا خرچا ہوگا لیکن اگر کوئی جیب کٹ سکی تو مسئلہ نہیں رہے گا۔ ورنہ فضیل بھائی کی منت کروں گا۔'' اب نتھو کی آواز میں اعتماد تھا، اُس نے سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر سہلانا شروع کر دیا۔

سمیرا نے سارا دن شرمندگی، خوف، پچھتاوے اور ایک دکھ میں گزارا تھا، اُسے رہ رہ کر اپنی ماں یاد آتی رہی تھی۔ وہ اگر ہوتی تو سمیرا کبھی اِس اڑچن سے دوچار نہ ہوتی۔ وہ وقفے وقفے سے روتی رہی تھی اور اب نتھو کی بات سے اُسے اتنا حوصلہ ہوا کہ اُسے لگا کہ سارا دن سورج سر کے فاصلے پر چمکتا رہا ہے اور اِس آگ میں چلتے چلتے راستہ ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اُسے ایک دم حوصلہ ہوا، سکون آ گیا اور وہ تھکاوٹ سے چور نتھو کے ساتھ لگ کے سو گئی۔

اگلی صبح ایک نیا دن تھا۔ روز کا سودا سلف دینے جب نتھو آیا تو سمیرا کونے میں فرش پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اُسے ڈگ کتے کی طرح لگی جو سارا دن کتوں، گھروں کے مالکوں، گلیوں میں کھیلتے آوارہ لڑکوں، گزرنے والوں اور شغل سے لات مارنے والوں کے ڈنڈے، لاتیں اور پتھر کھاتے کھاتے کسی گھر کے کونے میں چھپ کے بیٹھ گیا ہو۔ نتھو کا دل بھر آیا اور وہ کھڑا رہا کہ موقع ملتے ہی اُسے پڑیاں تھما دے جو صبح شام کھانی تھیں۔ نزہت سودا باورچی خانے میں رکھنے کے لیے گئی تو نتھو نے تیزی کے ساتھ پڑیاں اُس کی طرف پھینک دیں۔

''ایک صبح اور ایک شام!'' اور وہ گلی میں نکل گیا۔ پڑیاں مٹھی میں آتے ہی سمیرا کو لگا کہ اُس کی عزت اور رہائی مٹھی میں بند ہیں۔ اُسے جسم میں طاقت محسوس ہوئی اور وہ آہستہ سے اُٹھی اور پانی کا گلاس لا کے ایک خوراک چڑھا گئی۔ سفوف بدمزہ سا تھا اور اُس نے مشکل سے قے کو روکا اور پھر اُسی کونے میں جا کے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے چکر سے آتے محسوس ہوئے لیکن وہ اپنے آپ کو قابو میں کر کے بیٹھی رہی۔ جلد ہی اُس کے چکر ٹھیک ہو گئے اور اُسے غنودگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ گئی اور پھر اُسے ہوش نہ رہا۔

وہ جب ہوش میں آئی تو اُسے کچھ عجیب سا لگا۔ وہ اپنے آپ کو کچھ اور ہی طرح کا محسوس کر رہی تھی، اُس کے اردگرد کچھ لوگ تھے جنھیں وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ صرف فضیل کو پہچان سکی اور سب کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔ وہ اپنی نیم وا آنکھوں سے سب کے چہرے

پڑھتے جا رہی تھی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اُس نے سوچا کہ یہ چاچے کا گھر نہیں ہے! اگر یہ چاچے کا گھر نہیں تو وہ کہاں تھی؟ نظر کی اِسی گردش میں اُسے ایک پولیس والا نظر آیا اور اُسے مزید حیرانی ہوئی۔ پولیس والا تو کبھی اُن کے گاؤں میں بھی نہیں آیا تھا اُس کا یہاں کیا کام؟

''خون تو نہیں چاہیے؟'' فضیل نے پوچھا۔

''نہیں! آپ جائیں، سب ٹھیک ہے اگر ضرورت پڑی تو بتا دیں گے۔'' اُسے نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی، وہ اِن آدمیوں اور عورتوں کے درمیان میں گھری ہوئی کیا کر رہی تھی؟

اُس نے دیکھا کہ فضیل اُس پر ایک عجیب سی نظر ڈال کر باہر نکل گیا تھا۔ وہ اُس عجیب سے ماحول میں فضیل کی اُس نظر کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ چاچے کے گھر میں مار کھائے ہوئے کتے کی طرح ایک کونے میں فرش پر بیٹھی ہوئی تھی اور پھر یہ بھی یاد آیا کہ نتھو اُسے دو پڑیاں دے گیا تھا جو اُس نے صبح اور شام کھانی تھیں اور ایک وہ کھا چکی تھی اور دوسری مٹھی میں بند تھی۔ اُس نے مٹھی کھولی تو وہ خالی تھی۔ اُسے پھر اپنی مصیبت کا یاد آیا اور اُس نے خوفزدہ نظر سے نتھو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا، پھر اُس نے چاچا اور چاچی کو دیکھنا چاہا تو اُس کی نظر پولیس والے پر رک گئی جو اُسے، بغیر کسی تاثر کے، دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پولیس والے کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلنا چاہا تو اُسے ایک بوجھل پن کا احساس ہوا۔

فضیل جب مجاہد کے گھر گیا تو وہ اور نزہت اُس کے انتظار میں بیٹھے تھے، وہاں اتنی خاموشی تھی کہ فضیل کو لگا کہ ایک عرصے سے بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ بھی اُس خاموشی کا حصہ بن کر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد نزہت چائے بنانے چلی گئی۔

''کیا خبر ہے؟'' مجاہد نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خطرے سے باہر ہے۔'' فضیل نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کی ڈبیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنکھوں سے اجازت مانگی۔ مجاہد، نے بھی بجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ نزہت کی طرف اشارہ کرکے منع کیا۔ فضیل نے مجبوری کے تحت ڈبیہ جیب میں رکھ لی۔ ''پولیس نے خودکشی کی کوشش کا مقدمہ درج کیا ہے۔ نیاز سنز قلعہ میں وکیلوں کی پرانی ٹابری ہے، میں اُن سے ملا تھا۔''

"اُن کے متعلق میں نے سُن رکھا ہے۔" مجاہد نے لقمہ دیا۔

"وہ آپ کو یہاں پڑھنے کے لیے رہنے کے دنوں سے جانتے ہیں۔ اُنھوں نے یقین دہانی کرائی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بلبت تو کچھ نہیں ہوا لیکن پولیس ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔ وہ کچھ بتا تو نہیں رہے لیکن سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ سمیرا کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن وکیلوں نے ایس ایچ او سے مل کر یہ معاملہ ملتوی کروا دیا ہے۔ وہ اُس کے گھر آنے تک ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ کلینک میں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔" فضیل نے خلاصہ پیش کیا۔

"ہوا کیسے؟"

"نتھو کی وجہ سے۔"

مجاہد کو ایک دم لگا کہ اُس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اُس نے غصے کے ساتھ فضیل کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور دھیمے سے لہجے میں بات جاری رکھی، "اُس نے کسی بدنیتی سے کچھ نہیں کیا۔ اُن دونوں کی آپس میں ایک طرح کی انڈرسٹینڈنگ بن گئی تھی۔ سمیرا نے اپنے معاملے کا اُس سے ذکر کیا تو اُس نے پھجاں سے دوا لا دی جو وہ ایسے موقعوں پر دیا کرتی ہے۔ یہاں وہ ٹھیک نہیں بیٹھی اور،" وہ مسکرایا، "ہم سب مشکل میں پھنس گئے۔"

نزہت چائے لے کر آ گئی۔ فضیل پیالہ ہاتھ میں لیے اس کے اندر سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ "اب سب سے پہلے سمیرا کو گرفتاری سے بچانا ہے۔" فضیل نے گھونٹ لیا، "اور پھر شادی کا معاملہ۔" فضیل نے ایک معصومانہ رائے سے مسئلے کا اختتام نکالا۔

"کس کے ساتھ؟" مجاہد نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"نتھو کے ساتھ!" فضیل نے سگریٹ کی ڈبیہ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ مجاہد نے نزہت کی طرف دیکھا اور ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا:

"کب سے چل رہا ہے؟"

"تھوڑے دن ہی ہوئے ہیں۔" فضیل نے نزہت سے نظر بچاتے ہوئے کہا۔

"جو ہوا اِس کے بعد بھی؟" مجاہد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہی وجہ بنا ہے۔" فضیل نے جلدی سے وضاحت کی۔ "وہ کہتا ہے کہ سمیرا کا کوئی

قصور نہیں، اُس کے گھریلو حالات نے مجبور کیا۔ دوا اُسی نے لا کے دی اور خون کا بندوبست بھی اُسی نے کیا۔" مجاہد نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ خاموشی سے فضیل کو دیکھتا رہا۔

"بعض اوقات واقعات کی ایک زنجیر بن جاتی ہے جو دوسرے لوگوں کو غیر حقیقی لگتا ہے لیکن وہ واقعات اپنا رُخ خود طے کرتے جاتے ہیں۔ سوچو! اگر میں سامان لینے گاؤں نہ جاتا تو کیا یہ سب ہوتا؟" مجاہد کے لہجے میں ایک ذمے دار آدمی کی اذیت تھی، "نتھو ایک اچھا لڑکا ہے اور جو کرنے جا رہا ہے اُس وجہ سے وہ بھی اِن وقعات کی زنجیر کا حصہ بن گیا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ آپ لائیں اُسے میں نے اُس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ وہ ہمارا داماد بھی بننے والا ہے۔" مجاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ چھپا ہوا ہے۔" فضیل نے رازداری سے کہا۔

"کیوں؟" مجاہد کی آوز میں حیرت اور خوف تھے۔ اُس نے ایک نظر نزہت پر ڈالی، وہ پلک جھپکے بغیر اُن کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"تاکہ کہیں سے اصل بات نا نکل جائے اور وہ کسی بڑے جرم میں گرفتار نہ ہو جائے۔ جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہ ہو جائے وہ اپنے پرانے گروہ کی حفاظت میں چلا گیا ہے۔" مجاہد نے ہاتھ کا اشارہ کر کے فضیل کی بات کاٹی:

"انھیں اِس واقعے کا علم نہیں، وہ صرف اُن سے ملنے گیا ہے، اُن کا دو، چار دن کا مہمان ہے۔" فضیل نے ایسے پُراسرار لہجے میں کہا کہ دیواروں سے رازداری ہو۔

"for old times sake!" مجاہد نے مسکراتے ہوئے نزہت کی طرف دیکھتے ہوئے رائے دی۔ فضیل بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ وہاں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی، یہ خاموشی پہلے والی کی طرح بوجھل اور خائف کرنے والی نہیں تھی۔ فضیل نے مزید بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجاہد نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، اُس نے ابھی آج کی شیو نہیں بنائی تھی۔ ایک عرصہ سے وہ روزانہ جاگنے کے بعد چائے کے دو پیالے پیتا اور پھر شیو بناتا۔ آج وہ کھچاؤ کی وجہ سے باتوں میں ایسا اُلجھا کہ شیو بنانا یاد نہیں رہا اور اب اُسے اپنی ہتھیلی پر ڈاڑھی چبھتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ اُس وقت ایک عجیب سی کیفیت میں تھا۔ بار بار ایک ہی خیال اُس کے ذہن میں آ رہا تھا: کیا اُس کا گاؤں جانا ضروری تھا؟ فضیل

کے آ جانے سے اُس کی کچھ ہمت بندھی تھی لیکن جو اُس نے بتایا اُسے خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اُس کا گھر ایسے جرم کا ٹھکانا بن گیا تھا جو اُس کے نزدیک نا قابلِ معافی تھا؛ گو اُسے سرزد کرنے اور سہولت فراہم کرنے والے اِس جرم میں نادانستہ طور پر شامل ہوئے تھے۔ نجو ایک معمولی مجرم ضرور تھا لیکن یہ جرم اُس کی حیثیت سے بڑا تھا۔ فضیل، ہمیرا کی کسی مجبوری کا ذکر کر رہا تھا جو اُس کے علم میں نہیں تھی۔ اُس کی کیا مجبوری ہو سکتی تھی؟ کیا اُسے کسی وقت زبردستی کی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا تھا جس کے بارے میں وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ اُس کے خیال میں گاؤں میں ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جو ایسے کر سکتا! وہ اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا، اُسے دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ اُس نے سوچا کہ وہ آج قلعہ دیدار سنگھ کے پرانے محلوں میں پھرے گا جیسے وہ کبھی گھوما کرتا تھا۔ اُن گلیوں میں راتوں کو دیر تک پھرتے رہنا ایک عجیب سکون دیا کرتا تھا۔ تین منزلہ بڑے بڑے گھر جن کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُسے ایک طرح کی طاقت کا احساس ہوتا کہ اُس کا گھر بھی اِن ہیبت ناک گھروں کے آس پاس ہی ہے۔ اِن گھروں میں رہنے والے وہ لوگ تھے جو پچھلی صدی کی پہلی یا دوسری دہائی میں سنگاپور چلے گئے تھے اور وہ وہاں سوئی دھاگے سے مشقت کر کے یہاں پیچھے رہنے والوں کے لیے دولت کے ڈھیر لگاتے گئے جس کے نتیجے میں یہ گھر وجود پا گئے تھے۔ وہ جب سے یہاں آ کے بسا تھا اُن گلیوں میں نہیں گیا تھا؛ اُس نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

فضیل اُسے دیکھے جا رہا تھا!

اُس نے جانے کے لیے مجاہد سے اجازت لینی تھی، یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بغیر اجازت لیے اُٹھ کر چلا جائے۔ اُس نے یہ اپنے سیٹھ سے سیکھا تھا، سیٹھ جب اُس کے دفتر میں آتا، اپنی بات ختم کرنے کے بعد ہمیشہ پوچھتا: ”فضیل! میں جاؤں اب؟“ اُسے حیرت ہوتی کہ وہ جہاں بیٹھا ہے، اُس کی ملکیت ہے اور وہ اپنے ہی گھر میں ایک ملازم سے اجازت مانگ رہا ہے۔ ایک دِن اُس نے پوچھ ہی لیا: ”بابو جی! آپ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں، آپ جہاں بھی جانا چاہیں، کسی اجازت کی ضرورت کیوں؟“ سیٹھ، فضیل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ دفتر میں بیٹھا ہو۔ وہ آتا، اپنی بات کرتا اور چلا جاتا۔ آج وہ بیٹھ گیا، ”فضیل! میں یہاں قانونی طور پر مالک ہوں لیکن اِس ملکیت کے حصے ہیں اور اِن حصوں پر مختلف لوگوں کے قبضے

ہیں، جس طرح ایک الماری کے مختلف خانے ہوتے ہیں اور ہر دراز کسی کی ہوتی ہے۔ اُسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اُسے تالا لگائے یا کھلا ہی رکھے۔ یہ کمرہ تمہارا ہے، مجھے تو یہاں آنے کے لیے بھی اجازت مانگنی چاہیے جو میں نہیں مانگتا۔ اب مانگا کروں گا۔" اُس دن کے بعد وہ آنے کی بھی اجازت مانگنے لگا۔

•

فضیل اُسے دیکھے جا رہا تھا!

مجاہد نے سوچا کہ وہ کیا کیا دیکھے گا؟ پھوپھی سرداراں کا تنور جہاں پورے محلے کی عورتیں اور بچے اکٹھے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتے، دنیا جہان کی باتیں سنتے اور پھر گھروں میں جا کر اپنے ہی رنگ میں سناتے۔ کیا وہ اب زندہ ہو گی؟ وہ بھی وہاں جایا کرتا تھا، صرف باتیں سننے کے لیے۔ اُسے دیکھتے ہی وہ بلند نعرہ لگاتی: او آیا جے میرا شیر۔ وہ ہمیشہ شرما جاتا، اُسے محسوس ہوتا کہ وہاں کھڑے سب اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اُسے خفت بھی محسوس ہوتی لیکن وہ اگلے دن بھی ضرور جاتا کہ وہاں جانا اُس کا معمول بن گیا تھا اور وہ ساری زندگی اپنے معمول سے نہیں ہٹا۔ کیا وہ اُس کے بارے میں فضیل سے پوچھے؟

فضیل اُسے دیکھے جا رہا تھا!

"فضیل! پھوپھی سرداراں کا تنور ہے ابھی؟" اُس نے جان بوجھ کے اُس کے زندہ ہونے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

فضیل جیسے خواب سے جاگا ہو، ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اُس نے مجاہد کو ایسے دیکھا کہ پہلی بار دیکھ رہا ہو:

"نہیں۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن اُس تنور کی باتیں سنتے ہوئے بڑا ہوا۔ پھوپھی سرداراں کو میں نے دیکھا ضرور ہے، وہ کافی بوڑھی تھی اور گھر کے دروازے میں بیٹھی گلی کو دیکھتی رہتی۔ اُس کے سر کے بال چڑیا کے گھونسلے کی طرح بے ترتیب ہوتے اور چہرہ بے رنگ اور پھیکا سا ہوتا۔" اُس نے ایک لمبی سانس لی، "میں اب چلتا ہوں۔" اُس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے مجاہد کو سلام کیا اور احتراماً دو قدم پیچھے ہٹ کے باہر کی طرف چلا اور پھر مُڑا:

"سر! آج جیٹھ کی دس تاریخ ہے، آپ نے یاد کرانے کا کہا تھا۔" مجاہد کے ہونٹوں پر خوشی بھری مسکراہٹ پھیل گئی، وہ تو بابے سودھی کے ساتھ اپنا وعدہ بھول ہی گیا تھا۔ اُسے آج وہاں

بھی جانا ہے، اُس نے نزہت کی طرف دیکھا، وہ اپنے خیالات میں گم تھی۔ مجاہد نے پھر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، بالوں کے کانٹے اُس کی ہتھیلی پر چبھے، "میں ڈاڑھی صاف کر آؤں اُلجھن سی ہو رہی ہے۔ دوسرا پیالہ چائے کا آ کے پیتا ہوں۔ پھر میں کچھ دیر باہر جانا چاہوں گا۔"

"کدھر؟" نزہت نے یہاں آنے کے بعد کبھی مجاہد کی دل چسپیوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، وہ جانتی تھی کہ اُس نے چند بگڑے ہوئے لوگوں کے علاوہ اور کسے ملنا ہے۔ اُس نے یہ سوال بغیر کسی دل چسپی کے ہی پوچھا تھا۔

"یہاں کے کچھ علاقے گھومنا چاہتا ہوں، کسی رات تمھیں بھی لے کے چلوں گا۔" اُس نے ساتھ پڑی میز پر سے موبائل فون اُٹھا کے جیب میں رکھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاڑھی بنانے کے لیے غسل خانے کی طرف چل پڑا۔

غسل خانے میں اُسے اچانک مثانے میں بوجھ محسوس ہوا تو موبائل فون کو جیب میں محسوس کر کے کموڈ میں دھار لگائی ہی تھی کہ گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ اُس نے سکرین پر نمبر پڑھنے کی کوشش لیکن نظر کا چشمہ نہ ہونے کی وجہ سے اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے پیشاب کرنے کے دوران میں ہی موبائل فون آن کر کے کان کو لگایا:

"ہلو!"

"مجاہد صاحب!"

"جی! بول رہا ہوں۔"

"سر! میں تھانہ قلعہ دیدار سنگھ سے ایس ایچ او بول رہا ہوں۔ اے ایس پی صاحب تشریف لائے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" مجاہد نے سوچا کہ وہ اُسے گھر بلا لے پھر اُسے خیال آیا کہ اب وہ طاقت کے بہاؤ کا حصہ نہیں رہا اِس لیے جب کوئی سرکاری افسر ملنا چاہے تو اُسے ہی جانا ہوگا۔ فون سنتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اُس نے ڈاڑھی نہیں بنائی اور موبائل فون کان کو لگائے غسل خانے سے باہر نکل آیا، کھلا آزار بند اُس کے ہاتھ میں تھا اور قمیص کا گھیرا ٹھوڑی کے نیچے۔ وہ نزہت کو دیکھ کے کھسیانہ سا مسکرایا، اُسے وہ تھکی تھکی اور پریشان لگی۔

"ٹھیک ہے،" وہ آزار بند تھامے ہوئے تھا اور نزہت اُسے اِس مضحکہ خیز سی حالت میں دیکھ کے مسکراتے ہوئے اُٹھی اور اُس کے ہاتھ سے آزار بند لے کے باندھنے لگی، "میں گھر

سے نکل پڑا ہوں، پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔" نزہت نے آزار بند کس کے باندھ کے قمیص نیچے کر دی اور مجاہد نے اُسے سیلوٹ کیا، "کار کی چابی تو لا دو، میں اُسی طرف جا رہا ہوں، ایک نظر دیکھ آؤں گا اور تم نے،" اُس نے آزار بند کی طرف اشارہ کیا، "یہ کمال کیا۔" نزہت قہقہہ لگاتے ہوئے چابی لینے چلی گئی۔

مجاہد پولیس سٹیشن جاتے ہوئے تھوڑا گھبرایا ہوا تھا، وہ ایک ریٹائرڈ اہم سرکاری افسر تھا اور اُس نے پٹوار خانے اور تھانے میں نہ جانے کا عہد کیا ہوا تھا۔ وہ جب ڈپٹی کمشنر اور کمشنر تھا تو اُس نے کبھی کسی تھانے دار کی تبدیلی یا کسی معاملے میں ایس ایس پی یا ڈی آئی جی سے نہیں کہا تھا اور نہ ہی کسی کے کہنے پر کسی پٹواری کو کہیں لگایا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِن سفارشی تبادلوں میں ملوث افسر کسی قسم کی مالی بے ضابطگی میں شامل ہوتے ہیں۔ اُسے کبھی کوئی پولیس سٹیشن اندر سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا چناں چہ وہ وہاں جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ پھاٹک میں سے گزرنے کے بعد ایک کھلا صحن تھا اور سامنے ایک بڑا دروازہ جو ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ صحن میں کچھ لوگ کھڑے تھے اور ایک طرف اُسے فیصل، فضل، بشیرا اور اُن کے ساتھ کچھ لوگ کھڑے نظر آئے جب کہ اُن سے تھوڑا فاصلے پر بے داغ لباسوں میں ملبوس ایک ٹولہ کھڑا تھا جو اُسے دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا اور اِس انداز سے کھسر پھسر کرنے لگا کہ وہ سمجھ گیا کہ اُن کا موضوع کون ہے؟ اُسے کچھ پریشانی سی ہوئی اور اِسی کیفیت میں اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ بغیر ڈاڑھی بنائے ہی آ گیا ہے۔ اُسے کچھ شرمندگی بھی ہوئی اور وہ واپس گھر بھی نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ سامنے ایک سب انسپکٹر مسکراتے ہوئے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجاہد نے اپنی کمر کے جھکاؤ کو سیدھا کیا اور ڈیوڑھی کی طرف اعتماد سے چل پڑا۔

ڈیوڑھی کے اندر سامنے کی طرف حوالات تھی جس کے سامنے سلاخیں تھیں اور سلاخوں کے پیچھے حوالاتی تھے اور اُسے اُن حوالاتیوں میں ایک مانوس چہرہ نظر آیا جو نتھو کا تھا اور وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے اپنے بلائے جانے کی وجہ سمجھ آ گئی، اُس کا اعتماد جاتا رہا۔ اُسے اپنی کمر جھکتے ہوئے محسوس ہوئی اور ٹانگیں دلدل میں پھنسی لگیں۔ وہ سب انسپکٹر کے ساتھ شکست خوردہ سا چلے جا رہا تھا۔ وہ ایک روبوٹ ہی بن گیا تھا، اُسے اپنا آپ بے جان لگا۔ پھر اچانک اُسے اپنے اندر بوچہل کروٹ لے کے جاگتا اور عبدالرشید سامنے کھڑا نظر آیا:

''میں اکیلا تھا، نا تجربہ کار اور ان پڑھ اور میں نے یہاں نہ صرف زمینیں الاٹ کروائیں، اپنے نام کی بھی شناخت کروائی اور تم تعلیم یافتہ، ایک اعلیٰ افسر اور اتنے بزدل کہ ٹانگیں کانپ رہی ہیں!''

مجاہد نے چاروں طرف نظر دوڑائی، اُسے وہاں سب کچھ کم تر سا محسوس ہوا، لگا کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ڈاڑھی کے بال جو اُسے اپنے حلیے میں ایک نقص لگ رہے تھے اپنی طاقت محسوس ہوئے کہ وہ اس طرح بھی لوگوں سے مل سکتا ہے۔ سب انسپکٹر ایک کمرے کے سامنے لٹکتی چق اُٹھائے اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ مسکرا کے اُس کی طرف دیکھ کے بے نیازی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایس ایچ او کی میز کرسی تھی جس کے پیچھے دیوار پر ایک بے ڈھنگا بورڈ تھا جس پر ایس ایچ اوز کی تفصیل تھی۔ کرسی کے اوپر مستطیل چہرے والا ایک نوجوان بیٹھا تھا جسے مجاہد پہلی ہی نظر میں پہچان گیا کہ وہ شکیل خاں کا پوتا ہے۔ اُس کی شکل اپنے دادا سے ملتی تھی لیکن اُس کے چہرے پر مکاری نہیں تھی، اُس کی آنکھیں ایک نرم سا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ مجاہد کو دیکھ کے وہ اُٹھا، اُس کے ہونٹوں پر ایک خوش گوار سی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے مجاہد کو سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھا اور مجاہد نے سوچا کہ شکیل خاں کا پوتا اور پھر پولیس والا، سونے پر سہاگا۔

''میرا نام بہزاد احمد خاں ہے۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا، سر!'' بہزاد کی آواز بھاری اور مہذب تھی۔

''مجھے خوشی ہوئی مل کے۔'' مجاہد نے تکلف سے مختصر سا جواب دیا۔ اُسی وقت ایک سپاہی ٹرے لیے آ گیا، ٹرے میں اُبلے ہوئے انڈوں کے چھوٹے ٹکڑے، پیسٹریاں اور بسکٹ تھے جب کہ ایک اور سپاہی چائے لیے کھڑا تھا۔ مجاہد نے انڈے کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور چائے کا پیالہ سامنے رکھ کر مسکراتے ہوئے بہزاد کی طرف دیکھا۔ مجاہد کو مسکراہٹوں کا یہ تبادلہ ایک تلخی کا پیش رو لگا۔ ایس ایچ او ایک کونے میں بیٹھا اُن دونوں کو دیکھتے جاتا تھا۔ چائے کے دوران میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی اور مجاہد سالہا سال پہلے اکیڈمی کی تربیت کے مطابق اپنے ذہن کی سلیٹ کو بالکل صاف رکھنے کی کوشش میں تھا اور بہزاد کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انداز ہ لگا رہا تھا کہ وہ تربیت کے بجائے موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے طریقوں پر سوچ رہا تھا۔ چائے ختم ہوئی تو

ایس ایچ او نے اپنے کونے میں کرسی پر جگہ بدلتے ہوئے گلا صاف کیا جو مجاہد کو بہزاد کا حوصلہ بڑھانے کی ترکیب لگی۔

"آپ کو زحمت دی۔ مجھے خود آپ کی رہائش پر جانا چاہیے تھا لیکن نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مناسب نہیں تھا۔ یہ بات چیت آپ ایک formality ہی سمجھیں۔ ہمیں تحریری شکایت ملی ہے کہ آپ کی ملازمہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے جو آپ کے ایما پر کیا گیا ہے۔" بہزاد رکا۔ اُس نے سگریٹ کی ڈبیہ مجاہد کی طرف بڑھائی جس کا جواب اُس نے نفی میں سر ہلا کے دیا، May I sir !"۔ مجاہد نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہزاد نے سگریٹ سلگا کے دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے مجاہد کی طرف دیکھا، "اِس سلسلے میں ایک گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس واقعہ کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ ملاقات ضروری تھی۔" مجاہد، بہزاد کے اِس معذرت خواہانہ لہجے سے کچھ اُلجھ سا گیا۔ کیا اُس کے سامنے شکیل خاں کا پوتا ہی بیٹھا ہے؟ اگر شکیل خاں خود ہوتا یا اُس کا کوئی بیٹا ہوتا تو اُنھوں نے اُسے ابھی تک حوالات میں پھینک دینا تھا۔ اُسے سامنے بیٹھا نوجوان کچھ کچھ پسند آنے لگا تھا۔ "ہمارے سامنے کئی ایک مفروضے ہیں۔" بہزاد نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا جو گود میں رکھی فائل کو لے کے اُٹھنے والا تھا کہ بہزاد نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "اُس نے خودکشی کی کوشش کی یا اُسے زہر دیا گیا اور ہمارے سوالات ہیں کہ وہ خودکشی کیوں کرے گی یا اُسے زہر کون دے گا؟ باہر کھڑے لوگ بضد ہیں کہ جو بھی ہوا آپ کے ایما پر ہوا جسے میں ذاتی طور پر نہیں مانتا۔" بہزاد خاموش ہو گیا۔ کمرے میں خاموشی ہو گئی، مجاہد جانتا تھا کہ وہ اُس کے جواب کے منتظر ہیں۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ آج دس بارہ ہے اور اُس نے گاؤں جا کے بابے سوڈھی کو پکی بھی دلوانی ہے۔ بہزاد نے ایس ایچ او کو چائے کے لیے اشارہ کیا جس نے چق اُٹھا کے باہر کسی کو آواز دی۔ مجاہد کو بھی چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔۔ بہزاد نے سگریٹ سلگا لی، اجازت پہلی سگریٹ کی ہی ہوتی ہے۔

چائے آگئی!

"بہزاد!" پیشتر کہ بیل اُسے مارے، اُس نے اُسے سینگوں سے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا، "آپ کے دونوں مفروضے غلط ہیں۔ اُس لڑکی کا نام سمیرا ہے اور میں اُسے اپنے گاؤں سے گھر میں مدد کے لیے لایا ہوں۔ وہ لڑکی اچھی ہے، میں اُسے معصوم سمجھتا ہوں۔ ہمارے علم میں نہیں تھا

لیکن اُس کے حمل ٹھہرا ہوا تھا، پھر ایک دن پتا چل گیا۔ اب یہ ہمارے علم میں نہیں تھا۔ نتھو ہر صبح ہمارے ہاں سبزی وغیرہ لاتا ہے اور غالباً اُن دونوں کے درمیان میں کوئی انڈرسٹینڈنگ بن گئی تھی۔ نتھو نے اُسے کوئی پڑیاں وغیرہ لا دیں جس کے نتیجے میں مَیں یہاں بیٹھا ہوں۔'' مجاہد ایک تلخ سی ہنسی ہنسا۔ اُسے اُن دونوں کے چہروں پر بے یقینی کے بجائے دل چسپی نظر آئی۔ ''نتھو، سمیرا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''سر! آپ کو اُس کے ماضی کا علم ہے؟'' ایس ایچ او نے پہلی مرتبہ بات کی۔ مجاہد نے قدرے برہمی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا، اُسے یہ دخل اندازی پسند نہیں آئی تھی۔

''مجھے مکمل علم ہے۔ وہ ایک مشاق،'' مجاہد خوش مزاجی سے ہنسا، ''جیب کترا تھا۔ میرے کہنے پر اُس نے یہ شوق ترک کر کے باپ کی دکان پر کام شروع کر دیا ہے۔'' اُس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا جنھیں نتھو نے ہی بنایا تھا۔ ''وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔'' مجاہد نے اپنی بات ختم کی۔

''معاملہ بالکل واضح ہے۔'' بہزاد نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا، ''نا کوئی قتل اور نا ارادہ قتل! اُن لوگوں نے یہ درخواست کیوں دی؟'' بہزاد نے ایس ایچ او کے ہاتھ میں تھامی ہوئی فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ مجاہد، فضیل کا تجزیہ دہرانا چاہتا تھا لیکن پھر اُسے ایسا کرنا اپنے شایانِ شان نہ لگا۔

''ابھی ہم اِس زاویے سے بھی سوچیں گے۔''

''سوچنا کیا ہے؟'' بہزاد کی آواز میں ایسی سختی تھی جسے وہ اُس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت اُسے وہ شکیل خاں کا ہی پوتا لگا۔ ''اُنھیں دوسرے کمرے میں بلاؤ۔ میں اُن کی ......'' پھر وہ رکا، شرمندگی سے مسکراتے ہوئے مجاہد کی طرف مُڑا، ''میں پولیس افسر ہونے کے ساتھ ساتھ راجپوت بھی ہوں۔'' مجاہد بے ساختہ ہنسنے لگا اور کمرے میں موجود تمام کھچاؤ ایک دم جاتا رہا، ''میں.....'' وہ پھر بات مکمل کیے بغیر ہنسنے لگا۔

''جب آپ لوگ جائیں تو اگر ممکن ہو، نتھو کو میرے پاس بھیج دیں۔ میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ ویسے وہ لڑکا مجھے پسند ہے، میں اُس کی مدد بھی کرنا چاہوں گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد نتھو کمرے میں آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ نظر جھکائے

کھڑا رہا۔

''بیٹھو!''

نتھو جھجکتے ہوئے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم نے میرے ساتھ مشورہ کیوں نہ کیا؟'' مجاہد نے اپنی آواز، جتنا ممکن ہو سکتا تھا، ہر تاثر سے خالی رکھنے کی کوشش کی۔

''بس سر! اور کیا کرتا۔ مجھے یہی کرنا تھا اور اگر ضرورت پڑی تو پھر کروں گا۔'' نتھو کی نظر جھکی ہوئی تھی، اُس کی آواز سرگوشی سے تھوڑی سی اونچی لیکن ایک سختی لیے تھی۔ مجاہد کو اُس کا لہجہ اچھا لگا۔ اُس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا، وہ اُس کے جذبے کی قدر کرتا تھا۔

''میں تمھارے ساتھ ہوں۔'' مجاہد نے بھی سرگوشی کی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' نتھو نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے بہت مارا گیا ہے۔'' مجاہد کو اِس بات کے سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر اُس کے بدن میں ایک آگ جل اُٹھی جسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اُس نے اپنے تجربے اور سوجھ بوجھ کو جگایا۔ وہ خاموشی سے نتھو کے آنسو بہتے دیکھتا رہا، ''مجھے مروانے والے اُدھر تھے۔ بھائی فضیل نے جو آپ کو بتایا سچ تھا۔'' مجاہد بغیر کچھ سوچے ہوئے باہر نکل گیا اور انتہائی غصے سے اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں سے بہزاد کی آواز آ رہی تھی۔ اُسے اپنا آپ کوئی اور محسوس ہوا، اُسے پوری زندگی اپنی ایسی کیفیت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خود سے کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا۔ وہ کمرے میں کسی بھوت کی طرح داخل ہوا، سب نے پریشانی، گھبراہٹ اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھا:

''بہزاد! کیا تمھیں بتایا گیا ہے کہ اُس لڑکے کو اِن لوگوں نے اپنے سامنے پٹوایا ہے کیوں کہ یہ میرے یہاں آنے سے خوف زدہ ہیں؟'' اُس کے لہجے میں نفرت اور آواز میں غصے کی کپکپی تھی۔ بہزاد نے نچلا ہونٹ سکیڑ کے ایس ایچ او کی طرف دیکھا، مجاہد کو اُس نظر میں نفرت نظر آئی جس سے، اُس کے تجربے کے مطابق، ایک پولیس والا دوسرے کو نہیں دیکھا کرتا۔ ایس ایچ او، بہزاد کی اُس نظر کی شدت کو برداشت نا کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''سر! آپ جانتے ہیں کہ.....''

''کیا یہ سچ ہے؟'' بہزاد کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

''سر!.....''

''مجھے ہاں یا نہیں میں جواب دو۔''

''جی سر!''

''تم لائن میں رپورٹ کرو فوری، میں ڈی پی او صاحب کو بتا دوں گا اور اِن سب کو غلط الزام لگانے پر گرفتار کرو۔'' پھر وہ مجاہد کی طرف مُڑا، ''سر! میں آپ سے معذرت کرتا ہوں، آپ تشریف لے جا سکتے ہیں اور لڑکے کو بھی ساتھ لے جائیں۔'' پھر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا، اُس کے چہرے کے تاثر میں یک دم تبدیلی آ گئی۔ مجاہد نے سوچا کہ آدمی بیک وقت کتنے روپ دھارتا ہے۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا، ''آپ اِسے دخل اندازی نہ سمجھیں، یہ اطلاع ہمارے پاس تھی۔ آپ نے آج میلے پر جانا ہے، اگر آپ برا نہ منائیں، میں ساتھ چلنا چاہوں گا۔ میں فارغ ہو کے اطلاع کروا دوں گا۔''

''میں ایک سفارش کرنی چاہوں گا۔ اِس کے ساتھ تمھارا محکمانہ معاملہ ہے،'' مجاہد نے ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی، ''لیکن اِن لوگوں کو جانے دو۔'' اُس نے سفید، بے داغ لباس والوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ہلکی ہلکی کھسر پھسر ہونے لگی جسے نظر انداز کرتے ہوئے مجاہد کمرے سے نکل گیا۔

نھو اور وہ جب گھر کے پاس پہنچے تو فضیل اور فضل گلی میں اُن کے منتظر تھے۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے اور سب نے کئی بار گرم جوشی سے مصافحے کیے۔

''سب ٹھیک ہے! تم لوگ جاؤ۔''

''سمیرا آج شام تک گھر آ جائے گی۔'' فضیل نے کہا۔ مجاہد نے نھو کی طرف دیکھا، اُس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ اکیلا گھر میں داخل ہوا تو نزہت سامنے کرسی پر بے سدھ اور نڈھال سی پڑی تھی۔ اُسے یقین نہ آیا، نزہت اِن تمام سالوں میں ایک صحت مند عورت رہی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے آج میلے میں بھی ضرور جانا تھا۔ وہ پریشان سا آگے بڑھا تو نزہت نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر تھکی تھکی لیکن پیار میں ڈوبی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجاہد قدرے سکون سے ہو گیا، اُسے اپنے آپ میں طاقت واپس آتے محسوس ہوئی۔ وہ اُس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ نزہت مسکراتے ہوئے اُس کے پیچھے دیکھے جا رہی تھی۔ مجاہد نے

بھی مڑ کے دیکھا، نھّو گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔

''سر! کوئی کام تو نہیں۔''

''تم جاؤ! شام کو جب ثمیرا آئے تو اُس کے سنبھالنے میں میڈم کی مدد کرنا۔ ماں باپ سے مل آؤ۔'' مجاہد نے سوچا کہ گاؤں میں ثمیرا کے باپ سے اُس کے رشتے کی بھی بات کرنی ہے، نھّو کے باپ کی فضیل کی ذمے داری تھی۔

''کیا بات ہے؟'' مجاہد نے نزہت کے گال چھوتے ہوئے کہا۔

''اُلٹیاں!'' نزہت شرارت سے مسکرائی، ''اور وہ بھی زندگی کی شام میں۔''

مجاہد نے ایک بلند قہقہہ لگایا، ''اگر شام ہوتی تو یہ نہ ہوتا۔'' اور جھک کر اُس نے نزہت کے دونوں گال چوم لیے۔

''میلے پر جانا ہو گا ابھی؟'' نزہت نے اُسی تھکے تھکے لیکن مطمئن لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!''

''بھنڈار ضرور لانا۔''

''مجھے نہیں یاد تھا۔ ایک اور چیز بھی لانی ہے۔''

''کیا؟''

''میٹھا پان!'' اور دونوں ہنسنا شروع ہو گئے۔

اُسی وقت مجاہد کی جیب میں پڑا موبائل فون بولنے لگا!

ختم شد

گوجرانوالا چھاؤنی

۵ فروری ۲۰۱۵

مصنف کی دیگر کتابیں

افسانے

- داغ داغ اُجالا
- جمع تقسیم
- پانچ منٹ کی زندگی
- آئینے سے باہر چہرہ
- تانبے کے برتن

ناول

- پری
- خلیج
- ٹبا (مختصر ناول)

تراجم

- باپ کا گھر
- بیکار کے مہ و سال
- جمیلہ
- بیرک ۲ کے قیدی

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com